

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ
جنوری 2015

میراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

اپنی کوہنوں اور حرموں پر ایک صاحب نظر کا نوحہ

74 ••• جون ایلینا

سوشل میڈیا پر اشتعال کی آگ کی پھولیں اور پھر سوشل میڈیا پر ایک

8 ••• مدیر اعلیٰ

بانی کا آئینہ اختیار کیا گیا تھا انہوں نے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

16 ••• الیاس سید پوری

ایک غریب بھائی کا احوال جو مدت کا غریب کا اظہار تھا

39 ••• کاشف زبیر

جس کی زندگی کا ہر لمحہ درد و غم کا تھا اور جس کی ہر بات پر

76 ••• ڈاکٹر عبدالرب

گم شدہ محبت کے ممال میں بت ایک حسینہ کا ماحیرا

117 ••• طاہر جاوید منگل

جس لوگوں کے حلقوں سے امتداد حیرت کی انوکھی داستان

124 ••• مرزا امجد بیگ

محبت کا بھرم رکھنے والے ایک دلبر کی ہمدردی کا دلچسپ کہانہ

150 ••• سید احتشام

محفل شہزاد

164 ••• قارئین

منافق کی منکر سیس گھسٹے والوں کی عجیب منقوش کا اظہار

167 ••• سلیم انور

ماوی

ایک چھٹی دہائی کی چھٹی دہائی کی عورتوں کا قصہ اور ان کا ایک دل بہا سلسلہ

176 ••• محی الدین نواب

پہلے آئے

وقت کو بکرا آمد کرنے والے ایک بے وقوف عاشق کا اگلا سفر

221 ••• منظر امام

امام ابو العباس

راہِ حق کی مسرت و سرور کا سفر

225 ••• ضیاء تنمیں بلگرامی

نافا بل معانی

ایک بیوقوف عاشق کے عظیم اسرار کے اثرات و خیرات کا احوال

227 ••• ڈاکٹر شیر شاہ سید

چھان بہن

جس کی زندگی کا ہر لمحہ درد و غم کا تھا اور جس کی ہر بات پر

241 ••• تنویر ریاض

بے شرمستا

منجلی پاشا کی ہمدردی اور ان کی زندگی کا ایک دلچسپ کہانہ

250 ••• سلیم فاروقی

آپ کے ہاتھوں میں ایک انجمن رنگ رنگ آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پس و پیش، چپ و راست اور پست و بلند کی صورت گری کرنے، انگلیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تجھے ہی نہیں، ہم تجھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آتا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر بچھتنا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے بچے لے دکنے لگے ہیں۔

اب ہم سب سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا مجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا مجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آکر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سر بلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گر کر گاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی آگئی ہی رو میں اٹھنے کے لیے نہیں۔ ہمیں سمجھا جاسکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفتر داری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفاتر کے کام نہ آئے۔

تمہارے شہروں کے باہر تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو لکھائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کہتے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کہتے ہوئے کہا تھا:

”میرے لوگ، میرے جنات دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی دکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہل ہنرمندوں کے ہاتھ ہنر کے لیے اہل دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت کا ترچہ رہ جائیں گی۔ ان کی ساری باتیں کروا دیں گے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کامے کا اور یہ دولت، مدامت اور نصرت کی ممانی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دھیر وار ہوجائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرافیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔“

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دودھت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو بھی بھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کون کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں بیکم رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سبھی توکل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ ہی کسی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں، وہ بھی فضول ہیں اور جوان وایوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھٹائے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ پھر کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آگئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ..... اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جو ہر دار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گدا کر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے تنگدلوں کی بھیک اپنے ملک میں بیچ دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دولتی ہے۔ ہاں، اسے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔

Pakistan's ONLY Baking Soda Toothpaste

www.blogspot.com - Unregistered version

facebook.com/snscares

SW-06-14

دانت سفید چکا چک

محترم قارئین
السلام علیکم!

[illegible]

تفسیر عباس با بر، ادا کاڑہ سے بحر پر تجرے کے ساتھ کمری صدارت پر براجمان ہیں، اسی طرح حاضر کے جدید ترین تقاضوں کو اگرچہ پورے کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ خود ہی اس لحاظ اور معیار کے تحت ممکن نہیں ہو سکتا جس میں دوسرے مروج کے سادہ حسن کی تاب و کھلت نے از حد سٹار کیا۔ بہر حال اس سرحد و مغز پر یوں اٹھانے کے لئے اس کے لئے ایک خاص قسم کا انتظام کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ کیا ہے، یہ تو اس کے بعد ہی دیکھا جائے گا۔

کروڑ و عیشیت کی تحیف و نذر کر رہے جس ٹکرائوں کے غرض و مقاصد اور کرد و خاات کا قائل یا برداشت اور بوجھ و تکلیف کر کے اس کی رو میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آپ کے خط میں آپ کا ادارہ ہی حسب روایت معاصرے کی تحفیں اور جمود کا سختی ملاؤں پر لاہور سے انتہائی منفرد شخصیت زویا اعجاز کو شہانہ کر وفر کے ساتھ براجمان پایا۔ بہتر یہ ہے کہ کوثر ازقبولیت حاصل ہونے پر تول سے سار کا بد۔ خانیوال سے بہت جگہ پر ہمالی کھد قدرت اللہ نیازی نے وزارت تعلیمی کے فرائض نہایت احسن انداز میں سر انجام دیے۔ محمد قاسم رحمان اور یوسف سانول یقیناً اچھا اضافہ ہیں۔ سرگودھا سے اسد عباس کو تول سے خوش آیا۔ یہ کراچی سے رضوان الحسن کو ملی جو ملی میلا لٹونے میں کامیاب رہے۔ وقتی میں قیام ہے عزیز از جان دوست سید محسن کی خوشگوار و مختصر سوانح سے مرحومہ حضرت صاحبہ کی ماہانہ ان پینڈ آسے چوہری کے وارنٹ جلد از جلد جاری کیے جاتے ہیں۔ ہاشمی کے آئینے میں خدیجہ صاحبہ کی سوانح سے مرحومہ الیاس کی شہادت پر ایک اور گہرنا بنی اور بہترین تحریر پر تحقیق مہملی قائم نام نے مطلوبات میں جلیں قیمت اضافہ کیا۔ بہترین اور کہنہ مشوق مصنف ڈاکٹر عبد رب ربی کی شہادت پر ایک اور سوانح، اسٹوری آف وی مصنفہ قرار پائی۔ بے شک باطل جنتا کی طاقت و دہوا سے حق و صداقت کے سامنے سرنگون ہونا پڑتا ہے۔ باطل ہمیشہ نیست و نالود اور کھال میرت بن جاتا ہے ملک صدر حیات کی ڈائری سے ایک اور پڑاؤں واقعہ صابر کی کے وحشتانہ زندگی سے بعد صافرہ کر دیا۔ گو ثابت ہوا کہ محبت اعدی بھی ہوتی ہے اور بھری بھی۔ صفیو کھار نے کینکلی وشی اعلیٰ کی انتہائی کردی۔ کئی دہائی سے شہر مصنفہ منظر امام کا آخری صفحات پر توشہ خاص ایک موسم و ساک تحریر ہے۔ سلاب سے لکھا۔ مکاتبات مل اور فو ایکو ایلی کی چشم کشا و عبرت کا اچھا نمونہ۔ پیٹک وہی ناظم مل و ہمارا اور مالک دو بلی و دلچ و قلم ہے برکھا کاسن پرفسون اور کالو ما بھی کی لا زول بہت سے سٹار لکھا۔ ایک کامیاب مین سے بہت نوا لکھا ہوا۔ قاسم ڈاکو نے کفارہ ادا کر کے راہ آخرت کو ہموار کر لیا۔ مفرد و سلوب کے بہترین مصنف طاہر جاوید محسن کی دل دل بھر کر درد ڈائریاں دل کی آنکھوں سے پڑی۔ انسان زندگی کے تقاب و تجزیوں میں استقامت کرتا ہے کمر جاتا ہے۔ انہیں بھی جینے کا خواہش مند اور خوشیوں کا طالب۔ ہمارا نقار اسی کا بحر عمر بھرا، تحائف دست ساقی چٹک پڑا۔ پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی نہایت دلچسپ و دلکش خیر شخصیات پر بہت نام موصول زر کے لیے چنے اور پستول کا نام ہے۔ صبرت نہایت اثر انگیز ہوا۔ تجر اس طرح تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شری شاہ سیدی کی اثر انگیز تحریر عشرت علیہ بھی خوب رہی۔ سلیم اویز کی نرم گوشہ کے کیا کہنے۔ بی زاندا علی لوگ خال خال ہی جائے جاتے ہیں۔ تباروں کے لیے انساب کچھ بچ کر رکھ دیتے ہیں۔ خود ہی یاض کی قدر ہے دلچسپ کرکوش باطل صورت بھی کامیاب رہی بیکردار اور طالب نے بھی بر زمین کیا۔ شام میں کئی کی خیر بھی دلچسپ تھی۔ اللہ کے برگزیدہ ہندوں کی سوانح حیات کے ایمان افروز دسلے کی ایک اور کڑی۔ تصوف کی زبان ایک نادر نواں تحریر ثابت ہوئی۔ کترنوں میں رضوان کو ملی کی محنت قابلِ داد ہے۔ بزم شہر و خیر میں باذاتی قارئین کا کھد و مفرد انتخاب۔ اپنی مثال آپ ہوتا ہے آخر میں..... آخری صفحات کے لیے ہم ادارے سے تول سے ملے ہیں کہ حاضر ملک

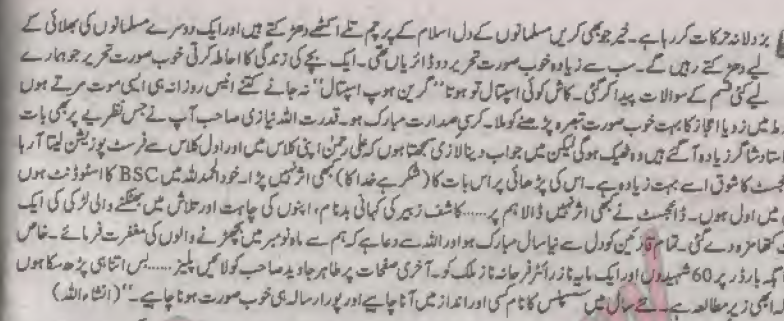
اور مریم کے خان سے ضرور لکھوائیں۔“ (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

۱۵ محمد یوسف سائول، نور پور قس، ضلع خوشاب سے تشریف لائے ہیں "بہت ہی خوب صورت و درون تھا۔ پھر فرست کر کلا خطہ
کی اور سلاطین کے دوا می اطیبا صاحب کا سلاطین کا متنبی پڑھا۔ یہی سچ ہے جو ایسا صاحب کہہ رہے ہیں۔ محفل یاران میں انگری۔ ہمیشہ کی
طرح۔ ادارہ کی پیشی انھوں کی لائسنسی۔ دیا اعجاز لاہور سے کرسی صدارت کی حق دار ٹھہریں۔ خدا ان کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ محمد قدرت صاحب بھائی کی
صحت یابی کی دعا کے لیے شکر ہے۔ ویسے میرے تصور میں آپ کا خاکہ کر گیا ہے کہ آپ بہت ہی اچھے ہوں گے۔ عشق کا تمام بہت ہی اچھی تاریخی کہانی
ہے۔ ہارون کا کردار بہت پسند آیا۔ نرم گوشت سلیم انور نے عمدہ لکھی۔ واقعی پولیس ڈاکو چور سب کے جذبات ہوتے ہیں۔ عین ایسا بات کا خیال رکھنا
چاہیے۔ کاشف زہیر کی بدنام ریٹائرڈ آرٹل کی چالاکی نے کہانی کو چار چاند لگا دیے سوائے جنوں، ڈاکٹر صاحب میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ بہت اچھا
لکھا لیکن پڑھ کر دل اداس ہوا۔ اسرا نکل امریکا بھارت تینوں ایک ہی تھلی کے چنے بیٹے ہیں۔ حکم بھی جی ہوتا ہے مسلمہ اند پر ہوتا ہے کیوں؟ دو
ڈاکٹر ایں طاہر جابر مغل نے میرے ذمہ تازہ کر دیے کیونکہ پچھلے دنوں C.M.H. میں عاقل نامی جوان جو کہ پنڈی کا رہائشی تھا، ڈاکٹر ہاؤس ایڈمٹ
ہونے کے بعد فوت ہو گیا۔ 31 سال کا جوان مجھ سے کافی اہمیت ہوئی تھی وہ یاد آگیا۔ چکا دوری ملک صاحب نے ایک باہر چریس کے اصل بحرم کو
پکڑ لیا۔ ویسے ملک صاحب منہر ہمیشہ گھوڑے یا تانکے پر ہی کیوں کرتے تھے؟ (یہ اس وقت کی بہترین سواری تھی) عطر شیشہ، ڈاکٹر شہر شاد سے بہت
بہر یا یک جہتی سے اس موڈ میں مرض پر لکھا جس کی وجہ سے ہزاروں گھر پر باد پور ہے ہیں۔ محفل شہروجن میں عالم اقبال جیل کا انتخاب بہت اچھا لگا۔
پاکل صورت پس و اجبی سے کہانی تھی کوئی اچھا ترائیل نہیں چھوڑا۔ بارودی اپنے تئیں دور کو مکمل کر چکی یعنی جوان ہو چکی ہے۔ بہت بہتر اعزاز میں جاری
ہے۔ خیمہ خستہ بلگرامی تصوف کی زبان بہت اچھا لکھا پڑھا ایمان تازہ ہوا۔ راز باہر نیم کا واقعی راز تھا بہت اچھا لکھا۔ دبیر کے شمارے کی ہیئت کہانی
سلاطین کے سب، اس کہانی میں پرکھا اور کالوا بھی کی بہت ایک آفاقی عبت کا مظہر تھی اور کدھ جیسے ڈاکو کا کردار متاثر کن تھا۔ فضل دادیہ جو ڈرے
ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کزنیں انجی نہیں C.M.H. ڈے سچا راج ہو کر انجی جاب پر ہوں۔ تمام دوستوں کا شکر ہے جنہوں نے ہمارے لیے
سماج کی اور اللہ کا بھی شکر ہے۔"

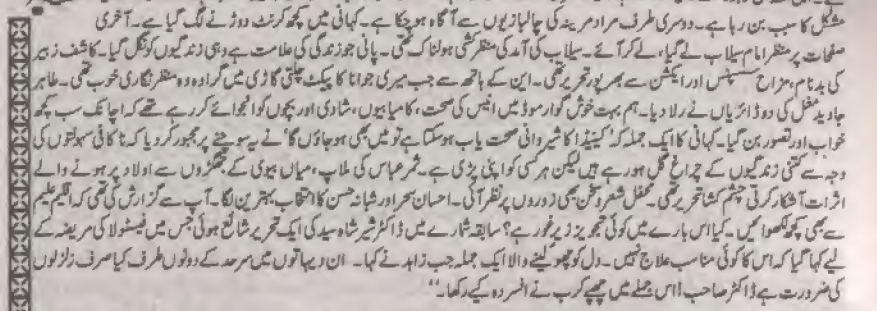
[illegible]

محبی الدین اشفاق، فتح پور، سے حاضر ہیں۔ ہاتھیں خاص نہ ہوتے ہوئے بھی خاص تھا۔ جون ایلیا ایک بڑے بڑے معاشقین
 عیب کی طرف توجہ دلاتے نظر آئے۔ زویا، انجانا سے حد میں عاشق نظر آئیں۔ ہر عالم مبارک باقول کریں۔ ابراہادارت یار میں جو اشرافہ لیت
 ملا ہے کہ کواکس کرل مسوئین کی؟ اسکی خاص توجہی۔ طاہر جاوید علی کی دوڑا نیاں دل میں اتر جانے والی تحریریں۔ مادی نے خارا نگ بدلے اور
 کہتا کہ ایسا کی گرد میں اور مجھ میں طائر کو کہنے کے لیے کیا رہنا ہوگا۔ تصوف کی زبان میں ضیا بکرا می صاحب آئے۔ خدا کی محبت اور عشق میں سب
 کو کھانا دینے والے بزرگ اربعینہ کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سیلاب نے کیا میں خطرناک صاحب آئے اور چمکائے۔ خدا ان آفات سے
 بچائے۔ انڈیا کو اپنی آگھوں کے سامنے مرنے کی دعا میں بہت سے قلم کار آئے۔ قلم کار کوئی احسان دوستی نے برائی میں اچھائی کو واضح کر دیا۔ مصنف نے کمال کر دیا
 ہے۔ برکھاد اہل لوٹ گئی۔ ایک نئی ہمت کے ساتھ اور کچھ کیوں مٹی۔

✠ ابراہار وارث، سندیلکائی سے ملے آئے ہیں۔ دسپنس اس وقت بہت جلدی... مل گیا۔ رسالے کا آغاز حسب معمول آخری صفحات والی کتابی سلاط سے کیا ہے شروع کی۔ اس دن ازاد ہو کر زبردہرواں کا تحصیل کرنے والوں کی عبرت انگیز داستان پڑنے کو ملی۔ فضل واد کا انجام اس سے کی رہونا پنا ہے تھا۔ برکما سے پانی کو کچے تولیے کیلین شوہر... اسے چاہے تھا کہ عید کا تھام قیام لیتے۔ مارو کی کی قسط انتہائی سہولت ملی۔ سو اسے اس جگہ کے چھان مارا اور اجتام مرا کر اسے دے چکی تھی نمازی کے جسے چاہی کہ جو کچھ کھولے۔ چاکا کتے ہے۔ دوسری سلسلہ وار کتابی سہولتوں جنوں پڑھی جہاں سبھی طاقتوں کے کرم و اثر انداز رہے جسے دیکھنے کو ہے۔ امر کا جو کچھ کھولے باور اور ان کا رستارنگہ کار بھی کی کسی کسی

[illegible]

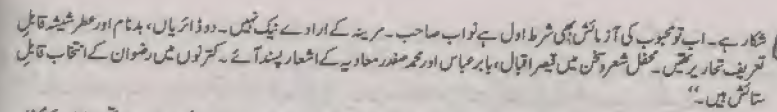
✽ محمد قدس اللہ شازی، مجسم ہائون خانیوال سے شریک محفل ہیں۔ دسمبر 2014ء رواں برس کا آخری شمارہ بروقت نکلیا۔ سرواڑے ہمارے چہنوں میں کوئی نظر آئے گا، ہم بھی مصروفیت بہت سے اس لیے تھوڑا ادا ادا نکال کر کمر ہمت کی جانب چل دیے۔ آپ کی صدارت پر نر و ا کا جود پایا مبارک ہو، جی آپ کی صدارت نامہ کا ابتداء کزن شعلہ طوطی کی طرح تھا۔ برائے مہربانی اس کو تھوڑا تہہ دل کریں تاہم باقی تبصرہ زوردار تھا کہ مرزا محسن خوش آمدید۔ بیرون کی پینڈہ کی کاٹھگری۔ اس دعا محفل شہرہ جی کے بعد محفل خیراں میں آپ کی شہریت و دیگر خوشی ہوئی۔ علیٰ آپ کا اسٹوڈنٹ سائنچر کیونٹ لکھ محمد صہرہ معافی! اللہ تعالیٰ کی ذات سے اپنی کوکر کرنا کیا ہے۔ خود کی جیسا حاصل دہی کرتے ہیں جو ادا کی سے مایوس ہوتے ہیں۔ اللہ صبر کا کڑا شخص سے بچائے۔ سید قیصل (ایم کی) کی پندش مبارک ہو۔ احسان خرا آپ کا تبصرہ شاعرانہ رنگ لیے ہوئے



✽ سید عقیل احمد، دینی اور نیکول شاہین خان، ہر دو کو اس محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ "زہیر کا شمار 20 سالہ تاج کوں کیا۔ عاقل کی بہت اہمیت محفل میں اس واقعہ اس لئے نہ کہ عقیل کا تہمید پر مذہب پر کر دل خوش ہو گیا۔ وہ دینی میں ہوتے ہیں، اور ان میں انہی کی وجہ سے تہمید لکھ رہی ہوں۔ محفل کی صدارت اس واقعہ پر اعلیٰ سسر کے حصے میں آئی۔ زویا سسر دینی اچھی تہمید لکھ رہی۔ قدرت اللہ الہیائی کچھ لوگوں کو یہ بتا رہی ہے کہ اصل نام سے تہمید جس کیجئے۔ آغا علی صاحب خان کا دینی اور تعلیم محفل میں نظر آئے۔ مشتاق نظامی بہترین کہانی ہیں۔ ہادی رحمہ اللہ جو دہم کی طرح عاقل کی کوئی سی ہے۔ صاحب محفل صاحب کے سوارانے خوش ہیں۔ چونکہ سارا محفل ان کے تہمید لکھنے کی ہے۔ لہذا سارا محفل ان کی ہادی کی تہمید لکھ رہے ہیں۔ لہذا یہ ہے جو اپنے نام باب کی عزت کا خیال نہیں کرتیں۔ ظاہر چاہیے محفل کی دوڑا ریاں بہت خوب رہیں۔ بیٹ ایلڈ بیٹ اسٹوری ہے۔ علی رضا بھی شہرہ کر رہے ہیں۔ کامیابی حاصل کر رہی۔ سیلاب کے کیا ہیں ہمارے موجودہ دور کی بہترین عکاسی کی گئی۔ خصوصاً بھی بہت پسند آئی۔ کہ تمہیں اور محفل شہرہ خوش میں سب نے اچھے انتخاب کیجیے ہیں۔ یہ سارا پہلا خط ہے (خوشی آمدید) امید ہے شائع کیا جائے گا۔"

۱۵ اعجاز احمد راجیل، ہائی، ساہیوال سے تیسرا کر رہے ہیں "سال رواں کا آخری شمارہ زیر نظر ہے۔ یہ وقت بھی اتنی تیزی سے بیت جاتا ہے۔ پچھلے اوپن اس سہری مکمل میں حاضر نہ ہو سکے تو اس بار حاضری لازم بھی۔ سرورق پر محبوبہ دلواری اپنی تمام تر ترغیبات کے ساتھ موجود ہے۔ اٹھ بیس ملائی کی راہ مرحوم جون ایلچیا کی لانڈول خیرور میں سے ایک عہدہ انتخاب ہے۔ قسمت پر اس دفعہ کافی توجہ دی گئی ہے۔ ادارہ بیس کی طرح محروم و کمینک ہے پچاس بائیس ہوئی ہیں۔ ذوی اعجاز صاحبہ کو مصداق کی سہارک، بابہ شجرہ کا کافی تحفظ ہے۔ حیدر آباد سے عمرین ناز کا سندھ سائبرہ بہت پیارا کارا دیلکن۔ طاہر شاہی مفضل صاحب اور ناصر ملک صاحب میرے بہت ہی محبت رازک ہیں۔ اس دفعہ دوسرے جنوں سے آغاز کیا جاوے گا حبیبہ صاحبہ بھی صاحب نے قلم ادا کر دیا۔ انہر ایکٹوں کا مسئلہ انوں کے خلاف پروٹیکٹر اور پینشنس پر ڈھانچے جانے والے جرم و ستم کو شروع کر کے انہر رنگ داستان واقعی قابل غور ہے۔ محبوب قلم کار دور سے سفیر طاہر شاہی مفضل کی دل گداغری پروڈیو انڈیا میں خوب رہی۔ ایک ماں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی اور ان کی اس سوز گھرائی کو لکھنے کی مہتر امام صاحب آخری صفحات کا حق ادا کر گئے۔ سلاطین کے کیا وعدہ قدرتی آفات اور ان کے گرد گھومتی داستان چڑاڑی۔ حبیبہ کا کردار عہدہ لکھنے کا سبب بن گیا۔ ایلیا بیتا پوری کی عشق کا حق تمام حاضری رہی۔ دولت اور عورت شاہیدہ لظہم و ظہم میں مگر وہ نساہنگی ہوتے ہیں۔ بارون کا کردار عمدہ ہے۔ بارون کی کافی تجزیہ ہوتا ہے۔ عروا بہت سی مشکلات کا سامنا ہے مگر اس کے دل میں بارون کی محبت کے دھپے جلتے ہیں سو فیض محبت کرنے والے مشکلات کا سامنا کرنا جانتے ہیں۔ کاشف کو بیر کی استوری بدنام شاہدہ راز رہی۔ انہوں کے حصول کے لیے واقعی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

۱۱۱ سید اکبر شاہ: باہر سے مغل کی زینت بنے ہیں، ان کی ایک ٹیکہ..... جو کچھ ہم نے گم رہا۔ وجہ: ایک جیسے جس کو جہاز دارا پراسن جیسے ہم کہہ کر "امی چہرہ مال کی پر خانی میں موت روشن مستقبل کی ضمانت ہے" یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سچس کے سرورق پر نظر پڑے تو کچھ چیزیں اُڑی ہوئی۔ نشانہ قابل غور ہے۔ ستا تھیں کہ انسان کا اطلاق اور باطن اچھا ہو چاہے، دور دراز بھی جائیں تو بچ اُردوں پر بھی کبھی ہوتی ہیں۔ گھسٹان کا رخ کیا۔ مینے باطنی کے اولین پھول خوش رنگ پر لگا دیے تو خوشی اس قدر کھل جیسے دھواں کھول گیا۔ ان کی زوایا کی شاندار انک۔ کہا نہیں کی انجندامردی کی۔ کے سر اور مشکلات کا

[illegible]

✽ قصیر اعوان اینڈ عرفان نجی سیال، دوسرے جیل سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”سردوق نے کوئی خاص تاثر نہ دیا۔ انہیں میں جن ایلیا کی سلامتی کی راہ، ذاتی انسان کو سلامتی کی راہ دکھائی مگر انفس ہم سب اپنی ذات کے خول میں قید ہیں۔ انسانیہ کے ہونے تلک رکھوں کی محفل میں۔ کرسی صدارت پر بیٹھاں ڈوبا عجاز کو روبرو جان پایا۔ یہاں مبارکباد قبول فرما گئیں۔ مسلسل ایک گھنٹہ کی محفل نے دیا اس لیے بس خاموشی قاری تک محدود ہو گئے۔ یہاں ہم نے دل سے شکر ادا کیا کہ آپ نے قید قیول کو کدواؤں میں یاد رکھا۔ نام آپ کی کی وجہ سے نہیں گھر سے مگر امید کرتے ہیں آپ ضرور مجھ جی جی کی اور آپ کا تانا بواؤ حقیقہ ہم لوگ کر رہے ہیں۔ آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آپ کے یقین کو داد دیتی رہے گی۔ محمد یوسف آپ پریشان مت ہوں۔ ہمیں محفل سے نہیں غائب نہیں ہوں میں ڈر اور سو رہ جاتی ہے۔ اپنی کی مبارکباد قبول فرما گئیں۔ آغا غریب نے محفل کوک جھوک کے بغیر بھی کھینک کر بس ڈر اور آپ کو کوٹھ خاطر کار چاہیے۔ محفل صاحب کے دیوانوں میں۔ اشعار میں بھی درج و لوح ہندو معاویہ کے اشعار پندرہ آئے۔“

۱۲۸ مکی عربات کی حرکت سے مخالفین میں شکیں پیدا ہو گئیں۔ ان کے لیے اس وقت کے حکمرانوں نے دو اقدامات اختیار کئے اور زندگی کی مصروفیات سے حاضر ہونے کا وقت نہیں دیا۔ پڑا اور آجائو کی بہترین تصویریں پر مہاراجہ کی قدرت اللہ، قائم اللہ، یوسف اللہ، اسد اللہ، منصور اللہ سے تیسرے بھجور تھے۔ یہ مکی عرب ایک مہاراجہ پر لڑا یا کی مہاراجہ کا غلام لکوا ایک بار پھر محفل میں دیکھ۔ شوکت شہر آباد پر کیاں غائب ہیں۔ چلیز واپس آئیں۔ کیاں اس سب کی سب اکی میں لیکن نرم گوشہ و سوادے جنوں، ماری، دراز اور آخری اسٹوری سلاپ سے علیا بھجور کی محفل شعر و سخن میں بارعباس، اسلم، قدرت اللہ کے شعر عہدہ انتخاب تھے۔ مہری طرف سے آپ سب کو دی سلام۔"

۱۶ شوکت شہر یار، اداکارہ نے ۱۳ ماہ کی عیال خیر جانشینی کے بعد پھر سے محفل میں حاضر خدمت ہیں "سب سے پہلے کو اپنی بنیادی دوست اور سہیلی کی تہہ رنگل صروت کو شادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے (آمین) ماضی کرل اس مرتبہ کچھ خاص نوعیت کا محفل میں داخل ہونے تو زیادہ اتفاقاً پورے کے مطابق بڑی شان کی سرکس صدارت پر براجمان دیکھا۔ دیکھا آپ کو مبارک ہو۔ آغا زید بھائی حیدری کی خط لکھنے سے پہلے آپ پوری کہانی تو پڑھ لیتے یار ملو! رحمان میں صاحب کے دیوانے تو ہم بھی بہت ہیں۔ پڑھو ایک کہتے ہیں کہ میں دل کی دل میں رہتا ہوں۔ سب سے پہلے محفل تمام پر ہی سب اچھی لیکن انچھ میں جادی ہے کہ کافلہ دیکھ کے انعاماں ملے گئے۔ پڑھو ایک کہتے ہیں کہ میں ایک پیرس آفر کی سوچ بہت اچھی کی اور وہی کواہز مت ذرا سے کا موقع مل گیا۔ بدنام کافلہ زبیر کی ایک بہت اچھی تحریر تھی۔ آخر میں امین، رمیضہ، عین اور درویش ج میں ایک خاندان بن گئے۔ سو دوسروں کی چکی قسط شاندار لگی۔ لکھنؤ میں صاحب نے بنیادیں ہوں تو یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔ انشاء اللہ۔ ظاہر ہے کہ یہ دو ڈراماں ایک ہی فنکارانہ تجربے کی کھینچا ہوا تصویر ہیں۔ ہمارے معاشرے کے لیے جتنا کامیاب ہو سکے گا۔ پھر بھی اس کا تجربہ ہے۔ ملک مسافر حیات نے اس مرتبہ راجد کو اس کے انعام تک پہنچایا۔ علی شہید ہمارے معاشرے کے لیے کسی ایسے ہی کامیاب ہوجت ہے۔ پھر عورت میں دل و دماغی پائے تھی۔ ماروی کی یہ قسط اس مرتبہ شاندار تھی۔ جتنی میں کرل کی بد قسمتی ہی اس کو لے دلی۔ پانچ بہت اچھی تھی۔ آخری صفحات پر سیلاب کی آمد کو متاثر کرکے۔ قاسم جیسے لوگ داعی لاکھوں شریف لوگوں سے بہتر ہیں۔ فضل اور جیسے جاگیردار کا انعام اچھا لگتا لیکن آخر میں کہانی کا انعام کچھ اور اچھا لگا کہ رکھا کو زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کا سہارا تو ضروری تھا۔"

۱۱۱ مسجد یہ بخاری، ایک سے تہرہ کر رہی ہیں، لیجئے حج کچھ سے کی خیر جائزگی کے بعد کسی کا حق مارنے کے لیے اسے تہرہ کے ساتھ حاضر ہوں۔ 20 نمبر کو سنیں کا دیہ ہوا۔ ناٹل کو کچھ کر انگوں میں مویا اتر آیا (خدا خواست) کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر اگل کی نظر اور ذوق نظر کو محترم جن اٹھا ہیں سلامتی کی راہ دکھا رہے ہیں۔ ادھر یہ میں آپ نے جن موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس پر اتنا کہ کافی ہو گا کہ عوام



ہمارے توانا حالات میں بھی صبر کا دامن تھامے۔ پرخیزم ہیں۔ بیڑوں ستا ہوا کین مہنگی کی جوں کی توں ہے۔ اب چلنے میں محفل مخلوط کی جانب۔ زویا کو بعد رکفل دیکھ کر بدعظمی ہوئی۔ دوسرے سہرے پھر حمدت اللہ نازی بیک کی طرح دھبے سے اور گھٹکے گھٹکے ادا رنگوں میں فرست کاں تبصرہ کے نظر آئے۔ یہ کانی کے سارے سہرے لوگ بھی اپنے اختصار یوں کے ساتھ محفل کی رونق پر جاتے نظر آ رہے ہیں۔ ستاروں پر

[illegible]

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے تھیں، اسی لیے انھوں نے "مولیٰ صافی" جیسی گردن باز دو جہیں پر کے لیے ایسی مگر اہٹ آٹھوں میں سے انکار کے سامنے لیے ہوئے خوب صورت دو جہیزوں تک رومی کی جیسے ایسی ہی نے اچھے سے چننا کیا ہو۔ انشاء میں جون ایلیا کی سلاطین کی راویا جیسی دو تین گھر کر گئیں۔ ایسی حالات پر ادرار کے باقی بہت اچھی لگیں۔ اللہ کرے پاکستان ضرور امن کا گیارہوے ہے۔ قارئین کی بزم میں رومی کی صدارت پر زبردستی، خوب شاہی ہنر کیا ساتھ میں قدرت اللہ تبار کی اور محمد یوسف خانولہ کی باتیں بھی معیاری لگیں۔ کہانی کا آغاز ایک اور اہم شکل منظر حیات کی چمک دیتی ہے۔ بے چاری صابری نادانی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور ملک صاحب کا نوجوان لڑکے کو لیں کو خیرا بہت اچھا لگا۔ جب تک تمہیں یہاں نہیں اور یہاں ارضی فلسفین کے لیے یہ پڑھ رہی ہیں اس سرزمین کو کون ہویت سے رنگ دیا جائے گا۔ یہاں پر اچھی کی حالت ہے کہانی میں بھی زبردست جاری ہے۔ مزید کہ صاحب اولاد نہ ہونے والا چاہا ہے۔ ہارن کے باپ کی ادھی چاند سے لگ رہا تھا، اردون اس سے اگل بھی نہیں کرے گا۔ لباس ستاروں کی کہانی میں اچھی جاری ہے۔ یہاں پر شہادت ڈیلر ہوتے ہوئے ہر مکمل اور ادرار کا م کے ساتھ ساتھ سلاطین کے خیروں سے خوش کی گئیں اپنے معصوم شہر کو بھی سنا۔ یہاں پر اچھی کی صورت کی زبان میں رسول جس نے اللہ کو دست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا۔ سبحان اللہ اور افراتو فرات خند ہوتے ہیں۔ تعریف کی باتیں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کی تاہم کارایاں جہاں ہزاروں لوگوں کے لیے رحمت ہیں وہیں عیدوں کے لیے رحمت ہیں، انھیں اور صلیب شیش پر مسکن زندگی گزارنے کی۔ دو اہل سید کی کہانی نے 2005ء کے ڈولے کی یاد تازہ کر دی۔ ڈائری ایک مختصر پریس دو۔ انھیں کو کیسے سے جاننے ہو گا مگر اس کی ڈائری اس کی ان کے رومی۔ یوں ظاہر جادہ مطلق کی دو ڈائریاں بھی مل جوں ہیں۔ بانی تم کو شہر خجندہ، دواز، سلاطین اور پاک عورت بھی اچھا تاثر دے گئیں۔ باقی کردار تو اسے ہوتے ہیں۔ محفل شہر و خجندہ اپنا شہر پہنچ کر دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

۱۱۱) ہارون مہرکس کے مردان سے ملے آ رہے تھے "سرواق پر کیا کتبہ ہے کہیں سر می اٹھیں اس کا سیدھا جھانکوں کی اس میں جاکھا" تخت پر شاہی سے جناب ذوالعجاز صاحب کو بڑی آن بان سے تخت پر شاہی پر جلوسے بھگتے کے پاس سہارا کھول جوجی۔ یوسف بھائی آستانوں پر ایڑ ٹوٹا ٹوٹا تھا، یکسی اداسی بار۔ کھیل کا بھائی کی کی محسوس ہو رہی ہے۔ کہا کیوں کی ابتدا تاریخ کے ہمرکوں سے تخت جناب الیاس سیتا پوری کی پیش قیاس تمام سے کی۔ جاندار اعداد میں کسی کی اس کہانی کے مرکزی کردار ہارون پر چٹائیں کھینچے کیوں بار بار ہوا آ رہی تھی کہ نواب صاحب کی آج کل جہیز پر ہے۔ مراد اور محبوب پہلے فکس رقیب تھے لیکن اب کھل کے ایک دوسرے کے خلاف بولنے لگے ہیں۔ باروی بھی اب کھل کے کا ساتھ دے رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب یعنی صاحب کی سوانح جہیز کی طرف بڑھے کوٹاہی کے عمر میں ایسے کھوئے کے فہم کہ یہ دم الیاس کا بیت، وحشت، سلاط اور غائب اسرائیلیوں کے مظالم کے خلاف قسطنطنیہ کے جہازوں کے کارناموں کا بیت ہی دلچسپ اور مصنفی تخریر احوال۔ کردار دارا اور بہت ہی مضبوط غلام..... ادارے سے ایسی ہی کہانی کی امید تھی۔ درد، تک اور دل گرفتہ کہانیوں کے خالق طاہر جاوید مغل صاحب نے بار بار اپنی روایات کو برقرار رکھے ہونے لایا۔ پروفیسر اشفاق بیگانی صاحب ایک درد مند دل رکھنے والے انسان۔ انہی کی بے جا جگہ اور ان کے ان کی کی بے بسی..... بلاشبہ اسٹوری آف دی مین سے ملک صاحب کی چوری چوری، کم طرف اور مطلب پرست محبوب کی کہت میں گرتی مصحح اور بد قسمتی کی کی داستان محبت، کاش اسے کاش یہ زمین تھیں اچھ جاگیں۔ حالیہ سالوں کے پس منظر میں کسی کی آخری صفحات کے لیے منظر اہام صاحب کی سلاط کے کیانے خاص تاثر میں چھوڑ دی آخری صفحات پر احمد اقبال صاحب نظر نہیں آ رہے۔ ادارے سے درخواست ہے کہ مصلوہ اور کہانی کے باصر ملک صاحب کو لایا جائے۔ مکمل شعر و سخن میں مسرت ایڑ مسرت ملحد معاویہ سے مکمل بھائی، نیازی بھائی اور دینیہ احمد ملک کے انتخاب پاپ پر ہے۔ بطور پر جاتے سال کا آخری عقد اور دل بیٹ ایلز بیٹ راب۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی بی منفرد چھوڑا جہاز جناب مسفرہ حسین کارڈو ایکٹیلہ بیٹا

عشق نما

الیا سیتا پوری

اگر کتابیں لکھنے کا رجحان طاقتور نہ ہوتا تو آج کوئی تاریخ سے واقف بھی نہ ہوتا... اوراقِ کتاب کے ہونے اور واقعاتِ ماضی کے... تو پڑھنے والا مستقبل کی سوچہ بوجہ بھی پالیتا ہے... تاریخ صرف بادشاہت کے اصول یا سیاست کی نیرنگی سے ہی واقف نہیں کراتی بلکہ دلوں کے بھید اور خوابوں کی تعبیر بھی بتاتی ہے... اس کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے مگر وہ رشتوں کے گرداب میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ کسی ایک سمت جانے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا... کیونکہ ہر رشتہ اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ اس کے کاندھوں پر اگرچہ ایک اہم عہدے کی ذمہ داری تھی لیکن مشکلات کے باوجود وہ کسی رشتے کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ دولت کی ریل پیل نہ انہیں کو دشمن اور دشمنوں کو اپنا تو بیٹا دیا تھا مگر قسمت کا یہ فیصلہ مٹ نہیں سکتا تھا۔ اسے تو ایسا ہی لگتا تھا کہ اس کی قسمت کا یہ فیصلہ کرنا تو اپنے لختِ جگر کو کھو دیتا جو اصل میں اس کا وارث تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اور واقعات

رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے میزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال و زر اور درہم و دینار سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس کرتا رہتا تھا کہ وہ کسی دن بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور میزہ کو بھی خبردار کیا کہ اس کے بہنوئی سے چونکا رہے لیکن میزہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، شادی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا۔ ”میزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سناپ کی طرح اپنی ناک کا بادل لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔“ میزہ نے بات ہی میں اڑادی۔ ”وہ کیا بادل لے گا۔“

ہارون اور میزہ خوش و غم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع شروع میں میزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے نسل دینا، صاف ستمرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ عامر کو پیچ دکائیں سناتی رہتی۔ عامر کسی بات پر روکتا تو میزہ سوچنے کے مٹا لیتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔ میزہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع بن گئی۔ وہ مال و زر اور درہم و دینار کو اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات میزہ کو..... ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ بوڑھا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بننا بیٹھا رہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرح سے دغل گرد بناتا چلتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بری طرح اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا کہ اب وہ دادا کے پاس جاتے ہوئے گھبرا لگتا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر

اب تو وہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔

کچھ دنوں بعد میزبہ کا باپ بھی آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس کی بیٹی میزبہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دست گرد کیج کر انفسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹی نے گھر کی ہر چیز اپنے قبضے میں کر لی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور گھبر مند ہو گیا کہ میزبہ کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا، ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے میزبہ کے باپ کو خشکی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے میزبہ کے باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کر لیے تھے جو میزبہ کے باپ کے دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں کیا۔ میزبہ کے باپ نے بھی اس کدورت کو محسوس کر لیا۔ اس نے زمانہ سازی سے کام لیا۔ بولا۔ ”شاید یہ شادی پہلے ہوجانی اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا ہوتا تو نے اپنے بیٹے کو میزبہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے کیونکہ مجھ کو ہارون سے بھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔“

ہارون کے باپ نے اس کی بات کو سنا اور سوچ کر یہ رشتہ قبول کر لیا کہ ہمیں تو جو انوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہی چاہیے۔“

میزبہ اپنے باپ کے ساتھ برقی جانے والی سردھری کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران میزبہ کے باپ سے کہا۔ ”کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا۔ میری رائے میں آپ بھی یہیں میزبہ کے پاس آجائے، دل بھلا رہے گا۔“

لیکن میزبہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا۔ ”گھر تو بس اپنا ہی ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہو تو تو میں صاف انکار کر دوں گا۔“

میزبہ کے باپ نے اپنے گال پر ہلکی سی مسخوس کیا۔ ہاتھ کا نواہہ دے کر نہ لے جاسکا۔ بولا۔ ”اپنا گھر کسے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لیے یہ تعریف گالی بن گئی ہے۔ اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔“

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجہ میں کہا۔ ”خدا

کے فضل سے تو سمجھ دار انسان ہے، بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔“

ہارون باپ کی باتوں پر کٹنا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا۔ ”بادا جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میزبہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری لگنا ہے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک بچی بات کہہ دی ہے، یوں بھی مشہور ہے اگلی بر (بچائی کڑی ہوتی ہے)۔“

میزبہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی، بولی۔ ”بادا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جائے۔ یہ گھر مہمانوں کے لیے تنگ ہے۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا۔ ”مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لیے کہہ۔ میزبہ! میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

میزبہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں لاپٹی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا جب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کر لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“

پھر اپنے ہاتھ ایک کپڑے سے لہجے ہوئے بولا۔ ”میں نے یہاں تو کئی شرمندہ ہوا۔ اگر میں اتنی سی مع اور خود مری کی خجائوں پر ڈور اسات بھی خود کر لیتا تو شاید اس شرمندی، قحالت اور ذلت سے محفوظ رہتا۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں سسکیا پاتے ہوئے کہا۔ ”غوب، یعنی میں خود غرض، طامع اور حرص ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کیا ہے تو کوئی تجھ سے.....“

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”بادا جان! ویسے یہ بڑی زیادتی کی بات، آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی ہے۔ آپ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیے۔“

باپ نے برسر پڑا۔ ”تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا نہیں ہو سکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہو سکتا اور اب میرا فیصلہ سچ ہی لے۔ تو نے میزبہ سے شادی کی ہے، اس لیے یہ میزبہ کا گھر ہے۔ میزبہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مہمان بن کر آ سکتا ہے۔“

اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔“

میزبہ کا باپ تھلا کر چیلا۔ ”جی بھروسے کے اہانتیں کر لے، جتنا چاہے بولتا رہ لیکن یہ مت بھول، بھی کے دن

بڑے کبھی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب میں تجھے تیری اپناؤں کا جواب دے سکوں۔“

میزبہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ ”بادا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کدورتیں زندہ رہیں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔“

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آرہا تھا۔ بولا۔ ”بادا جان! ہماری مہمان آوازی تو مشہور ہے، آپ ذرا دل سے کام لیجیے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔“

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ”مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون..... تو خاموش رہو ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دوں گا۔“

میزبہ کو رونا آگیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کونے میں چلی گئی اور وہاں جا کر روئے گی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند بھجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ ”بیٹے عامر! کس لیے ہوں؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”میرا دوست ہے، سب سے اچھے۔“

باپ نے سر کوئی میں دوڑا سوال کیا۔ ”اور یہ دوڑا بوڑھا جو میزبہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟“

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ ”بڑا، آپ سے لڑتا جو ہے۔“

دادا نے پوتے کی پشت چھتپائی اور تیسرا سوال کیا۔ ”تیری یہ بچی ماں کیسی ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”اچھی، بہت اچھی۔“

اور وہ روئے لگا، بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔ ہارون کے باپ کو شبہ گزرا کہ شاید میزبہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر میزبہ سے متعلق سوالات پر روئے لگا۔ اس نے بچی کی پیچھے چھتپائی اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میرے بیٹے عامر! تو مت گھبرا، اگر میزبہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔“

عامر نے برا مان کر جواب دیا۔ ”دادا جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ کہیں میری یہ ماں مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔“

دادا اس جواب پر چونک پڑا۔ اسے اپنے سارے منصوبے درہم برہم ہوتے نظر آئے، بولا۔ ”میرے معصوم

کر سکتا جو میزبہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہوئے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔“

میزبہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ ”میزبہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا کھانا بڑھا رہا ہے۔“

میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سرکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میزبہ نے برا مان کر جواب دیا۔ ”بادا جان! میں آپ کی یہ بات سمجھتی ہوں کی۔ میں عامر کو چاہتی ہوں، ازحد، بے حد، بہت زیادہ اور یہ تاہم ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔“

باپ نے انفسوس سے کہا۔ ”میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے۔ تو اس کے ساتھ کچھ بھی کرے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہوگی تو تو اس پر پوری طرح اعتبار کر سکتی گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی مامتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔“

لیکن باپ کی محبتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دنوں بعد جب دادا کا کارڈ ملا تو عامر میزبہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں میزبہ کی محبت کا طوفان برپا تھا۔

آج اس وقت اس کو میزبہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح میزبہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھالیا اور پیچھے کھینچ کر پیار کرنے لگی..... عامر بھی میزبہ کی گود میں بیوست ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شورشل اور ہنگاموں میں یوں الجھا رہا کہ گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ کبھی بھی اپنی خیریت سے میزبہ کو مطلع نہ کیا کرتا۔ دوسری طرف میزبہ کا باپ آذربائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہیں ہارون کا بہنوئی بھی تھا۔ اس نے میزبہ کے باپ سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا۔ ”تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ میزبہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری فلاح نہیں یا خوش نہیں ہے۔ میزبہ سب سے زیادہ آرزوہ اور ناخوش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ چھٹی ہونے کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے

ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔“

مینزہ کے باپ نے ازراہ شکایت جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی نا انصافی کی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مینزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ ہو رہا ہوتا۔“

بہنوٹی نے کہا۔ ”ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے ذریعہ تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رہی جائے گی۔“

مینزہ کا باپ چونک کر بولا۔ ”یہ بات تجھ کو کس نے بتائی؟“

بہنوٹی نے جواب دیا۔ ”مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتائے گا۔ مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہوئیں۔“

مینزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”اچھا ذرا اس کی وضاحت کر دے کہ مینزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ میری مینزہ کو لا ولد رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوگا؟“

بہنوٹی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور نا گفتنی حمل کر کھڑا ہوں۔“

مینزہ کا باپ ہارون کے بہنوٹی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے یہ مشکل دریافت کیا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے تحت اسامہ لکھانوی کے بغیر یہ بات صاف صاف بتا دے؟“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ ہارون کے بہنوٹی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! ہارون اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ مینزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے عامر کو ہمیشہ مینزہ کی محبت حاصل رہے گی۔“

مینزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگا یا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر مینزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوٹی کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جھلنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”تو یہ بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنادوں گا اور دیکھوں گا میری مینزہ اولاد سے کس طرح محروم رہی جاتی ہے۔“

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے؟ اس نے مینزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد محض پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی محض پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی

جاسکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتا چلا ہے جو مینزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ مینزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

مینزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہو گئی۔ مینزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کر رہی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہونے لگی تھی کہ عامر کو اس کا دادا باری طرح ورغلا تا رہتا تھا۔

دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل مینزہ کی محبت سے خالی اور محروم نہ رہے۔ اس نے سو سو طرح سے بیٹی باور کرایا کہ مینزہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے، محض بناوٹی ہے۔ وہ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال و زر اور درہم و دینار پر قبضہ کر لے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھا یا کہ عقل مند لوگ دولت اور درہم و دینار کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اسے سمجھنے سے تھکے جاتے تھے یہی سبق دے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سافرق آ گیا۔ اب وہ مینزہ کے طرز عمل میں اس کے صنعت و معیار اور ذہن کے کوشش کرتا رہتا اور غما سازوں میں ان میں سے کوئی نہ کوئی تھے مینزہ میں پایا کرتا تھا۔

ہارون خراسان میں تو رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ یہاں اس کو اچانک اپنے بہنوٹی کا خیال آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوٹی زنجی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے چنانچہ اس نے مینزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطور خاص یہ ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوٹی آئے تو مینزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی بات کرے کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اس کے بہنوٹی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا غلغلہ عامر کے لیے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے مینزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ

خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی ہمتیں بٹھا کر رہی رہی، اس کو ہارون نے ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ مینزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے، کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے چڑ کر ہارون کو لکھ دیا۔ ”ہارون! میں چند ماہ کے لیے محض جاری ہوں کیونکہ وہاں میرا باپ آذر با بچان سے پہنچ رہا ہے۔ میں محض تنہا جاری ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔“

”ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا پن نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظر انداز کر دیا۔“

کچھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہرحال میں محض جاری ہوں اور یہی بات کہ میرے بہنوٹی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باتیں نہ کروں تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔

”ہارون! میں بہت اداس ہوں اور یہ ادا کی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یا تو، تو خود چلا آ، یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے کی کوئی نہ کوئی سکتی ہوں، اسی پرناز کر سکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ ورغلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال و زر اور درہم و دینار کو بھرا تقسیم کر سکے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔

اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کر کے رہوں گی۔ آ، جلد آ تاکہ میں تجھ سے ایک بیٹا، کم از کم ایک بیٹا حاصل کر سکوں۔“

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شدید غمزدگی مینزہ کو اولاد سے محروم رہنے کی سازش سے کسی نہ مطلع ضرور کروا دیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ

کرتی۔ وہ اپنے بہنوٹی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ مینزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے بہنوٹی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے مینزہ دمشق نہ چھوڑے۔ وہ اسے محض خود پہنچانا چاہتا تھا اور مینزہ کے ساتھ محض میں وہ خود بھی رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوٹی اس کی عدم موجودگی میں محض اپنے اور مینزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیں۔ اس نے بھلجت مینزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر محض جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ مینزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ عامر مینزہ کی لائق اور بے پروائی سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ مینزہ سے باتیں کرے لیکن مینزہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا۔ اس زبردست تبدیلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتا نہ تھا کہ مینزہ کہاں جا رہی ہے۔ مینزہ نے ہنتر اور ضروری سامان باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کئی بار اظہار کر دیا کہ عامر دور نہ رہا۔ صبر و تحمل یہ سطر دیکھ رہا تھا لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پارا تھا۔ ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بوسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پارا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد مینزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے ہنتر پر پڑا کر دیش بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی جی ماں کہاں جا رہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی باتیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے دوبانگی جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور مینزہ کے دروازے پر دھلیز سے لگ کر پیٹھ پر ہا دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات مینزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ستا رہی تھی، اس کو وہ غما مٹا عامر ہی طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں ہڑک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں

بھر آئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان دونوں کے درمیان ایک غلطی محال کر دی تھی۔

سینس ڈائجسٹ 21 جنوری 2015

داشنگ مشین کے لئے صوفی سوپ

اجلی دھلائی کی سچی طاقت

U.A.N. 711-100 786
www.sufgroup.biz
info@sufgroup.biz



اسی وقت خوابیدہ حالت میں عامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور بھائی لیے ہوئے کہا۔ ”عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔“
عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! آپ جاییے اور آرام کیجیے۔ میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔“
دادا نے انگڑائی لیے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔ ”عامر! تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی عم خوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود۔ ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔“

عامر نے کہا۔ ”آپ سب کا ارشاد سنا آگھوں پر۔“
دادا نے پوچھا۔ ”میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھا دیا ہے، اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوگی کہ تو، تو میزہ کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ جانے کی ضرورت رہا ہے لیکن میزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! حقیقی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

میزہ دل مسوس کر رہ گئی، بولی۔ ”باوا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں، اس سے کئی آدمی تیار و تیار ہو جائیں گے۔ میں عامر کی شہادت دے دوں گی۔“
حالانکہ آپ اس محسوس کو یہی یاد کر رہے ہیں۔

ہارون کے باپ نے حیدر یاں بدل کر جواب دیا۔ ”میں کچھ بھی باور نہیں کر رہا، عامر تجھ کو وہی کہے گا جو تو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درمیان دو تیار دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود محسوس ایکی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے میں یا عامر کس نتیجے پر پہنچیں گے؟ یہی تا کہ تجھ کو عامر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے۔“

میزہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی۔ ”بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روائی کے وقت اس ندامت سے نہیں دو چار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔“

ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ رہا۔ اس نے عامر کو میزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا۔ ”عامر! ادھر

عامر دلیز پر بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا۔ ہارون کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں میزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر لگی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی۔ میزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کون؟“

جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ ”ماں! میں ہوں عامر۔“
میزہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”عامر! مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”ماں، میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دلیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آٹھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔“

میزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ ”یہاں دلیز پر بیٹھے کی کیا ضرورت تھی؟ آواز نہیں دی تو دستک دے لیتا۔“
میزہ اس کو کمرے میں لیے چلی گئی۔ اس نے صبح کی روشنی میں عامر کے چہرے پر خشک آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شوخی سے پوچھا۔ ”کیا تو رورہا تھا؟“

عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں بولا۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے باپ کے پاس میں کیوں جاتی ہوں؟“

عامر نے پوچھا۔ ”کیا آپ تنہا جا رہی ہیں؟“
اس نے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ میں محسوس سے اکیلی ہی آئی تھی۔“

عامر نے دیکھا میزہ یہ جواب دیتے ہوئے کچکا مٹی تھی اور اس کی نظریں غلامیں گز کر رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ ”میں کس کے پاس رہوں گا؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے دادا کے پاس کیونکہ میں بہر حال تیرے لیے غیر ہوں۔“

عامر نے خوشامدی۔ ”آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا، میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔“

میزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی بات رد نہیں کر سکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا، بولی۔ ”عامر! تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“

عامر اس سے چپٹ گیا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔“

آ میرے ساتھ چل۔ میں تجھ کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہوں دوں گا۔“ پھر میزہ کو بطور خاص حکم دیا۔ ”لو! تو محض اس طرح جارہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے محض جانے کی اجازت تک نہیں لی۔ تو اپنی مرضی سے جارہی ہے اس لیے تو اس وقت تک محض میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آجائے۔“

میزہ نے رقت سے جواب دیا۔ ”آپ تو واپسی کی بات کر رہی رہے ہیں لیکن ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں، میں دوبارہ نہیں واپس آؤں گی۔“

عامر کا دادا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد میزہ اس طرح محض روانہ ہوئی کہ اس کا ایک بڑی دورانیہ سفر اس کا سر پرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ میزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیتِ ایزدی کے مطابق ہے۔ اس لیے میزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

محض میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی۔ یہاں اس کے چند رشتے داروں نے خوش آمدید کہا۔ اس کے باپ کی رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے میزہ کو کھیت اور محنت کے آثار اور اس کی عامر اور اس کی یاد دہانی دینی۔ میزہ کو وہ رہ کر دمشق، عامر اور ہارون کی یاد دہانی دیتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر، جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ محض کی فضا میں چھائے ہوئے بادلوں کو بڑی حسرت سے دیکھتی رہتی۔ ان کالے کالے اور بھورے یا سرمئی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن میزہ کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروازے یا حاجت سے موٹیوں کے گلے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصباح اس کا باپ بھی آذربائیجان سے آگیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بیٹا بھی آیا تھا۔ اس کی نظر پر میزہ پر جو بڑیں تو وہ مسکرائے لگا اور اشاروں اشاروں میں مانی تعمیر سمجھانے لگا۔ اس نے میزہ کو پھر شوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال کیا۔ ”میزہ! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھ کو

نکال دیا؟“ میزہ نے غصہ کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے گوشے ہچککنے لگے۔ ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی۔ ہارون کا باپ مجھ کو نکالتا کیوں؟“ بیٹھتی نے نظر اٹھو چھا۔ ”عامر کہاں ہے؟“ میزہ نے چور کی طرح جواب دیا۔ ”دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔“

بیٹھتی نے شرارتاً پوچھا۔ ”تو میرے ساتھ کیوں نہیں آئی؟“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے حذر کر رہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا انتہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔“

بیٹھتی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا۔ ”میزہ! تو جو چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موزی ہے۔ جس طرح کا بیکار، اگر تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے سن لے۔“ میزہ دم بخود کسی معصوم تماشا کی طرح تھوڑی سی صورت دیکھتی اور باتیں مٹتی رہی۔

ہارون کا بیٹھتی کہتا رہا۔ ”میزہ! سادہ لوح اور بیٹھتی بھائی لڑکی! ابھی جب بھی میں تجھ کو دیکھتا ہوں یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کبھی تو کوئی بڑے بڑے شہر کی لڑکی بنے گی۔“ لیکن اسی وقت میزہ کا باپ بھی آگیا۔ اس نے ہارون کے بیٹھتی سے پوچھا۔ ”کہیں تو میری بیٹی کو درغلا تو نہیں رہا؟“ پھر میزہ سے پوچھا۔ ”بیٹی! کیا بات ہے؟ تو مول کیوں ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”پدر بزرگوار! کوئی ایک سبب ادا اسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں۔ میں ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔“

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“ ہارون کا بیٹھتی بول اٹھا۔ ”مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اس عمر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر میں تباہت ہوتا لیکن اب وہ گھر.....“ میزہ رونے لگی، بولی۔ ”میں اس بوڑھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے ہدایت کر دی ہے۔“

میزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”پھر بھی ہو! کیا؟ کچھ تو بتا؟ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔“ میزہ نے جواب دیا۔ ”اب میں دمشق واپس نہیں

جاؤں گی۔“ ہارون کے بیٹھتی نے میزہ کے باپ سے کہا۔ ”میزہ کے اس جواب میں کہ اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی، اس سے کچھ پوچھنا ہے۔“ میزہ کے باپ نے کہا۔ ”اچھا، اب تو واقعی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو محض ہی میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور نہیں رہے گا۔“

میزہ نے اٹھ کر ہارون کے باپ کو دیکھ کر پوچھا۔ ”اور عامر؟ عامر کہاں رہے گا؟“ میزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا۔“ پھر ہارون کے بیٹھتی سے کہا۔ ”تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں میزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ باہر چلا گیا، میزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تو بار بار عامر کا نام کیوں لیتی ہے؟ یاد رکھو تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف تیار کر رہا ہے۔ افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ اور روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔“ ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے مل کر نہیں رہا۔“ میزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنی اولاد کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گرمی سے اس کے سینے اور پورے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے دے دے لہجے اور اشاروں کی باتوں میں پوچھا۔ ”میزہ! مجھے تو تیری اولاد سے محرومی کے چھکے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کا فرما نظر آ رہا ہے۔“ ہارون نے ہر خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں کچھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔“

میزہ کوئی جواب دے لے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن چٹائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی غلطیوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان باتوں کو پکڑ لیا جہاں ہارون نے چلا کیوں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف مواقع پر خود کو بہ غلت میزہ سے الگ کر لیا تھا اور یہی وہ غلطی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔ پہلے وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی

لیکن اب وہ ماضی کے اس عمل میں تواتر اور پابندی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال کی شکل اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور اولاد حاصل کر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بیٹھتی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور میزہ میں اختلافات پیدا کرادے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ میزہ سے تھکے میں چند باتیں کرے۔

میزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ اس بلاوے کو ٹال دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی نقل سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بیٹھتی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر بدرجہ مجبوری اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔ ”میزہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لیے دمشق جا رہا ہوں۔ ہارون کا بیٹھتی یہیں رہے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔“

میزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔ ”لیکن میں اس کو ساتھ چلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا محض ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عمر کی لڑکی کی طرح نہیں رہتا تو اس کے ساتھ بھی نہیں لے سکتا۔“ میزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا رہا۔ ”لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہارون اپنے بیٹھتی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا تاخیر سے پہنچتا تو، تو آج ہارون کے بجائے اس کے بیٹھتی کی بیوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔“

میزہ نے کہا۔ ”باوا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجیے۔ گھما پھرا کر کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بیٹھتی کو تیرے ارد گرد دیکھ کر شتمیل ہو جائے۔ تو محتاط رہنا بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں نہیں موجود ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظر کر رہے ہوتے ہیں۔“

میزہ نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔“

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے اس نے ایک اور ہی منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن اب مشکل پیش آ رہی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ کئی ایسے مواقع ملے جب وہ منیزہ کو ورغلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصباح اٹھ کر نماز پڑھتی، اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگتی پھر کھانے کے کاموں میں مشغول ہوجاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آگیا۔ منیزہ نے سنی دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو نال دیتی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گھٹی، بخار بھی ہو گیا۔ رات بھر نیم مدهوشی میں معلوم نہیں کیا بیڑی پڑتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی کو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ بہنوئی اس کے سر ہانے جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ ”منیزہ! اب کسی طبیعت ہے؟“

منیزہ نے آنکھیں میاڑ میاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔ ”آپ یہاں کب آئے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”منیزہ! میں حیرت بخور یوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو اتنی مجبور ہیں، اس نے زیادہ بوجھ بٹا کر رکھا ہے۔“

تھوڑے کھول سے باہر آ جانا چاہیے۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نہ خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے آس پاس کوئی غول چڑھا رکھا ہے جو اس سے باہر آ جاؤں۔“

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شوشی سے بولا۔

”تجھے تو جھوٹ بول کر دھوکا دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔“

منیزہ نے مختصر کہا۔ ”یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل بشارت اور مطمئن ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! پھر کبھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جائے دو۔“

بہنوئی نے منہ پٹا کر کہا۔ ”ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔“

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی۔ ”جو بات کرنی ہو، مختصر آ جلدی کر لیں کیونکہ

طبیعت باتیں کرنے یا سننے پر رغب نہیں ہورہی۔“

بہنوئی نے پوچھا۔ ”منیزہ! تو جیجتا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور مطمئن ہے؟“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی۔“

بہنوئی تھلا گیا بولا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے قریب سے جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے۔ اور اگر ہارون تیرے پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔“

منیزہ نے کہا۔ ”بس یہی بات کہنا چاہی یا کچھ اور بھی؟“

بہنوئی سخت مایوس تھا، بولا۔ ”پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم مگر کامی باتیں کروں گا۔“

منیزہ نے بڑی تنبیہ کی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو یہ چیز کہنا ہے پر منحصر ہو تو میں تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب آپ آگے بڑھیں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اگر ہارون اور میرے درمیان ہارون کا باپ اور عاصر موجود نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ کم دنوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس لیے میں۔۔۔۔۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بہر حال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ جو تھوڑی بہت رہیں آج بھی گئی ہیں، ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ ہی محل جاتیں گی۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور شہادت کی زندگی گزار رہی ہوتی۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اے بھائی! یہ شہادت کی زندگی کیا ہے ہوتی ہے؟ مجھے کسے معلوم ہو؟“

بہنوئی نے ہنس کر کہا۔ ”تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے، پھر تجھے خود بخود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔“

منیزہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی۔

”بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے۔ اگر تم سے شادی کرنا

ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے محبت کرتی ہوں۔“

بہنوئی نے طنز کیا۔ ”محبت کرتی ہے ہارون سے! خوب۔ منیزہ! تو تو مجھ کو بے وقوف بنارہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے۔“

منیزہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی۔ ”میرا درد کر رہا ہے۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دیوار سے سرنگراؤں گی۔“

اسنے میں منیزہ کی پھوٹی بھی آگئی۔ اس نے منیزہ کو بستر پر بیٹھ جو دیکھا تو دور رہی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے منیزہ! تیری طبیعت تو خشک ہے؟“

بچ میں بہنوئی بول پڑا۔ ”منیزہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے اس کو یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طیب سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔“

پھوٹی نے کہا۔ ”یہ خشک تو کہتا ہے۔ تجھ کو اس کا کہنا مان لیتا چاہیے منیزہ! انزلے کا زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا خطرناک بات ہے۔“

منیزہ نے جھجکا کر کہا۔ ”پھوٹی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے کی جاری ہیں۔“

بہنوئی نے سختی سے کہا۔ ”تو طیب کو بللا، میں ہارون کی اطلاع کی طرح نہیں کر سکتی۔“

بہنوئی طیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے بہنوئی کو اتنا غیبت نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آجائے تو اس کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر دہل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلتے گا۔

کافی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو طیب تو اس کے ساتھ آ گیا نہیں، ہاں چند دو ایمیل البتہ اس کے ہاتھ میں تھیں۔ انھیں منیزہ کی طرف پڑھا دیا، بولا۔ ”منیزہ! میں نے تیرا حیران کن کہہ کر طیب سے یہ دو ایمیل لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟“

منیزہ نے بیزاراری سے جواب دیا۔ ”بھائی! تم نے بلا وجہ حسرت کی، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ پھوٹی کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بولا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے جواب چاہتا ہوں، یہ تو تو اچھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ دوسرا بنا رہے گا۔ رہی یہ بات کہ تو خود صاحب اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا بھی نہیں نہ ہونے دے گا

عشقی ناچھا۔ اور اگر یہ غرض ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ بہر حال تیری آخری تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔ پھر وہ اور زیادہ بے شری پر اثر آیا پوچھا۔ ”منیزہ! تیرا بچہ کیوں نہیں ہوا؟“

منیزہ پھر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رسید کر دیے، بولی۔ ”بے شرم انسان! تو اسی وقت دور ہوجا میری نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔“

لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”منیزہ! میں غرض مند ہوں اسی لیے یہ ذات بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔“

منیزہ نے سچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی۔ ”میرا راستہ چھوڑ دے! اوخصیت انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا، میں نہیں سنوں گی اور ہارون کو تیری باتوں سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا سچ جواب۔ افسوس کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔“

منیزہ بھاگ کر پھوٹی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر غصہ مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اب اس کا ایک اور سنگینی ملائی ہوئی تھی اس نے سوچا کہ منیزہ کے لیے یہ کچھ ہارون کو بتایا یا تو کیا ہوگا؟

اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار ناممکن ہوا تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف منیزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدا یا تو باپ کو دمشق سے واپس بلاوے ورنہ ہارون ہی کو واپس بلا لیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبول بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آگیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ”بھئی منیزہ! کیا ہوا؟ یہ تو رو کیوں رہی ہے؟ خبر تیرے تو ہے؟“

منیزہ نے ہچکچاتے لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”بادا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے۔ اس عرض میں اب میں نے یہ سمجھا ہے کہ بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قتل

TSR Worldmark Image - www.UnregisteredImage.com

از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔

باپ نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟“
میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔“

باپ نے شوق سے میزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
”کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور بزرگوں کو آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم ہی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ گھبرا، میں آگیا ہوں۔“ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”میزہ! سچ سچ بتا اس نے تجھے کونسا بات تو کہی؟“
میزہ رونے لگی۔ ”ہاوا جان! یہ شخص قابل اعتبار ہرگز نہیں۔“

باپ نے چونک کر پوچھا۔ ”تو کو کیوں رہی ہے؟ اس نے کیا کیا؟ مجھے تو بتا کچھ۔“
میزہ نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا براہِ حشر کر دیتی۔“

باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے میزہ کو رلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا جہاں وہ چورڈ کی طرح چھپا کھڑا تھا۔ میزہ کے باپ نے طنز اُپوچھا۔ ”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

بہنوئی کی جان میں جان آگئی، بول نہ سکا۔ دولا آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟ میں تو بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“
میزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہنے میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ عامر باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور میزہ کی شکایت کردی، جھکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہا تمہیں چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی۔“

باپ کو اپنے بیٹے سے ہوردی ہوئی۔ ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“
ہارون نے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔“

باپ نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بجانب ہے۔ میں نے بھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر میزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی مرضی سے محض چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خودری محسوس کی۔“

ہارون نے تملاکر پوچھا۔ ”ہاوا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟ جتنی اس میں اتنی خودری آگئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔“

باپ نے چپاڑا پھیرا۔ ”نہیں، بہو سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔“
لیکن اس سے ہارون کا پارا چڑھ چکا تھا۔ وہ میزہ سے سخت ناراض تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ میزہ کو سمجھائے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگئی تو کوئی بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

میزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح میزہ کو روغلا یا ہوا اور میزہ کا تمہیں جانا بھی کہیں اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے عامر کو لے کر محض روانہ ہو گیا۔ شہزادانِ دولت کو کیا خیال ہے کہ ان کے دیکھ کر عامر گھبرا گیا۔ اس وقت ہارون کا بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ بہنوئی نے سلام میں پھل کی اور ہارون کو سلام کر کے عامر کی طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، جیسے لہجے میں پوچھا۔ ”تو، تو یہاں موجود ہے، تو کیا میرا اندازہ غلط نہیں لگا۔“

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر ہارون نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا۔ ”بہن مرگئی میرا ارشد ختم ہو گیا۔ اس لیے اب بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”تو معلوم نہیں کسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔“

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارون نے سختی سے منع کر دیا۔ ”کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا رشتہ ہی کیا، اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔“

بہنوئی شرمندہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہارون نے میزہ سے پوچھا۔ ”میزہ! تیرا

عشقی تمام

باپ کہاں چلا گیا؟“

میزہ نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہی نہیں۔ وہ باز آ رہا ہے۔“

ہارون نے بڑی جھکی نظروں سے میزہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ میزہ نے ایک آدھ بار اس کو اس طرح گھورتے دیکھ لیا اور سہم گئی۔ میزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھالیا اور اس سے گھر کی خیریت معلوم کرتی رہا۔ ہارون نے سختی سے کہا۔ ”میزہ! جیسے تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میرے جاتے ہی تو اتنی بدل جائے گی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟“

ہارون نے کہا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ میرے بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہ یہاں کیوں رہتا ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آکر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔“

ہارون دانت پیٹا ہوا بولا۔ ”اگر یہ بات جی تو تجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ میں اپنے بہنوئی کو سخت پسند کرتا ہوں۔“

میزہ نے ہارون کی بات کو سن کر ہنسنے لگی۔

ہارون نے کہا۔ ”انفوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن تو نے عامر تک کا خیال نہیں رکھا۔ اسے چھوڑ کر اکیلی محسوس چلی آئی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں محسوس چلی آئی۔“

ہارون نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے چلا ہوں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا مجھ سے طلاق دے دوں گا۔“

اس صحیح ترین اعلان نے میزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سمجھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ ”فرماں برداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟ کس کی فرماں برداری؟“

ہارون نے کہا۔ ”مجھ کو باتوں میں نہ بہلا میزہ! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے کہیں زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھنا چاہتا تھا۔“

میزہ کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر بات کو ختم کرنے کے لیے وہ وہ ہارون کے سامنے سے ہٹ گئی، بولی۔ ”ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت بھی میرے کاہنیں کرلوں گی۔“

ہارون دیکھتا دیکھتا رو گیا۔ میزہ اپنی پھوپھی کے پاس چلی گئی۔ دوسرے کمرے تک جاتے ہوئے ایک جگہ ہارون کا بہنوئی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میزہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”میزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے اس اجڑا انسان نے تیرا دل بھی دکھا دیا۔“

میزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ ”تو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو ہے۔ ہارون تجھ پر اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔“

ہارون کا بہنوئی خاموش ہو گیا۔
میزہ کو میزہ کے باپ سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اس نے والد کو بڑی خوشی اور غلغلے سے خوش آمدید کہا مگر ہارون اب بھی روغلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔“
ہارون نے بدمزگی سے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم بہن کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔“

میزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”ہارون بیٹے! تیرا بہنوئی کتنا ہی برسی لیکن یہ میدان جنگ کے اس دے میں تھا جس میں، میں خود شامل تھا۔“ پھر ذرا دم لے کر بولا۔ ”میں نے یا میزہ نے تیرے بہنوئی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی قدر و منزلت ہے، اس کا بنیادی سبب وہی ہے جو میں نے بیان کر دیا۔“

ہارون نے کہا۔ ”اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بہن کے شوہر کو میرے تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا جائے۔“

میزہ کے باپ نے افسوس سے کہا۔ ”مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا تعلق، سبب، وجہ؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیے۔“

میزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ مجھے کی کوشش کی اور جب کچھ مجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا۔ ”افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو میزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔“

شاید ہارون کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ ذرا نرمی سے بولا۔ ”پدر بزرگوار! میں جب بھی اپنے بہنوئی کی شکل دیکھتا ہوں، مجھے بہنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگی ہے۔ اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تو بلا کا جذباتی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کس تجھ سے۔۔۔“

لیکن ہارون نے بات کا ٹھنڈی دی، بولا۔ ”آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میں کب کہتا ہوں کہ اس پر اعتبار کرے؟ اس کے بعد وہ ہارون کو باہر سے لے گیا بولا۔ ”میرے ساتھ چل، ہم دونوں غصے میں کچھ باتیں کریں گے۔“

میزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگریزی کیلوں کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے تھے اور انجیر اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ میزہ کا باپ اس کو پاکستان کے سامنے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتوں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پسند کیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر جہان ہرگز نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔“

میزہ کا باپ ہنس دیا۔ ”بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ پاکستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔“

ہارون نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ

میرے بہنوئی کا چادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں میزہ سے قطع تعلق کروں اور آپ میزہ کو میرے بہنوئی کے حوالے کر دیں۔“

میزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گہرا کر کہنے لگا۔ ”بھڑا ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی تو لا ولد کیوں ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو خدا سے کیجیے۔ اولاد دینا یاد دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔“

میزہ کے باپ نے ایک دم چھٹکار کر کہا۔ ”میں خدا سے جو مانگتا ہوں، وہ اس سے ملتی رہ رکھتا ہے لیکن اب جو میں پوچھوں گا، اس کا تعلق تجھ سے اور میزہ سے ہوگا اور تجھ کو ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔“

ہارون نے کہا۔ ”جو کچھ بھی پوچھتا ہے جلد از جلد پوچھیں، ورنہ شاید اس کا بھی موقع نہ آئے اور میں واپس چلا جاؤں۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میزہ کب تک تیرے بیٹے عاصم کی پرورش کرتی رہے گی؟ وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب تک عاصم بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرے گی۔ اس کا یہ خیال تو میں مان بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی۔“

میزہ کے باپ نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ ”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ ماں کب بنے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب خدا چاہے گا۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اپنے عاصم کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟“

ہارون ذرا جھجکا کیونکہ اس کا چور پھلا گیا تھا۔ نرمی سے بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ یہ بات کس نے بتائی آپ کو؟“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عاصم نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی گود میں بچہ ضرور ہوتا۔“

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ ”یہ ساری شرارتیں میرے بہنوئی کی طرف سے ہو رہی ہیں اور میں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

میزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ ”ہارون! اتونے مجھ پر احسان کیے تھے۔ میں نے اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی

عشقی نامتو

بیٹی کو میں اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے لیے دہن بنی بیٹی تھی۔ اب تجھے یہ زہب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عاصم کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے۔ میں زیادہ سے زیادہ شری نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیے۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو میزہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو میزہ کو واقعی چاہتا ہے تو، تو اس کو اولاد دے، ورنہ دشمن واپس چلا جا اور عاصم کو اپنے ساتھ لیتا جا۔“

ہارون نے کہا۔ ”یہ فضول سی شرط ہے، میں میزہ کو لینے آیا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میزہ تیرے ساتھ جاسے گی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گود میں اس کا اپنا بھی بچہ ہوگا۔ تو اس وقت تک محض ہی میں رہے گا جب تک کہ عاصم کے علاوہ ایک اور بچے کا باپ نہیں بن جاتا۔“

ہارون نے کہا۔ ”تو بڑی ہی شرابا ہے۔ میں میزہ کو بڑے آگے جانے کا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”مگر جبرائے جاسکتے ہو تو ضرور ہے جاؤ ورنہ یہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔“

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تو آپ اتنی ہی بات کے لیے یہاں لائے تھے مجھے؟“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تیرے نزدیک یہ اتنی ہی بات ہے تو ہوا کرے، میں تو اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔“

ہارون نے کہا۔ ”میزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے۔ میں اس سلسلے میں پہلے میزہ سے بات کروں گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”تو میزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔“

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

میزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ میزہ اور ہارون کا بہنوئی دونوں کمرے

میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں۔ عاصم باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرکشی میں کہا۔ ”اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جاویں گی کہ وہ کچھ باتیں کہیں تو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔“

میزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا۔ ”لیکن رسول اللہؐ نے کسی کی جھجک کرنے سے منع کیا ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”لیکن میں کسی کی جھجک رہی کب رہا ہوں، میں تو اپنی بیوی کی باتیں سنتا چاہتا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”ہارون! اگر تیرا شبہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔“

ہارون نے اپنے سر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خاموش رہیے، ہماری سرگوشی کی آواز نہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔“

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن میزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میزہ! اب بات بڑا نہیں چاہیے۔ میں ہارون کا کہہ رہا تھا۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر عاصم کو میرا بیٹا بنانا ہے۔“

ہارون میزہ کے باپ کا دھڑکنا سنا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا۔ وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ جواب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں اسکی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے کان سننا نہیں چاہتے۔ میزہ کے باپ نے ہارون کو قانعانہ انداز میں دیکھا، بولا۔ ”سن میں دونوں کی باتیں، ورنہ میں تو ڈری گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پڑ جائے۔“

ہارون نے کہا۔ ”ذرا توقف سے کام لیجیے۔ ابھی دستک نہ پہنچے گا۔“

لیکن اندر دونوں کو ان کی آہٹ مل چکی تھی۔ اندر سے

دروازہ کھل گیا اور دونوں ہارون اور میزہ کے باپ کو سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

میزہ نے پوچھا، ”یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟“

ہارون نے جواب دیا، ”یہی سوال میں تجھ سے کر سکتا ہوں کہ میزہ یہ تم دونوں چوروں کی طرح اندر بند ہو کر کیسی باتیں کر رہے تھے؟“

دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے بہنوئی نے کہا، ”ہم دونوں تجھے میں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تجھے کی نہیں ہو رہی تھیں۔“

میزہ البتہ شرمندہ تھی، باپ سے بولی، ”آپ دونوں اتنی جلدی واپس آ گئے؟“

ہارون نے طنز کیا، ”ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہوگی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار کر واپس آ گئے۔“

میزہ کھسکی ہوئی تھی، بولی، ”نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔“

ہارون نے اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ سے کہا، ”آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ میں میزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لینا چاہتا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا، ”لیکن اس کا خیال رہے کہ میری بیٹی نے تیرے بہنوئی سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو قطعاً دوسے یا جواب طلب کرے۔ ہاں، وہ تجھے میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے۔“

میزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں کہا، ”تو نے یہ ابھی بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلا وجہ خشک دھجے میں ڈال دیا۔“

اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو میزہ نے خوفزدہ ہو کر کہا، ”دروازہ بند نہ کرو۔ کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟“

ہارون نے میزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا، ”تو مجھ سے خوفزدہ ہے؟“

میزہ نے جواب دیا، ”نہیں تو۔“

ہارون نے کہا، ”نہیں تو مجھ سے خوفزدہ ہے کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند کرنے میں خوف محسوس کر رہی ہے۔“

میزہ نے موضوع بدل دینا چاہا، ”ہارون! تجھے جو باتیں کرنا ہیں وہ کہہ، بے کار باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔“

ہارون نے جواب دیا، ”میزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تیار ہیں اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل

دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہیں گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

میزہ نے جواب دیا، ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہ ہمدردی پس یہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی، اس سے مطلع کر دیا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے تا دیران پر قائم نہیں رہتے دیتے۔“

ہارون نے کہا، ”اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو دوسرے کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔“

میزہ نے کہا، ”اب کام کی بات کر تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

ہارون نے پوچھا، ”کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟“

میزہ نے جواب دیا، ”مجھے لوگ متعرض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی میں اولاد سے محروم کیوں ہوں۔“

ہارون کو چاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ ہلکا سا بولا، ”پھر تو نے اس کا کیا جواب دیا؟“

میزہ نے کہا، ”میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔“

ہارون نے کہا، ”لیکن جب تو نے عامر کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے تو پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟“

میزہ نے جواب دیا، ”اپنی اولاد کی بات ہی کہہ اور ہے۔ میں اپنا بچہ چاہتی ہوں، اپنی اولاد۔“

ہارون نے مجھے لہجے میں کہا، ”میزہ! لوگوں کے ورغلا نے میں نہیں آتا چاہیے ورنہ یہ طے ہے کہ دونوں کے تعلقات میں خوشگواہی اسی وقت تک ہے جب تک کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“

میزہ نے اٹھ لیجے میں کہا، ”لیکن میں بچہ چاہتی ہوں، اپنا بچہ۔۔۔۔۔ جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔“

ہارون نے کہا، ”اگر میں انکار کر دوں تو؟“

میزہ نے جواب دیا، ”تو پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔“

ہارون ایک دم چونک پڑا، ”تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟“

میزہ نے جواب دیا، ”سچائی تلخ ہوتی ہے۔ میں اور

تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور چونکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو درد کر دوں گی۔“

ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا، ”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔“

”ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے، لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی گوارا کر لوں گی۔“

ہارون نے کہا، ”میزہ! تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کے کر کہ اگر اس کا خمیازہ جھگٹنا پڑے تو تو آسانی سے ٹھک لے۔“

میزہ نے جواب دیا، ”ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے ایک ماہ دوں گی۔ اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہیں آئے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔“

ہارون نے پوچھا، ”اگر میں تجھ کو واپس کر کے چلا جاؤں تو؟“

میزہ نے جواب دیا، ”تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کر دوں گی کہ شاید تو اپنے فیصلہ بدل دے اور میری باتیں سن کر میں عامر کو ایک سال یا دو سال عطا کر دوں۔“

ہارون نے پوچھا، ”اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟“

میزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی، ”جب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گی اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔“

ہارون نے افسوس سے کہا، ”میزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم دونوں کی روحیں محبت کے لطیف جذباتوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ کسی اور کو بھی دے سکتی ہے۔“

میزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا، ”افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش فہمی میں تھی لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں بہنے لگی۔“

میزہ نے کہا، ”میں نے تو یہ سب سنا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پا چکا تھا۔ ہارون کی سمجھ دیر کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوئی۔ بے چینی سے بولی،

”ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے فیصلے سے فوراً

عشقی نامہ

دل لک اور براہین کی جنگ چھڑی تو وہ ٹکست کھا گیا۔ اس نے بے دلی سے پوچھا،

”تو یہ تیرا بھی اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟“

میزہ نے جواب دیا، ”میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کر دوں گی۔“

ہارون نے کہا، ”لیکن میں بھی تجھے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تجھ کو کسی بچے کی ماں بنا کر عامر کی بدھنیں کو آزاد بنانا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں رہوں جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جائے، میں کسی دوسرے بچے کا باپ نہیں بنوں گا۔“

میزہ نے فوراً جذبات میں آنکھیں بند کر لیں، بولی، ”جب پھر تو اسی وقت چلا جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ۔ اگر اس عرصے میں تو نہ امدت محسوس کرنے لگے اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور اگر دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو ازراہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد ہو جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں۔“

ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ دو سال بعد اپنے فیصلے کا اپنی اسی وقت اعلان کر دے لیکن وہ میزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب وہ یہ سوچتا کہ اس کی میزہ کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف اس کا باپ اور بیکر دونوں ہی خیالوں میں اس کو معجز کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے اس کو روک رہے تھے کہ خیردار جو تو نے میزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا عامر کی بدھنیں کا آغاز ہو جائے گا۔

تیسری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر کر۔ ممکن ہے اس عرصے میں خود میزہ کو اپنی بے جا ضد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے دوبارہ رجوع ہو جائے۔

میزہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت چھیل رہی تھی۔ وہ ہارون کو متاثر دیکھ کر پُر امید ہو گئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان ہارون سے جو کچھ سننا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پا چکا تھا۔ ہارون کی سمجھ دیر کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوئی۔ بے چینی سے بولی،

”ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے فیصلے سے فوراً

ہی آگاہ کر دے۔“

ہارون نے محبت بھری نظروں سے میزہ کو دیکھا اور مسکرایا گو کہ اس کی مسکراہٹ میں یاس اور ناکامی کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو میزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے پُر سکون اور باوقار لہجے میں کہا۔ ”میزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پُر یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا پڑے تو میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔“

میزہ نے اس کی بات کاٹ دی، بے اختیار بولی۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے اور اب میں اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔“ ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں۔ میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں دو سال کے لیے تجھ سے جدا ہو جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اس امید میں گزر اوروں کہ شاید مجھ میں تبدیلی آجی ہو اور میں اس جبر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو یقیناً ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جائے اور میرے پاس چلی آئے۔“

میزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولنا۔ ”جب بچہ تو پیدا ہوگا تو اس وقت چلا جاتا ہوں۔ دو سال بعد مجھ سے ملاقات کر لیکن میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا کہ میں اولاد سے کم پر کوئی سمجھوتا کر لوں گی تو یہ تیری بھول ہوگی۔“

ہارون ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”اچھا میزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں عامر کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم کر لوں گا۔“ میزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رخصت سفر باندھ لے گا، بولی۔ ”لیکن اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ کر دیا کہ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ جب یہ فیصلہ بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں۔“

میزہ نے ہونٹ سمجھنے لیے، بولی۔ ”تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔“

ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ کے اعداد سے سمجھ لیا کہ ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پوچھا کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟

اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا۔ ”آؤ بیٹے، دمشق چلیں اپنے دادا کے پاس۔“

عامر نے مصیبت سے پوچھا۔ ”اور میری مٹی ماں..... کیا وہ نہیں چلیں گی؟“

ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبایا، بولا۔ ”ہاں بیٹے! میزہ نہیں آئے گی۔ وہ سبیل رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی سبیل رہے اور ہماری پجرجی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔“

میزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا۔ ”ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بہر حال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ میزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بہر حال یہ جو کچھ ہوا، اس میں ہاتھ تیرا ہی کارفرما ہے۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اگر یہ شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف اور انتشار میں میرا ہاتھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ تیری طرف سے میزہ اور تجھ کو ایک پیشکش ہے۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”کون سی پیشکش ہے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں نے تیرے دل میں کوئی غور نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو عامر کو میرے حوالے کر دے۔ میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا۔ اس طرح تو میزہ کی خواہش بھی پوری کر سکتے گا۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ سہارا ملے گا کہ عامر کی طرف سے بے نیاز ہو کر میزہ کو خوش رکھ سکے گا۔“

ہارون کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کر دے اور خود میزہ کے پاس چلا جائے اور اس کی خوش خبری سنا دے کہ وہ میزہ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے لیکن پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس وقت میزہ کمرے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میزہ کا باپ اور ہارون کا بہنوئی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میزہ بستر پر دوبارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

عشق نا تمام

ہارون دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتادی۔ باپ ساری روداد تو جسے سن رہا، آخر میں پوچھا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟ میں تو یہ جانتا چاہتا ہوں۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتائے کہ میں کیا کروں؟“

باپ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا عامر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

ہارون نے کہا۔ ”میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”تو نے میزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر قائم رہوں گا اس لیے جو فیصلہ کرتا ہے ابھی کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں، میں اس فیصلے کو نہیں مانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس وقتی ہنگامی اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔“

باپ نے کہا۔ ”تب پھر تو میزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں دوسری شادی کیوں کر لوں؟ اس کا فائدہ؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت اچھی طرح ہو جائے گی۔“

ہارون نے کہا۔ ”اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے گی تو اس وقت میں کیا کروں گا؟“

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ ”عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی یا عورت سے تیری اولاد نہ ہو۔“

ہارون نے کہا۔ ”افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر کسی کے پاس رہے گا؟ اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟“

باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ میزہ کو طلاق پر آمادہ کر لے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے پاس چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے میں باپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چپے چپے میں گھومتا پھرتا

رہا۔ ہارون ہفتک ڈیڑھ سال باہر گزرا۔ اس کے بعد وہ سیدھا محض بیٹیا اور میزہ کے سامنے وہ مال و زر و ہیر کر دیا جو اس نے مختلف جنگوں میں انعام و کرام اور مال غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ میزہ اس کا انتظار تو کر رہی تھی لیکن اتنی بے یقینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون کو ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب میزہ کے سامنے مال و زر کا ڈھیر لگ گیا تو اس کے باپ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے بچی کو کھم دیا۔

”ہارون! تمہکا ہوا ہوگا اس کے لیے حاصل اور آرام کا انتظام کر دے۔“

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا۔ ”عامر! تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا۔“

عامر نے سمجھتے ہوئے نہایت تکلف سے میزہ کو سلام کیا۔ میزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”تو ٹھیک تھا کہ تو ہے؟“

عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ ”بالکل ٹھیک ہوں ماں۔“ ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”میزہ، میرا بہنوئی کہاں چلا گیا؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اس نے دوسری شادی کر لی۔“

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ ”میزہ! تو نے بہت بڑی خوش خبری سنائی ورنہ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوئیں ان میں میرے بہنوئی کا بڑا ہاتھ تھا۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔“

ہارون نے کہا۔ ”خوب..... تو اس نے ابھی پچھا نہیں چھوڑا؟“

میزہ نے پوچھا۔ ”تو دمشق کیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا۔ سیدھا تیرے پاس آیا ہوں۔ اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔“

میزہ نے کہا۔ ”ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو

دشمن لے کر چلا جاؤں گا۔“

مینزہ نے کہا۔ ”لیکن میں اس وقت تک حیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔“

بارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ ”مینزہ! کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے کلاب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”اے تو بار بار بہنوئی کا ذکر کچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو کبھی جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“

مینزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹپک گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ بارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو کبھی اندر رکھ دیجیے۔“

مینزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ بارون کے آنے کی خبر سن کر پاس چڑوں کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ بارون کو دیکھتے ہی غر بڑ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ ”بارون تو..... کب آیا.....؟“ اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ ”اور عامر تو کیا ہے؟“

عامر نے بھی کچھ سگڑا ہوا جواب دیا۔ ”اچھا وہاں مینزہ اٹھ کر جائے گی، بارون نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ مینزہ نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔“

بارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ ”تم نے شادی کر لی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟“

بارون نے کہا۔ ”یہ اچھا کیا۔“

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ ”ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ لکوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔“

بارون نے ٹھٹھا کر جواب دیا۔ ”ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مینزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔“

بارون نے کہا۔ ”ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔“

بہنوئی نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تو مینزہ کی دلی ہوئی مدت سے پہلے ہی آگیا ہے؟“

بارون نے جواب دیا۔ ”بھائی، میں مینزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے نا انصافی بھی نہیں برداشت کر سکتا اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟“

بہنوئی نے کہا۔ ”تو مینزہ کی خواہش پوری کرو۔ کیونکہ میں نے اس دوران ہر طرح ٹھول کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے، اس سے دستبردار نہیں ہوسکتی۔“

بارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔ ”بھائی، اگر میں مینزہ کی خواہش پوری کر دوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظر انداز نہیں کر دے گی؟“

بہنوئی نے ذہن پر ذرا سازوروں سے جواب دیا۔ ”اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے میں یہ مشورہ بھی نہ دیتا کہ تو مینزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور مینزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے۔“

اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں بہلایا جاسکتا۔ اس لیے میر مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے۔ وہ کیا عامر تو اس کو کبھی بے یاس چھوڑ دے۔ میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں محسوس ہونے دوں گا۔“

بارون نے کئی قدمیں پیش کر کے کہا۔ ”بھائی، پہلے مجھے خود کر لیتے دو، وہ اس کے بعد کوئی فیصلہ کر دے گی۔“

بارون نے اپنے بہنوئی کی جی بھائی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک بارون نے مینزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی رہیں اور بارون انہیں اڑاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دل جوئی شروع کر دی اور اس کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ عامر بھی اپنے پھوپھو یا میں خلوص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مینزہ کو اپنی طرف سے کچھ کھینچا محسوس کیا تو پھر مینزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔

مینزہ نے چوتھے دن بارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔ ”بارون! میں مستقل بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟“

بارون بہت خوش تھا۔ مسکراتا ہوا مینزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھے کو اپنے ساتھ لے کر دمشق چلا جاؤں گا اور خراسان واپس جانے کے منصوبہ کو ذہن سے نکال دوں گا۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں دمشق اس وقت

عشقی نامیامہ

نہیں جاؤں گی جب تک میں اولاد والی نہ ہو جاؤں۔“

بارون نے کہا۔ ”اگر میں تیری خواہش پوری کر دوں تو تو یہ بتا کہ عامر کا کیا ہے گا، وہ کہاں رہے گا؟“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”بارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے بچے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی۔ میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے اور ہمیشہ ہی سمجھتی رہوں گی۔ تجھ کو اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔“

بارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ جب میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس بچے پر کچھ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر حیرے ہی پاس رہے گا اور یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔“

یہ خبر مینزہ کے باپ کو بھی مل گئی، اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب بارون کی اس گھر میں جو قدر منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نہیں مل سکتی تھی۔ مینزہ کے قہقہے اور شونیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ مینزہ کا باپ بارون کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ بارون کا بہنوئی بھی بہت خوش تھا۔ ہاں اگر ان سب میں کوئی ریبیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مینزہ بارون کو دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کی کو محسوس کر رہا تھا لیکن خود بارون اس سے بے خبر تھا۔ بارون کا بہنوئی بھی عامر کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی کبھی دے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ ”بیٹے عامر! تیرا باپ تجھے سے جھگڑ گیا لیکن تو ذرا بھی فکر نہ کر میں جو موجود ہوں۔“

عامر کہا۔ ”لیکن پھوپھو جان، میری جی ماں مینزہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ یہ اب اس کو کیا ہو گیا ہے؟“

پھوپھو کا جواب دیتا۔ ”ہاں، پہلے وہ بھی سے پیار کرتی تھی مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے بچے کے لیے جو ہونے عدم میں ہے مگر آنے کے لیے بازو ہلا رہا ہے۔“

پھوپھو یا سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھوپھو کی باتیں عامر کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

کئی ماہ محسوس میں رہنے کے بعد بارون اور مینزہ نے

دشمن لے کر چلا جاؤں گا۔“

مینزہ نے کہا۔ ”لیکن میں اس وقت تک حیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔“

بارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ ”مینزہ! کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے کلاب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”اے تو بار بار بہنوئی کا ذکر کچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو کبھی جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“

مینزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹپک گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ بارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو کبھی اندر رکھ دیجیے۔“

مینزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ بارون کے آنے کی خبر سن کر پاس چڑوں کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ بارون کو دیکھتے ہی غر بڑ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ ”بارون تو..... کب آیا.....؟“ اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ ”اور عامر تو کیا ہے؟“

عامر نے بھی کچھ سگڑا ہوا جواب دیا۔ ”اچھا وہاں مینزہ اٹھ کر جائے گی، بارون نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ مینزہ نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔“

بارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ ”تم نے شادی کر لی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟“

بارون نے کہا۔ ”یہ اچھا کیا۔“

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ ”ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ لکوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔“

بارون نے ٹھٹھا کر جواب دیا۔ ”ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مینزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔“

بارون نے کہا۔ ”ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔“

دشمن لے کر چلا جاؤں گا۔“

مینزہ نے کہا۔ ”لیکن میں اس وقت تک حیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔“

بارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ ”مینزہ! کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے کلاب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”اے تو بار بار بہنوئی کا ذکر کچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو کبھی جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“

مینزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹپک گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ بارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو کبھی اندر رکھ دیجیے۔“

مینزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ بارون کے آنے کی خبر سن کر پاس چڑوں کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ بارون کو دیکھتے ہی غر بڑ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ ”بارون تو..... کب آیا.....؟“ اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ ”اور عامر تو کیا ہے؟“

عامر نے بھی کچھ سگڑا ہوا جواب دیا۔ ”اچھا وہاں مینزہ اٹھ کر جائے گی، بارون نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ مینزہ نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔“

بارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ ”تم نے شادی کر لی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟“

بارون نے کہا۔ ”یہ اچھا کیا۔“

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ ”ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ لکوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔“

بارون نے ٹھٹھا کر جواب دیا۔ ”ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مینزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔“

بارون نے کہا۔ ”ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں اس وقت تک حیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔“

بارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ ”مینزہ! کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے کلاب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”اے تو بار بار بہنوئی کا ذکر کچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو کبھی جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“

مینزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹپک گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ بارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو کبھی اندر رکھ دیجیے۔“

مینزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ بارون کے آنے کی خبر سن کر پاس چڑوں کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ بارون کو دیکھتے ہی غر بڑ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ ”بارون تو..... کب آیا.....؟“ اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ ”اور عامر تو کیا ہے؟“

عامر نے بھی کچھ سگڑا ہوا جواب دیا۔ ”اچھا وہاں مینزہ اٹھ کر جائے گی، بارون نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ مینزہ نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔“

بارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ ”تم نے شادی کر لی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟“

بارون نے کہا۔ ”یہ اچھا کیا۔“

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ ”ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ لکوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔“

بارون نے ٹھٹھا کر جواب دیا۔ ”ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مینزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔“

بارون نے کہا۔ ”ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔“

عامر حصّے میں رہا تو اس کے ننھے سے دل پر یہ اثر ہوگا کہ ہم دونوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور یہیں سے اس میں احساسِ محرومی پیدا ہو جائے گا۔“

منیزہ نے کہا: ”اتنی گہرائیوں میں مت جاہاروں۔ میرا یہ کہنا مان لے۔ عامر کو اپنے بہنوئی کے باسی جھوڑ جا۔ میرا خیال ہے تیرا بہنوئی عامر کو اتنا خوش رکھے گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔“

عاصر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور
میزہ اسے چھوڑ کر دمشق چلے جائیں گے۔ چھوپانے بڑی
تسلیاں دیں لیکن عاصر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف
بارون بھی عاصر کی محسوس کردہ بات کا مزید ہلے نہ سکی دی اور
سمجھا یا کہ عاصر کو بھی یہی تنہا چھوڑ کر اس میں خود اکتا دی پیدا
ہونے کا موقع دو۔ بارون کو غم کے ساتھ ہی یہ خوف بھی
محسوس ہوا ہا تھا کہ اس کا باپ --- اس کی اس حرکت پر
خوب خوب لعن طعن کرے گا۔



چاہیے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔“
باپ نے ہلکا کر پوچھا۔ ”یعنی..... یعنی کیا مطلب؟“

بارون نے میزہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر مسکراہٹ موجود تھی مگر باپ سے کہا۔ ”مطلب یہ کہ میں میزہ کو ناخوش نہیں رکھ سکتا۔ وہ جن کی عمریں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کو صحیح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں میزہ کو اولاد سے محروم نہیں کر سکتا۔“
باپ نے بارون کی باتیں بڑے عمل سے سنیں اور کسی قدر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔“
بارون نے کہا۔ ”میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا بلکہ فیصلوں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔“
باپ نے ان دونوں میں دوپٹی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب بارون اور میزہ کا بیشتر وقت ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ ان کی محنتیں ایک دم جوان ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور بدایات کی غائبی محض ان کی عقل اور ذہن کی بارش تھی اور آزادی کے نئے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق میں رہے پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ بارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمہ داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں۔ بارون جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں بارون کا باپ تنہا رہتا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور چہل پہل سے بھرپور دونوں کو یاد کرتا رہتا جب اس گھر میں بارون کی پہلی بیوی، عامر، بارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے، انہی میں میزہ بھی یاد آتی لیکن میزہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ بارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا۔ میزہ سے سوچ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے سے بدلہ لے لیا۔

ایک سال بعد میزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ بارون لڑکے کا نام عامر کے وزن پر رکھنا چاہتا تھا لیکن میزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ میزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔

ابراہیم کی ولادت کی خبر جب بارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور بارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تنہائی دور ہو جائے لیکن عامر کو اس کے پھوپھو نے بھیجے سے انکار کر دیا۔

بارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا لیکن اب اسے موصل کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جزیرہ اور اس کے مضافات میں بھیج دیا گیا۔ بارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور حمص کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بہوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور میزہ کی عدم توجہی کو گھمبیر نہیں ہونے دیا مگر دونوں کسی طرح عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جاسکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

بارون اپنی بیوی کو خطوں میں بھی لکھتا رہتا تھا کہ ابراہیم کی موجودگی میں میزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی انہی خیالات کے تحت اس کا بچہ ہو گا۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا، وہی عامر کے لیے بھیجتا لیکن میزہ اسے بھی رکھ لیتی اور عامر کو اس کی ہوائ تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی سوچنے لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے محروم رکھا گیا۔ اس کا یہ اندازہ فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا تھا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ بارون، ابراہیم کا تنہا ذکر کبھی نہیں کرتا، اس کے ساتھ عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اب حمص میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عامر جب تک حمص میں رہے گا، بارون اس کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ بارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور بارون کے بہنوئی کو ترک سکونت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دوسری طرف بارون کا بہنوئی میزہ کے حسد کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ میزہ، عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، بارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور عامر پر نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ میزہ کو جلا کر ایک قسم کی لذت حاصل کر رہا تھا۔

ایک دن جب وہ حمص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے سے پہلے اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹی سنبھالے میزہ کے باپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔ میزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص کو عزت و احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کروایا۔

”میں بارون کا بہنوئی ہوں۔ اگر بارون کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔“
اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوٹی اس کے حوالے کر دی۔ ”یہ بارون نے بھجوائی ہے، اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی۔ اس کے علاوہ کچھ بے بھی ہیں۔“
اس نے پوٹی لے لی اور بارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں میزہ کو لکھا گیا تھا۔

”صبح کی فتح کی طرح گنار اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے والی تیرے کی طرح حسین میزہ! میں عنقریب واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی خارجی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ دو دن پہلے میں ایک خارجی کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ رات کو خارجیوں نے سویرے ہی شہر میں خون بار دیا۔ ان کے اچانک اور خوف ناک حملے سے میں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ خارجی ہمیں بے دردی سے قتل کرتے رہے۔ ہمارے خیموں کی طنائیں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے چھوٹے دیکھے۔ زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامت صفائی برپا کر رکھی تھی۔ جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، خارجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس بکھڑے دارو گیر میں معلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مردوں کی طرح لٹ گیا۔ خارجیوں نے مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ غلج اور جوش میں میرے پاس سے گزرتے رہے لیکن مجھ پر شبہ نہیں کیا۔ ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور پکھلتا ہوا نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پروا کیے بغیر مردے کی طرح ہزار ہا میں نے اپنے آس پاس پلٹے ہوئے زخمیوں کی لپٹیں محسوس کیں مگر اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے خارجی چائے چائے ہیں اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بچتا بچتا چھپتا چھپتا موصل

پہنچا اور خارجیوں کے خوف ناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔“
میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نوازا دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے زبردقت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“
میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد یکلوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔“
مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند رسمی نگو سے بھیج رہا ہوں ان میں دو خطے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سیکر روائی کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سیکر کبھی ملی؟

پہنچا اور خارجیوں کے خوف ناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔“
میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نوازا دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے زبردقت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“
میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد یکلوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔“
مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند رسمی نگو سے بھیج رہا ہوں ان میں دو خطے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سیکر روائی کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سیکر کبھی ملی؟

میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نوازا دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے زبردقت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“
میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد یکلوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔“
مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند رسمی نگو سے بھیج رہا ہوں ان میں دو خطے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سیکر روائی کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سیکر کبھی ملی؟

میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نوازا دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے زبردقت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“
میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد یکلوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔“
مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند رسمی نگو سے بھیج رہا ہوں ان میں دو خطے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سیکر روائی کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سیکر کبھی ملی؟

ظاہر ہونے دیا کہ اس نے بارون کا خط پڑھ لیا ہے۔ منیزہ خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، بیہوشی نے پوچھا۔

”کیا کوئی خاص بات ہوئی؟“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، بارون بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے بچ گیا ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”اور کچھ؟“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ کہ بارون کا باپ دمشق میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو عاقر کو ساتھ لے کر فوراً دمشق چلا گیا کیونکہ یہ میری نہیں بارون کی خواہش ہے۔“

وہ منیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ ”اور کچھ؟“

منیزہ نے ہل کر جواب دیا۔ ”اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

وہ بڑی دیر تک منیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید ریشمی پارچے عاقر کے حوالے کر دیے جائیں لیکن منیزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عاقر بھی یہ خبر سن کر وہیں آکر بیٹھ گیا تھا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے لیکن منیزہ نے اس کی موجودگی کا بالکل نظر انداز کر دیا اور کئی گھنٹوں تک سے دیکھتا گوارا نہ دیا۔ اس کے عاقر کو جانے کے لیے یہ اصرار کرے گا کہ اس کو اس کو بھیجے بیٹھ کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”ابراہیم! تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بھیجے بیٹھ کر تیرے باپ کی طرف سے پیار کروں۔“

بیہوشی نے عاقر کی طرف دیکھا جو کھوپا کھویا، مگر یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ بیہوشی نے پوچھا۔

”کیا بارون نے عاقر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا؟“

منیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور عاقر کے پھوپھو کو جواب دیا۔ ”نہیں، عاقر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عاقر کا کیا مقابلہ۔ عاقر بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہے۔ چنانچہ میرا شیر خوار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے، عاقر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔“

بیہوشی نے جواب دیا۔ ”منیزہ! تیرا انداز فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر میں چھوٹے بڑے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ بارون عاقر سے بھی بڑی محبت کرتا ہے اور اس نے اپنے خط میں عاقر کی بابت کچھ نہیں لکھا تو حیرت ہے۔“

منیزہ نے ہر امان کر کہا۔ ”میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے سے نہیں کہہ پاری ہوں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔“

بیہوشی نے جواب دیا۔ ”تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے تو منافقت سے بچنا چاہیے۔“

منیزہ نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ رہا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو نے اور تیرے باپ نے مجھ کو یہاں روک رکھا ہے۔“

منیزہ نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو غلط سوچ رہا ہے۔ اب تجھ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک عرصے سے شب تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی اس لیے میں نے عاقر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عاقر میرے ساتھ ہے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

منیزہ نے کہا۔ ”عاقر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی۔ تو یہاں سے چلا جا۔“

بیہوشی نے عاقر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس کو تو اپنے پاس رکھ لے؟“ عاقر کو اس نے کہا۔ ”میں تو عاقر کو کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں اور میں خود بھی عاقر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ بارون کے آنے کی دیر ہے پھر میں عاقر کو جبرا اپنے پاس رکھ لوں گی۔“

بیہوشی نے اکڑ کر کہا۔ ”ہاں، صرف اس صورت میں کہ خود عاقر بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“

منیزہ نے تن کر کہا۔ ”میں عاقر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔“

بیہوشی ہنس دیا، بولا۔ ”بے شک، بے شک مجھ کو یقین ہے جو عورت عاقر کی سلیپر کی غائب کر دے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ وہاں ہی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔“

منیزہ دنگ رہ گئی، کت گئی مگر گرم ہو کر بولی۔

”بداخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اس لیے سلیپر پارچوں کو باہر کیچھڑی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو میرے خطوط پڑھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا۔“

بیہوشی نے کہا۔ ”اب فضول باتیں نہ کر جب تیری

چوری چھپی گئی تو تو اس قسم کی مٹی مٹی باتیں کرنے لگی۔“

منیزہ نے عاقر سے پوچھا۔ ”عاقر! بچ بچتا تو اس کے پاس رہتا گوارا کرے گا؟ میرے پاس یا اپنے پھوپھو کے پاس؟“

عاقر نے کسی پس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ ”پھوپھو کے پاس۔“

منیزہ نے غصے میں جھنجھاکر پوچھا۔ ”یعنی میرے پاس نہیں؟“

عاقر نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ کے پاس نہیں۔“

منیزہ غصے میں کھڑی ہوئی، بولی۔ ”کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی جواب تک تجھ کو اپنا پیتا سمجھتی رہی۔“

عاقر نے جواب دیا۔ ”آپ نے بھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حد کرنا شروع کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے۔“

پھوپھو کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھا نے جاری تھی اگر عاقر نہ ہوتا تو بارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ منیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بارون کا بیہوشی اور عاقر کو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

منیزہ نے عاقر کو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس کو تو اپنے پاس رکھ لے؟“ عاقر کو اس نے کہا۔ ”میں تو عاقر کو کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں اور میں خود بھی عاقر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ بارون کے آنے کی دیر ہے پھر میں عاقر کو جبرا اپنے پاس رکھ لوں گی۔“

بیہوشی نے اکڑ کر کہا۔ ”ہاں، صرف اس صورت میں کہ خود عاقر بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“

منیزہ نے تن کر کہا۔ ”میں عاقر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔“

بیہوشی ہنس دیا، بولا۔ ”بے شک، بے شک مجھ کو یقین ہے جو عورت عاقر کی سلیپر کی غائب کر دے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ وہاں ہی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔“

منیزہ دنگ رہ گئی، کت گئی مگر گرم ہو کر بولی۔

”بداخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اس لیے سلیپر پارچوں کو باہر کیچھڑی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو میرے خطوط پڑھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا۔“

بیہوشی نے کہا۔ ”اب فضول باتیں نہ کر جب تیری

چوری چھپی گئی تو تو اس قسم کی مٹی مٹی باتیں کرنے لگی۔“

منیزہ نے عاقر سے پوچھا۔ ”عاقر! بچ بچتا تو اس کے پاس رہتا گوارا کرے گا؟ میرے پاس یا اپنے پھوپھو کے پاس؟“

عاقر نے کسی پس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ ”پھوپھو کے پاس۔“

منیزہ نے غصے میں جھنجھاکر پوچھا۔ ”یعنی میرے پاس نہیں؟“

عاقر نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ کے پاس نہیں۔“

منیزہ غصے میں کھڑی ہوئی، بولی۔ ”کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی جواب تک تجھ کو اپنا پیتا سمجھتی رہی۔“

عاقر نے جواب دیا۔ ”آپ نے بھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حد کرنا شروع کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے۔“

پھوپھو کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھا نے جاری تھی اگر عاقر نہ ہوتا تو بارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ منیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بارون کا بیہوشی اور عاقر کو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

عاقر نے جواب دیا۔ ”مجھ کو ان کا یوں خیال آ گیا کہ انہوں نے میرے باپ کو مارتے مارتے چھوڑ دیا اور میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی تعریف کی ہے۔“

پھوپھو معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اچھل سا پڑا، بولا۔ ”بیٹے عاقر خارجیوں کی بات بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایمان دار اور بہادر لوگ ہیں۔ اس روئے زمین پر اپنا خیال نہیں رکھتے۔“

عاقر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں؟ آپ تو ان کی تعریف کر رہے ہیں۔“

پھوپھو نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ان کی تعریف کر رہا ہوں اور اس لیے کہ رہا ہوں کہ وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ تیرے باپ نے بھی اپنے خط میں ان کی بڑی تعریف کی ہیں۔“

عاقر نے پوچھا۔ ”اگر وہ اتنے ہی ایسے ہیں تو حکومت ان سے جنگ کیوں کرتی ہے؟ میرا باپ ان کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھاتا ہے؟“

پھوپھو نے جواب دیا۔ ”ان میں کچھ برائیاں بھی ہیں، بس ان برائیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔“

عاقر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ ”برائیاں کہاں ہیں تو میں، اس میں میں نے کچھ جگہ کے یوں نہیں لڑی جاتی؟“

پھوپھو نے فاتحانہ شان سے کہا۔ ”تو ان باتوں پر مت غور کر دمشق چلنے کی تیاری کر۔ ہم دونوں دمشق چل کر تیرے دادا کی حصار داری کرتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو منیزہ بھیج جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر قبضہ چلے گی۔“

لیکن عاقر کو مال و زر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بولا۔ ”میں دمشق کے لیے چل سکتا ہوں کہ وہاں میرا لڑا ہوا پیار ہے، اس کی حصار داری کروں گا لیکن مال و زر کی ہوس لے کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔“

پھوپھو نے کہا۔ ”کسی طرح چل تو سکی۔ مال و زر کی ہوس نہ کر مگر اس مال و زر کو غلط فہم کے پاس بھی مت جانے دے۔“

پھوپھو نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لیا۔ جب یہ تینوں بالکل تیار ہو گئے تو اس نے منیزہ کو مطلع کر دیا، بولا۔ ”منیزہ! تو خوش ہو جا۔ تیری مرضی پوری کیے دے رہا ہوں۔“

منیزہ نے پوچھا۔ ”میری مرضی؟ کون سی مرضی پوری کر رہا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”منیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

کہ اب یہاں نہ رہوں، میں دمشق جا رہا ہوں۔۔۔۔۔“

منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”اور عامر۔۔۔۔۔ یہ عامر کہاں رہے گا؟ کس کے پاس رہے گا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ عامر میرے پاس نہیں رہنا چاہتا، وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔“

منیزہ نے کہا۔ ”تم دونوں نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تم لوگ چلو، چند دنوں بعد میں بھی ملنے رہے ہوں۔“

چنانچہ دونوں بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو منیزہ سے جدا کی کافی لمبی ملاں نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے۔ فضا ابراہیم لودھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پر کیف ہوا کی جسم میں سرور کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ لگا یا کہ یہ پریشان حال پر دیکھی کسی مقصد سے دمشق آئے ہیں۔ یہ تینوں پرتوجہ راستوں کو عبور کرتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا بڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ یہ تینوں اندر داخل ہوئے تو قریب المرگ بوڑھے کے آس پاس چند بڑبیوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

باروں نے بہنوئی کے جواب دیا۔ ”ہم ہاں سے آئے ہیں۔“

دادا دادا ہوں۔ ”پھر عامر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ لڑکا اس بوڑھے کا پوتا ہے۔“

بڑبی اور ادھر ادھر کھٹکے گئے۔ عامر اپنے دادا پر جھک گیا اور بڑبی محبت سے کہا۔ ”دادا جان! میں عامر آ گیا۔ اب آپ کیسے ہیں؟“

دادا نے پچھنی پچھنی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا، شاید پہچان نہ سکا۔

عامر نے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی ان کے سینے اور چہرے پر جھک گیا اور بولا۔ ”دادا جان! مجھے آپ نے بلا لیا تھا۔ میں عامر آپ کا پوتا ہوں۔“

دادا نے بشکل کہا۔ ”باروں۔۔۔۔۔ کیا تو باروں ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں باروں نہیں، میں باروں کا بیٹا عامر ہوں۔“

دادا کی جاتی ہوئی سانس واپس آ گئی۔ ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کی طرف دیکھا اور بہنوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو تو ہے باروں۔۔۔۔۔ تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟“

عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”دادا جان! یہ بھوپا جان ہیں۔ میرا باپ اور آپ کا بیٹا باروں آنے ہی والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“

دادا کو رون آ گیا۔ ”مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر! میرے سینے سے لگ جاتا کہ میں برسوں کے تنہا اور اس دل کو سکون پہنچا لوں۔ سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، تنہا چھوڑ دیا۔“

عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے پوچھنے سے دادا کی سانس میں غور پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔ عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس کے پاؤں داسے لگا۔

دادا کو کسی لمحے ہوش آ جاتا لیکن یہ ہوش بھی مدھوشی سے کم نہیں تھا۔ مال و زر کا اس دنیا میں جو مقام ہے پورے حاضر مدھوشی میں بھی اس کی قدر و قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔ دادا کی سانس کئی بار کھڑکھڑکواہٹیں آئیں اور ہر بار یہی شبہ گزرا کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوں گے لیکن بڑے سہماں نے تو باتوں تک سے توانائی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کوشش میں مشغول تھے کہ ان کی ناسازی طبع کا خاص اثر نہ لیا جائے لیکن وہ معقرب ادھر ادھر ہو جانے والے تھے۔

شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر سے بگڑی اور ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگے۔

عامر نے کہا۔ ”دادا جان! ہوش میں آئیے، پریشان مت ہوئے۔“

لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔ انہوں نے نہ تو کسی کی باتیں سنیں اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔ عامر اور اس کا بھوپا بوڑھے کے پاس بیٹھے اس کے انجام کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدھوشی میں بار بار باروں کا نام لے رہا تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

”باروں! اتونے عامر پر ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے۔“

عامر کے دل پر آ رہے چل رہے تھے۔ دادا نے پچھنی پچھنی آنکھوں سے غلامی گھورا اور مرحوم بیٹی کو آوازیں دیتے ہوئے ڈوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز دی۔ ”دادا جان! ہوش میں آئیے۔“

انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکے والی نظروں سے عامر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! میں ہوں عامر آپ کا پوتا۔“

مجھے پہچاننے کی کوشش کیجیے۔“

لیکن دادا نہیں پہچان سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے تزع کے عالم میں کہا۔ ”میرے پاس جو کچھ ہے عامر کا ہے۔ عامر کو بلاؤ تاکہ میں یہ سب اس کے حوالے کر دوں۔“

دادا نے سر کو آواز دی۔ ”جناب! یہ عامر آپ کے پاس ہی موجود ہے۔ پہچانے تو۔“

لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا کے پانچویں پاؤں پر جھک گیا، انہیں کئی بو سے دیے اور اپنے بھوپا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی کی تیاریاں کرنے لگا لیکن تدفین سے پہلے ہی باروں اور منیزہ بھی پہنچ گئے۔

باروں باپ کی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیزہ نے سکھ کا سانس لیا کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ چکا تھا۔

تمام رسوم سے فارغ ہونے کے بعد باروں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق میں نہیں رہے گا اور سامان اور مال و زر کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہمیشہ کے لیے حصہ چلا جائے گا لیکن بہنوئی نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔

”باروں! یہ مکان نہیں بیکے گا اور گھر میں جو کچھ بھی ہے میرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق عامر کا ہے۔“

باروں اپنے بہنوئی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیزہ بھی اس کے پاس ہی کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ باروں نے پوچھا۔ ”میرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی عامر کا ہے، اس کا مطلب؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں نے مرنے سے چند لمحے پہلے خود بتا دیا ہے کہ مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی ہر شے عامر کی ہے۔“

منیزہ نے کہا۔ ”جب تک ہم میں باروں موجود ہے باروں کے مرحوم باپ کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابراہیم بھی تو مرحوم کا پوتا ہے۔“

لیکن باروں نے منیزہ کو سمجھایا۔ ”منیزہ! مجھ کو نہیں اچھا چاہیے میں خود بات کر لوں گا۔“

بہنوئی نے باروں کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ ”باروں! تو اس معاملے میں خاموشی اختیار کر۔ جیسا میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح رہنے دے کیونکہ آئندہ اختلافات کی خلیج وسیع تو ہو جائے گی مگر بچے کی نہیں، اس لیے عامر کو جو کچھ مل رہا

عشق نا اتمام

ہے، اس کے پاس ہی رہنے دے۔“

لیکن باروں نے اس کی بات نہیں مانی۔ ”بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ عامر میرا بیٹا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمام چیزیں میرے قبضے میں رہیں گی اور عامر کو ان پر پورے ہی تصرف حاصل رہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔“

بہنوئی نے افسوس ناک لہجے میں پوچھا۔ ”تو کیا تو عامر کو ان چیزوں اور مکان سے محروم کر دے گا؟“

باروں نے جواب دیا۔ ”میں مکان بیچ دوں گا اور سارا مال و زر لے کر حصہ چلا جاؤں گا۔ عامر اگر میرے پاس رہا تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔“

بہنوئی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں نفرتیں جمع ہو رہی تھیں۔ ماں کے خلاف، باپ کے خلاف اور دنیا کے خلاف۔

چند دنوں بعد مکان بھی بیک گیا اور سارا سامان سیٹ کر باروں حصہ روانہ ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا بھوپا بھی تھا۔ منیزہ بہت خوش تھی۔ اب اس کی جیت ہی جیت تھی۔ حصہ میں داخل ہوتے ہی منیزہ نے باروں کو سمجھایا۔

”باروں! اگر تو یہ جانتا ہے کہ یہ مختصر سا کثیر خوش و غم اور نہال رہے تو تو اپنے بہنوئی کو یہاں سے چلا کر دے۔“

باروں نے دونوں کو جواب دیا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

منیزہ نے پوچھا۔ ”تیری بہن پر پکلی ہے۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اب تیرا اس شخص سے رشتہ ہی کہاں رہا۔“

باروں نے جواب دیا۔ ”منیزہ! بات اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا بہنوئی تھا اور ہمیشہ، جب تک زندہ ہے میرا بہنوئی ہی رہے گا۔ اس نے میرے عامر کو بڑی محبت سے رکھا ہے۔“

منیزہ نے کہا۔ ”تو اس کو یہاں سے چلا کر دے۔ عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی کیونکہ لوگ باتیں بناتے ہیں اور اب میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی۔“

باروں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں بہنوئی سے اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ نہیں میرے پاس ہی رہے گا اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا۔“

منیزہ لا جواب ہو کر خاموش ہو گئی لیکن اس کے تئیر بتا رہے تھے کہ وہ مایوس نہیں ہوئی۔

☆☆☆

باروں حصہ میں کئی بار آیا اور گیا لیکن ابھی تک اس

TSP Watermark Image - www.watermark-image.com - Unregistered Version

نے محض کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تو تفریحات کی سوجھی۔ وہ میزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے لگا تو عامر کا خیال آگیا۔ میزہ سے کہا۔

”میزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟“

لیکن میزہ نے مخالفت کی، بولی۔ ”عامر اب بچہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کہاں جائے گا۔ ابراہیم تو بچہ ہے۔ گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔“

بارون چپ ہو گیا لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آگیا اور پوچھا۔ ”ختم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں بارون کو محض کا خاص خاص چیزیں دکھانا چاہتی ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”میزہ! میں تجھ سے کوئی بات نہیں کروں گا، ہاں بارون سے البتہ یہ کہنا ہے کہ اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا۔“

عامر بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ بارون نے عامر کو دیکھنا چاہا لیکن بہنوئی کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکا، بولا۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، عامر بھی چلے میرے ساتھ۔“

لیکن میزہ نے اسے اس بات پر اصرار کیا کہ اس کی جانی ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم گھوم پھر آؤ، بعد میں، میں چلی جاؤں گی۔“

بارون کو بھی غصہ آگیا، بولا۔ ”یہ کیا بات ہوئی میزہ؟ کیا تو عامر سے حسد کرتی ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں حسد نہیں کرتی لیکن اگر لوگوں نے چاہا تو حسد بھی کرنے لگوں گی۔“

لیکن بہنوئی نے بڑبڑا کر کہا۔ ”بارون! تو نے میزہ کو بڑے اختیار دے دیے ہیں۔ میں اس عورت کے منہ پر کھتا ہوں کہ یہ عامر سے جلتی ہے، حسد کرتی ہے۔ میں خدا کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان دونوں کے معاملے میں فریق نہ بن ورنہ پچھتاے گا۔“

بارون نے میزہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”تو حیرا کیا خیال ہے میزہ، عامر کو ساتھ کیوں نہ لے لیا جائے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جاؤں گی تو عامر کو شوق سے لے جا۔“

بارون نے میزہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میزہ! تو بھی ساتھ چل خند نہ کر، آخر عامر بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔“

میزہ نے چل کر جواب دیا۔ ”میں یہ سب کہتی ہوں

کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ عامر ہی تیرا بیٹا ہے۔“ بارون نے یہی محسوس کرنے لگا۔

بہنوئی نے پلٹ کر عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”میرے بچے! تو میرا کہتا تھا کہ میں دے۔ تجھے پھر کسی دن گھما پھر لالوں گا۔“

بارون نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں، اس دن میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا تو فکر نہ کر پھر کسی دن سہی۔“ اس کے بعد بارون، میزہ اور ابراہیم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

بارون میزہ کی گھر میں تھا۔

بہنوئی عامر کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہو جانے کے بعد بہنوئی نے عامر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ رو رہا تھا۔ پوچھنے پر عامر نے جواب دیا۔ ”چھو یا جان! اس عورت نے مجھ سے میرے باوا جان کو چھین لیا ہے۔“

پوچھنے پر جواب دیا۔ ”تو فکر نہ کر عامر، میں اس عورت سے تیرے باوا کو چھین لوں گا۔“

میزہ، بارون کو خوب خوب گھما پی پھراتی رہی۔ اس نے شہر کے وسط میں بوجا کے کلیسا کی سیر کروائی۔ اس کا نصف حصہ مسجد تھا اور نصف کلیسا۔ مسجد کے دروازے پر ایک پتلا کھڑا تھا۔ ایک بلند دالا ستون پر کسی آدمی کی مورتی چوٹی کے نیچے چھری ہوئی تھی۔ وہی کے قدموں میں چھو کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس جگہ پر میزہ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بارون! اس بت کے قدموں سے مٹی اٹھا کر اس کے جسم پر مل دے کیونکہ اس سے تو ہمیشہ کے لیے بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جائے گا۔“

بارون نے جواب دیا۔ ”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ یہ مورتی نہیں ایک طلسم ہے اور اس کے قدموں میں مٹی ڈالنے والا ہمیشہ بچھو کے زہر سے محفوظ رہتا ہے۔“

بارون اور میزہ نے ایک ساتھ مورتی کے قدموں کی خاک اٹھا کر مورتی کے قدموں پر ڈال دی۔ اس کے بعد میزہ نے ننھے ابراہیم کی منہ زبیدی کھول کر اس پر تھوڑی سی خاک رکھ دی اور بارون نے یہ خاک مورتی کے پاؤں پر ڈال دی۔ اب وہ دونوں بہت خوش تھے۔ بارون کو اس موقع پر عامر یاد آگیا، بولا۔ ”افسوس کہ عامر ہمارے ساتھ نہیں ورنہ وہ بھی مورتی کے قدموں میں خاک ڈال کر بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جاتا۔“

میزہ نے غمی سے کہا۔ ”بارون! تو ہر جگہ عامر کا نام مت لیا کر۔ عامر کو اس کا پوچھا پڑے ناز و نعم سے پال رہا

ہے۔ اب اس پر تو نے بھی توجہ دی تو وہ بے جالا ڈیپار میں بگڑ جائے گا۔“

ابھی میزہ کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ بارون کا بہنوئی عامر کو لے کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ بارون نے جوش مسرت سے کہا۔ ”واہ تو آگیا عامر! اس وقت تو میں جو بھی دعا مانگتا پوری ہوتی۔ میں تجھ کو یاد ہی کر رہا تھا۔“

میزہ کو بارون کے بہنوئی پر بڑا غصہ آیا، بولی۔ ”تو بہت شری انسان نظر آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت لے آتا تو حیرا کیا بگڑ جاتا۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں کسی اور وقت کیوں لاتا، تم دونوں نے اس کو بہکا دیا تھا لیکن میں اس کا آزر وہ اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ کیا تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو بارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے۔ میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً ہموکا نہیں۔ اس کے پوچھنے اس کو وہ آرام پہنچا دیا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکری نہیں رہی۔“

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابراہیم کو ساتھ لے لیتے، اگر اس کو بھی اپنے قایم کر لیا تو میرا نام نہیں۔“

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی ہوئی مٹی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ بارون نے ازراہ مذاق کہا۔ ”بھائی، تم نے تو عامر کو پوری طرح قایم کر لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟“

بارون نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ابھی کچھ اور بھی دیکھنا باقی ہے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اس کو اس لائق کروں گا کہ یہ کو ارسون کر تیرے مقابلے میں آجائے گا۔“

بارون نے ہنس کر کہا۔ ”تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا۔“ پھر عامر سے پوچھا۔ ”کیوں بیٹے! کیا تو کو ارسون کر تیرے مقابلے پر آمادہ ہے؟“

عامر نے شرمناک جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“

لیکن میزہ نے دلی آواز میں کہا۔ ”نہیں، ایسا بھی

اب اس کا بار بار ذکر ہی کیوں؟ میں معافی چاہتا ہوں۔
لیکن بہنوئی بات کو کسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا بہنوئی اس کا اتنا شاک ہے کہ برسوں پرانی بات کا ذمہ یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ لگا ہوا اور دوسری طرف محبت اور انصاف کا یہ عالم کہ عامر کو اپنے بیٹے کی طرح پال ڈالا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ اس کی نظر میں دونوں ہی محترم تھے۔ باپ بھی اور چھوٹا بھی چنانچہ جب عامر کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کرے تو دونوں ہی سے مشورہ لیتا پڑا۔ پہلے اس نے اپنے باپ ہارون سے مشورہ لیا، پوچھا: ”باوا جان! اب میں عملی زندگی کا آغاز کرتا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیجیے کہاں سے اور کس طرح شروع کروں؟“

باپ نے جواب دیا: ”بیٹے! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ کام کے ساتھ ساتھ مال بھی کمائے تو بہترین موعن ہے میں تجھے فوج میں ملازمت دلا دوں گا۔ آج کل خوارج نے بڑے ہنگامے کر رکھے ہیں۔ اگر تو خوارج سے جہاد کرے گا تو دینی فائدوں کے ساتھ ہی اخروی ثواب بھی کمائے گا۔“

لیکن عامر اپنے باپ کی بات سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ وہ خارجیوں کی توبہ داری اور شہادت کی بڑی داستانیں سن چکا تھا اور اس کا چھوٹا اکثر و بیشتر خارجیوں کی بڑی تحریکیں سن چکا تھا۔

باپ سے مشورہ لینے کے بعد وہ چھوپا کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی مشورہ لیا، پوچھا: ”چھوپا جان! میں عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کروں؟ باوا جان کہتے ہیں کہ میں خوارج سے جنگ کر کے دین اور دنیا کے فائدے ایک ساتھ حاصل کروں، آپ کی کیا رائے ہے؟“

چھوپا نے جواب دیا: ”عامر! مجھے تیرے باپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ خوارج دین دار لوگ ہیں۔ اگر تم کو دنیا اور آخرت کی بھلائی واقعی مقصود ہے تو تو خوارج کا ساتھ دے۔ وہ دنیا میں حق قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیاں آخرت کے عوض وقف کر دی ہیں۔ چنانچہ اتنی عمر گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خوارج حق پر ہیں اور ہر سچے اور ایمان دار آدمی کو خوارج ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔“

چھوپا کا مشورہ کام کر گیا اور اس نے خوارج سے رابطہ قائم کر لیا۔ عز یزوں رشتے داروں کا مارا ہوا اور زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا عامر جب خوارج میں پہنچا اور ان کی شاندار باتیں سنیں تو وہ انہی کا ہو گیا۔ اس نے اپنی شہریت کو

دوسروں سے چھپائے رکھا لیکن چھوپا کو اس کا علم تھا۔ اس نے عامر کو مبارک باد دی کہ اس نے دین اور دنیا کی بھلائی اور سرخ روئی کی منزل پائی ہے اور اب اس کو گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہارون چاہتا تھا کہ عامر فوج میں داخل ہونے سے پہلے شادی کر لے لیکن منیزہ اس کی مخالف تھی۔ وہ بار بار زور دے کر یہی کہتی کہ عامر خود کمائے اس کے بعد شادی کرے۔ لیکن ہارون کہتا: ”جب تک میں موجود ہوں اس کی ساری ذمہ داریاں میرے سر ہیں۔ اس لیے عامر کمائے یا نہ کمائے، میں اس کی شادی ضرور کروں گا۔“

منیزہ نے جھنجھلا کر رائے دی: ”اگر یہ بات ہے تو ابراہیم بھی جوان ہو چکا ہے، اس کی بھی شادی ہو جانی چاہیے۔“ ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: ”ہاں، اس کی شادی بھی ہوگی لیکن عامر کی شادی کے بعد۔“

دونوں میں اس موضوع پر بڑی دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ آخر ہارون کا بہنوئی بھی اسی بحث میں شامل ہو گیا اور اس نے کھلم کھلا عامر کی طرف داری کی لیکن منیزہ کا بوڑھا باپ اپنے نواسے ابراہیم کی طرف تھا۔

ہارون نے اپنے بہنوئی کی بھائی بھانجی اور عامر کو پالا پوسا ہے اس لیے بے ذمہ داری میں تمہارے ہی سر ڈالنا ہوں کہ عامر کے لیے اچھی دہن تلاش کرو۔“

دوسری طرف منیزہ نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے کوئی حسین لڑکی تلاش کرے۔ دونوں ہی حسین لڑکی کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔

آخر دو ماہ کی جدوجہد کے بعد ہارون کے بہنوئی نے ایک لڑکی تلاش کر لی اور ہارون کو مطلع کیا کہ اگر تم کو یہ لڑکی پسند ہو تو میں بات کروں۔

ہارون نے منیزہ سے کہا: ”منیزہ! میرے بہنوئی نے عامر کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ اس کو دیکھ کر تائبہ کر دے کہ میں بات آگے بڑھاؤں۔“

منیزہ نے برا سادہ بنایا اور جواب دیا: ”ہارون! تو میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کیا کر۔ عامر کی دہن کو میں کیوں دیکھوں؟ تیرا کام ہے۔“

ہارون نے غصے میں کہا: ”اوشری عورت! تو میرے بیٹے عامر سے اتنا جلتی ہے۔ افسوس کہ میں نے اس پر پہلے بھی اتنا زیادہ غور نہیں کیا تھا۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”صرف میں ہی نہیں جلتی

عشقی نا تمام

عامر بھی مجھ سے جلتا ہے۔ جیسے کو تیسرا۔ آخر میں اس کا جواب کس طرح دوں؟“

ہارون نے سختی سے کہا: ”منیزہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا لیکن اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دہن کو دیکھ کر دیانت داری سے بتا کہ یہ عامر کے لیے کیسی رہے گی۔“

منیزہ نے بھی بے پروائی سے جواب دیا: ”میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے تو بھاگ دوڑ کرتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟“

ہارون نے ایک بار پھر حکم کیا: ”منیزہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں اگر تو نے میرا حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔“

منیزہ کے باپ نے مداخلت کی، منیزہ کو سمجھایا: ”منیزہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم ماننا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔“

منیزہ بے بس ہو گئی اور باپ کی ناخوستہ ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچ گئی۔

لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور گنتی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کے سائے میں بڑی بڑی بادام کی آنکھیں اور خوارج اور تباہی کے شہر پر ہونے والی جنگ رنگ۔ سر تاپا یاف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نظر ہو جائے۔ باتوں میں سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی کنگ۔ منیزہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر والوں نے ان سب کی بڑی تواضع کی۔

منیزہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا: ”محترم خاتون! کیا تم نے عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سوئپ دینا چاہتی ہو؟“

لڑکی کی ماں نے جواب دیا: ”نہیں، میں نے لڑکا تو ابھی تک نہیں دیکھا لیکن بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا ہی ہوگا۔“

منیزہ نے کہا: ”افسوس کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہنا مانو تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو بڑے سکون سے رہے گی۔“ لڑکی والوں نے بھی معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

لڑکی کی ماں نے پوچھا: ”کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟“ منیزہ نے جواب دیا: ”عامر بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی خائن بھی نہیں ہو سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے

پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور دور رہا ہے۔“ رابعہ کی ماں نے پوچھا: ”اگر ایسی بات تھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو دیکھنے کیوں آئی تھیں؟“

منیزہ نے جواب دیا: ”میں لڑکی دیکھنے نہیں، لڑکی کے گھر والوں کو سب کچھ بتانے آئی تھی۔“

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ اعلان کیا کہ ”رابعہ کو ابراہیم کے لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے ہرگز منسوب نہیں کریں گے جو اپنے باپ سے دور چھوپا کے گھر پلا بڑھا ہو۔ وہ یقیناً گستاخ اور سر پھر الا کا ہوگا۔“

اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چونکا دیا۔ بہنوئی نے حیرت سے کہا: ”یہ کیا بات ہوئی، یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا: ”بھائی، میں سب کچھ سمجھ گیا۔“ وہ سب نڈھال اور افسردہ جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ چھوپا منہ نہ کھاتے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ منیزہ کسی کی پروا کے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عامر ہٹکا کھٹکا محالے کو مجھے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ اپنی زبان سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون، منیزہ سے راز نہ تھا۔ وہ منیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنا لباس بدل رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی، بولی: ”ہارون! انجیریت تو ہے؟“ ہارون نے چٹکی مسکراہٹ سے جواب دیا: ”منیزہ! یہ کیا ہو گیا؟“

منیزہ نے پوچھا: ”کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تو کیا جانتا چاہتا ہے؟“

ہارون نے کہا: ”ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے لگے تھے۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”بے شک لیکن وہ لوگ عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے۔“

ہارون نے افسوس سے کہا: ”وہ خود عامر کے بجائے ابراہیم کو نہیں پسند کرنے لگے بلکہ تو نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

منیزہ نے ناگن کی طرح منہ زکر جواب دیا: ”انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عامر کی خائن بن رہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بچہ میرے پاس نہ رہا ہو، جسے میں نہ پالا پوسا ہوا ہوں وہ اپنے ماں باپ سے دور چھوپا کے

سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ”مجھ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ہارون کو دروغ یا جادو ہے مگر مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں ہر ایک سے منٹ لوں گی۔“

ہارون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور دونوں ہی عامر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

شام ہو گئی مگر عامر نہیں آیا۔ رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر نصف رات ہو گئی۔ پھر پانچ گھر ہارون زیادہ غور مند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہارون تھملا یا تھملا یا ادھر ادھر پھر پتا رہا۔ وہ عامر کی تلاش میں اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ میزہ بہت خوش تھی کہ ایک کاٹنا جو اس کے دل میں مستقل چھپ رہا تھا اب دور ہو چکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بہت خوش ہو رہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی مہینے، دو مہینے پھر چھ ماہ گزر گئے مگر عامر کا کہیں پتا نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے بڑھا لیا اور بڑبڑا کر دیا۔ پھر پانچ پریشان تھا مگر سب کچھ۔ اب ہارون کم ہو گیا تھا۔ باپ کے غم کو دیکھ کر ابراہیم، عامر کی تلاش میں نکل گیا۔ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ابراہیم کی گمشدگی نے میزہ کو بھی ہلا ڈالا۔

اب یہ گھر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا کسی کو ہم میں دل نہیں تھا۔ اب عامر کی موت ہو گئی۔ عامر کی قبر پر ہر روز نماز پڑھ کر رہتے تھے۔ میزہ کو شہید تھا کہ اس کا بیٹا ابراہیم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سازش کا بانی مہابی ہارون کا بہنوئی تھا۔ میزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی کو کچا چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مرده کر دیا۔ اب اس کا کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ میزہ بھی اکثر پیشتر روٹی ہی روٹی۔ ہارون کا بہنوئی بھی اس کے رہنے لگا تھا۔ میزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں ہی رہتا تھا۔ ہارون اور میزہ گاہے گاہے آپس میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا۔ ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ تیری خود غرضی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔“

میزہ کہتی۔ ”ہارون! مجھے موردِ ازار مگر نہیں اگر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔ اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں دفعان ہو جاؤں گی۔“

اور یہ تو تو میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔ ہارون نے اکتا کر بدکردار مجبوری اپنے ساتھ بیٹھے سے رجوع کیا اور کوفہ روانہ کیا۔ ان دنوں کوفہ اور بصرہ میں خلافت کی نایاب حجاج بن یوسف کو مل چکی تھی اور وہ خوارج

کے خلاف مہمات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کو سپاہیوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے فوج میں داخل کر لیا گیا۔

حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس نے خراسان میں وہابی کے عامل اسے کا ساتھ چھوڑ کر باغی کبیر کی حمایت کی تھی تو غضب ناک ہو گیا، بولا۔ ”اگر اس بار۔۔۔ بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی خائف انسان ہوں۔ اگر ان دنوں خراسان میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو تو آج نظر نہ آتا۔ تیری خاک کا بھی پتا نہ ہوتا کیونکہ میں غدار کو معاف نہیں کرتا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی۔ اگر میں غدار ہوتا تو میرا شہر بھی غداروں کے ساتھ ہو چکا ہوتا لیکن میں وفادار انسان ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی گردن تک کو اداؤں گا۔“

حجاج نے کہا۔ ”تب پھر ہمیش میں شامل ہو جا جو دشمنانِ خدا سے مصروف پیکار ہے۔ اگر تیری ہمیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نوازاؤں گا۔“

ہارون نے اسے اس کی بات مان لی۔ اس نے اپنے اپنے خدمات کا صلہ انعام و اکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ محض سے چل کر میاں آیا ہوں، چاہتا ہوں کہ جب میں انعام و اکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوفے میں رہنے کی جگہ دے دی جائے۔“

حجاج نے پوچھا۔ ”تجھ کو محض میں کیا تکلیف ہے جو کوفے میں منتقل ہو جانا چاہتا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ اس لیے میں اس گھر میں روحانی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔“

حجاج نے کہا۔ ”تو فکر نہ کر، خوارج کے قتلے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتقام کوفے میں ہی کر دوں گا۔“

ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ محض واپس نہیں جائے گا۔ اس کو میزہ سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ پورے اہلِ امیہ کا میزہ ہی کو کوفے دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے اس میں باپ کی اور قنوطیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے لوگوں کی بھی اور ہر وقت یہی دعا مانگنا رہتا تھا۔ ”خدا یا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب اور

عشقِ ناقص

کامران کر دے، یا پھر شہادت سے ہمکنار کر دے۔“ ہارون کو شہرِ بخارا میں سردارِ شیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شیب نے اموی افواج کو شکستوں پر شکستیں دے کر تھلک چا دی تھا۔ حجاج ان شکستوں کی وجہ سے فکر مند ہو گیا تھا اور دن رات شیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔ حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شیب اپنی فوج کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ حجاج فرات کے کنارے اپنے کل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔

شیب فرات کے دوسرے کنارے سبز نامی قصبے میں پڑا ڈال کر انتظار کرنے لگا۔ ہارون کا دستِ شیب کے مقابلے حجاج کے حکم کا منتظر ڈالنا ہوا تھا۔

حجاج نے کل کی چھت سے میدانِ جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے اس پار سبز میں مسجد کے سامنے شیب کی فوج کو پڑا ڈال دیکھا۔ شیب کے پاس فوج زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب حجاج نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دے کو فرات کے اس پار اتار دیا اور سختی سے تاکید کر دی کہ وہ شیب سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈنارے جب تک وہ خزانہ کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

حجاج کی محنت نے اچھی طرح کام کیا۔ شیب نے کوفے کی طرف حجاج کی فوج اور اپنے دو غلاموں کو زور برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سیاہ کوئے کو فرات کے پار اتار گیا۔ حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج سبز کی مسجد تک پہنچنے کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر بخارا میں اس مسجد تک پہنچے گا تو کامیاب ہو گیا تو وہ شیب اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شیب نے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔ حجاج نے زور برق لباس پہنے ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا۔ ”اے شخص! اگر تو شیب کو ہلاک یا زخمی کر دے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ آگے بڑھ اور شیب کو قتل کر کے آ جا۔“

غلام نہایت شان اور آن بان سے آگے بڑھا اور شیب کو لگا لگا۔ شیب نے غلام کو حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ غلام اور شیب میں ذرا دیر مقابلہ ہوا اور چند لمحوں بعد شیب نے غلام کو قتل کر دیا۔ وہ جوش و خروش سے گھوڑا دوڑاتا ہوا حجاج کی فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا۔

”اے مجھ سے نبرد آزما لوگو! اگر یہ حجاج تھا جو زور برق کا غلام طہمان اور شیب کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر شیب نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہو کر جیسے ہی گرا، شیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔“

لیکن شیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یا امیر! امومنین!

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حجاج تو وہ رہا جو کرسی پر مکننت سے بیٹھا ہے۔

شہیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا۔ ”خیر اگر حجاج ابھی زندہ ہے تو شاید اپنے انجام کو پہنچنے کے لیے اور اللہ نے چاہا تو اس کو سن فلاح و خیر سے میں ہی نجات دلاؤں گا۔“

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ ”اے اطاعت شعار اور فرماں بردار! تم ثابت قدم رہو اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے اور فتح کے درمیان کوئی شے حاصل نہیں رہے گی۔“

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شہیب نے ان پر ہنس پڑا اور کہا۔ شہیب اپنے چہرہ آدھیوں کے ساتھ جملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی موجودگی نے اس کی سیاہ کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں و نیزے اور تیر

انسانوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے۔ شہیب اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خارجیوں کو پیچھے دھکیلے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی ہتھیاروں سے تھے، حجاج کی کمری سچے کی مسجد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شہیب نے اپنے ساتھیوں کو حجاج کی طرف

”اے اللہ کے دوستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا۔ نیچے آ جاؤ اور حجاج کی سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔“

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ ”امیر! میں اس خارجی سردار کو موت کے گھاٹ اتار کر امر ہو جانا چاہتا ہوں۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”پھر انتظار کس بات کا ہے، آگے بڑھو اور آپ شجاعت سے اس شعلہ جوار کو سرد کر دے۔“

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن وہ جیسے ہی خارجیوں کے قریب پہنچا، خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے گھوڑے کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگ کے کٹ جانے سے منہ کے تل گر گیا۔ ہارون گھوڑے کے سامنے ذرا قاصدے پر اس طرح جا گر آگیا کہ اس کو اٹھا کر چھینک دیا گیا ہو۔ ہارون کے ہاتھ سے تلوار بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساس باقی رہا کہ خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پروا کیے بغیر فوراً اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی

تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور حکماً کہا۔ ”بھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا رہ ورنہ ہلاک کر دیا جائے گا۔“

اس شٹا سا آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی اور اس نے بے اختیار اس نوجوان کی طرف دیکھا اور خوشی میں چلا یا۔ ”ارے، عامر یہ تو ہے..... مگر تو یہاں کہاں؟“

عامر کی تلوار کی نوک اب بھی ہارون کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی جلدی کہا۔ ”افسوس کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو غلطی سے عبدالملک بن مروان کو مسلمانوں کا امیر المومنین سمجھتا ہے اور میں شہیب کو اپنا امام سمجھتا ہوں۔“

اتنی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہارون پوری طرح ان کے قابو میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! آؤ اس کی بدقسمت امیر میرا باپ ہے اس لیے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ گرفتار کر کے امیر المومنین شہیب کے حوالے کر دوں گا وہ جو سزا تجو پر کرے گی، وہ دے دی جائے گی۔“

لیکن انہی میں سے ایک اور آشنا نوجوان ہارون کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ ابراہیم، عامر کی سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون اس کی بوجھ بوجھ کر دیکھتا رہا۔ وہ اللہ کی قسم کھاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟

عامر نے پھر جواب دیا۔ ”ہاں، اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی دنیا، آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا احترام بھی نکل گیا۔“

حجاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں گھر گیا ہے، فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔“

شامی سپاہ کا ایک دستہ دیواندار آگے بڑھا اور آٹا فافا ہارون سمیت کئی خارجیوں کو اپنے گھرے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچ گئے اور خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب اپنا پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی تلوار کی نوک سینے سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کندہیں چھینک چھینک کر انہیں گرفتار کر لیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔

ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کو رسیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چہن ہو گیا۔

شہیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دہشت پر یلغار کر دی لیکن اتنی دیر میں حجاج شامیوں کو طاقت ور ملک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور اس میں شہیب کا بھائی مصداقل کر دیا گیا۔ خوارج نے خود کو جمع کر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شہیب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

”اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توقع میں بدترین محلوں سے منہ موڑ لو۔ شاید آنے والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔“

خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کرسی کو آگے بڑھا تا رہا۔ یہاں تک کہ شہیب اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کرسی سے اتر پڑا۔ وہ مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ ”اے اطاعت شعار! اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو ہمیں حاصل ہوئی۔“

پھر وہ بیٹس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی ہماری طرف بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی پوجھاڑے سے روک دو۔“

شہیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو ہاتھوں میں ہاتھوں سے دھڑکتے ہوئے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار کر گیا۔ جب وہ سب دریا پار آ کر گئے تو شہیب نے تلخ آواز دیا تاکہ اموی سپاہ اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دونوں بیٹوں کی محبت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج سخت ظالم اور سفاک انسان ہے، وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے امیر خوارج کو قید خانے میں ڈالوا دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر جانے لگا۔ اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقت ور دستہ طلبا یہ گردی کے لیے چھوڑ دیا اور اس طلبا یہ گردی کا سردار ہارون کو حشر کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ ”ہارون! میں حکم عدولی کا سخت مخالف ہوں۔ تجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”کیسا شکر ہے؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں نالائق اولادوں سے

حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ ”میں زبان درازی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تو اسی وقت طلبا یہ گردی دے کر دریا کے کنارے کنارے چکر لگا تارہ کیونکہ شہیب کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی قائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

لیکن ہارون نے اس لمحے میں جواب دیا۔ ”لیکن میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا۔“

حجاج نے زخمی سے پوچھا۔ ”ان سے تیرا تعلق، ان سے تیری دلچسپی کا سبب؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”مگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار دوں پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے دلچسپی کیوں ہے؟“

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا۔ ”اچھا بتا مگر مختصر آ جانا کیونکہ میں داستان کوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔“

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنائی۔ حجاج بڑے اٹھاکا سے سنتا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلٹیں چھپکا میں اور دہشتی سے کہا۔ ”افسوس کہ تو فوج کی سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ نالائق انسان ہے جو اپنے آپ کو خدا کا رسول کہتا ہے۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظر کرم کا خواہاں ہوں۔“

حجاج نے کہا۔ ”ہاں، میں ان پر رحم کروں گا۔ ان پر بھی اور تجھ پر بھی۔“

ہارون فرخ خوشی سے مسکرا اٹھا۔ ”امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا کاشی شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”کیسا شکر ہے؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں نالائق اولادوں سے

میں غلطی پر ہوں۔

حاجج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال کرتا رہا اور آخر میں کسی کو بائیں ہاتھ کا کاغذ تھا دیا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ عامر کی نوبت آگئی اور اس کو حاجج کے رو برو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حاجج اور عامر کے سوال و جواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلف وہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ حاجج اور عامر میں کیا بات ہوئی۔

کچھ دیر بعد جب ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حاجج نے ہارون سے کہا۔ ”او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزا سے موت نہیں دی لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر اس شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ تھا دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اس کو وہ سزا دے دی کہ وہ میرے لیے کسی خارجی کا ہونا چاہیے۔“

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی۔ ”یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری بار مل لوں؟“

حاجج نے جواب دیا۔ ”ضرور ملے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔“

ہارون لرزتا کا پتہ ہوا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔ ”عامر! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔“

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا۔ اس میں بس ایک فقرہ لکھا تھا۔ ”فقط پندرہ درے۔“

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا دیا اور ابراہیم سے کہا۔ ”ابراہیم! اپنا پرچہ تو دکھانا ذرا۔“

ابراہیم کا چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔ اس نے مردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ ”مقتل۔“

ہارون کا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور پنڈلیاں بری طرح سنہری تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی۔

دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حاجج کے آدمیوں نے ایک بار پھر زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹانا چاہتے تھے لیکن حاجج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو روک کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کھڑا ہے کھڑا رہنے دیں۔

ہارون نے سر کوئی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔ ”بیٹو! خبردار جو تم نے حاجج کی مخالفت کی۔ تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر وہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے ورنہ حاجج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔“

عامر نے جواب دیا۔ ”لیکن باوا جان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا زنا سے بڑا گناہ ہے۔“

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔“

ہارون نے کہا۔ ”چنانچہ حاجج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ واقعی فاقوں کے زبردست جھوٹے بول دینا آسان اور عام کام ہے جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ گردن کوچ پر قربان کر دوں۔“

ہارون سچ مار کر رو دیا۔ ”اواسے باپ کی دشمن اولاد! میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بے دین اور گمراہ ہو چکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤں گا۔“

حاجج نے دور سے ڈانٹا۔ ”او ذلیل اور خانہاں بر باد ہارون! تو کیا درغلا رہا ہے۔ ادھر میرے پاس آ جا ورنہ میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔“

ہارون نے اپنے بیٹوں سے عرض کیا۔ ”بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کچھ کہو جو میں نے کہا ہے۔ ویسے تمہاری مرضی۔“ پھر آنکھوں سے آنسو پڑنے والے آنسوؤں کا اپنے دامن سے پونچھتا ہوا حاجج کے پاس چلا گیا۔

حاجج نے طنز کیا۔ ”او عالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب دروز اپنے پاس رکھ کر خارجی بننے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند گھنٹوں کے ذریعے خارجیت سے منحرف کس طرح کر دے گا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”آپ درست کہتے ہیں،

بردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حاجج کے محل کے در پر دو باتوں کی طرح کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ امیر خوارج کے لیے مقدمے سے پہلے ہی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لیتا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور چاق و چوبند ہو گئے، ہارون اور دوسرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حاجج کہیں قریب ہی موجود ہے اور مقترب نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد حاجج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ پلے قدم اٹھاتا ہوا محل سے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی اپنے مخصوص لباس میں سر جھکا کر چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کے چند روٹے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور روٹے ایک دوسرے قاضی کے بائیں ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوئے منصب داروں نے حاجج کا دامن پکڑنا چاہا مگر حاجج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دور ہٹا دیا۔

حاجج کسی کی پروا کیے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت گار نے اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حاجج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مؤبد کھڑے رہے۔

حاجج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری تمام خارجی افسر کے رو برو لائے جائیں۔ یہ کل ستائیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حاجج کے رو برو کھڑا کیا گیا تو حاجج نے پوچھا۔ ”او بے دین! دشمن خدا اور رجزن بھلا بتائیں شہید کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”دوامیر المؤمنین اور امام ہدایت۔“ حاجج نے پوچھا۔ ”اور امیر المؤمنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے تو نے امام ہدایت کے مقابلے میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔“

حاجج نے بائیں ہاتھ کے روٹے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خارجی کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند گھنٹہ میں پھر میرا جلاور کوئی درہ بردار اس پرزے میں کبھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نوادے گا۔“

اس کے بعد حاجج کے رو برو دوسرا قیدی پیش کیا گیا۔ حاجج نے اس سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیے جو اس کا پیش را

تیرا پیچھا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کروا دوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں سے تیرا ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ جائے۔“

ہارون تھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ”امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔“

حاجج نے سختی سے کہا۔ ”تو شخص واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں پر صبر کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔“

حاجج نے کہا۔ ”ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لیے رحم کی درخواست قبل از وقت ہے۔“

ہارون نے اپنے مقدمہ کا زیادہ شدت سے اظہار کیا۔ ”امیر! میں یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں گے۔“

حاجج نے سختی سے جواب دیا۔ ”کسی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی۔ دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ میں ان دونوں کے ساتھ تجھے بھی بند کر دوں گا اور تجھی سزا کا سخت قرار دے دوں گا۔“

ہارون کا دل بھر آیا۔ ”امیر! تو مجھے قتل کر دے لیکن میرے بیٹوں کو ہا کر دے۔“

حاجج نے کہا۔ ”تو ان بیٹوں کے لیے رحم کی درخواست کر رہا ہے جو ہمیشہ سے تیری پریشانیوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ بخدا میں ان دونوں کو ایسی عبرت ناک سزا میں دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک غصا کا شوق بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم وہ سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتا کیونکہ اس کی ذلیل اور حاسد ماں کئی آدمیوں کی اذیت اور پریشانی کا باعث بنی رہی ہے۔ اب اس کو پریشان ہونا چاہیے۔ اب اس کو اذیتیں جھیلنا چاہئیں۔“

ہارون خنجر تھرکا پھینکے گا۔ حاجج اس کو لرزاں وترساں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ہارون کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

قیدی خوارج کو حاجج کے رو برو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امرا اور منصب دار حاجج کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رسیوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلاور درہ

ممتا چاہے انسان کی ہو یا کسی درندے کی... دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی اولاد کو کسی صورت چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے ایک عفریت کو جنم دیا اور اس کی تمام مصیبتوں کو جھیلنے ہوئے اسے ہر حال میں زندہ رکھنا چاہتی تھی... لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اس کی دیوانی ممتا اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔

ایک خونی بلا کا احوال جو قدرت کا خوف کا اظہار تھا

عفریت

کاشفِ زبیر



اکتوبر 1956ء

چیک کیا اور اپنی بیوی مارتھا سے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ بند کر لو اور میری آواز سے بغیر دروازہ مت کھولنا۔“

مارتھا نے سر ہلایا۔ وہ خوف زدہ تھی مگر اس نے وہی کیا جو موسم کی وجہ سے کڑیاں پہلے ہی بند تھیں مگر اس نے ان کی پتھیاں بھی لگا دیں۔ پھر اس نے اپنی رائفل اٹھا کر اسے

نکھانچ دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ ایڈ سخت مضطرب ہے۔ اس نے تمام کڑیاں اور دروازے بند کر دیے تھے۔ اگرچہ موسم کی وجہ سے کڑیاں پہلے ہی بند تھیں مگر اس نے ان کی پتھیاں بھی لگا دیں۔ پھر اس نے اپنی رائفل اٹھا کر اسے

اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست کر کے کھانچ کے پاس جاؤں۔“

ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی کھانچ کا حکم پہنچا چکا تھا اور دروازے بردار بڑی سرعت سے اس کی ٹیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلا دیا دروازے بردار کی طرف بڑھتا۔ جلا دھوڑا ہی گردن مار دیتا اور دروازے بردار دروازے لگے لگتے۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آگئی اور اس کا پرچہ پڑھ کر اسے دروازے بردار کے حوالے کر دیا گیا۔ دروازے کی ضربات سے جو چیخیں نکل رہی تھیں، انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو دروازے کی شاہپ اور زنجیروں کے ادھر ادھر کرنے اور بھاگنے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلا د بڑی سفاکی سے گرد میں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے کھانچ سے درخواست کی۔ ”یا امیرا میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کیجیے۔“

کھانچ نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”تو خاموش بیٹا رہ۔ میں جب تک سارے مقدسوں کے فضلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کروں گا۔“ ہارون بدحواس، افسانہ و خیال میں پہنچا۔ اس وقت جلا د اپنی ٹکڑیوں میں بند کر چکا تھا اور ٹکڑیوں کے سائے میں عامر سر جھکا کر کھڑا تھا۔ ایک جھپٹے میں ٹکڑی پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف پھل گئی۔ ہارون چیخ مار کر گر گیا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ ادا کر سکا۔

”اس کو کیوں مارتے ہو، یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔“ ہارون بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم چندرہ دروازے کھاکر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر کے بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ سسکیاں دروازے کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عقیم بھائی کے عقیم الشان ایتار پر دل کی گہرائیوں سے۔

(ختم شد)

”ابراہیم بیٹے! تم گھبرا مت۔ میں کھانچ کے پاس واپس جا رہا ہوں۔ میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی بیگم مانگوں گا۔“

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہارون کو کھانچا، ڈنگنا کھانچ کے پاس پہنچا اور بڑی رقت سے درخواست کی۔ ”امیرا! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کر۔ اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے موت مرجائیں گے۔“ کھانچ نے درشت آواز میں حکم دیا۔ ”ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا۔ پہلے بقیے کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھا، اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا۔“

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرط غم سے دونوں آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

کھانچ نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ ”جا اور جلا د اور دروازے والوں سے کہہ دے کہ جن کو سزاؤں کے پرچے مل چکے ہیں، ان پر فوراً عمل کیا جائے۔“

قاضی دبے قدموں جلا د اور دروازہ برداروں کی طرف چل دیات دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عامر نے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سا نظر آتا ہے۔ کیا موت سے ڈر گیا؟“

ابراہیم واقعی رو رہا تھا، بولا۔ ”بھائی، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری ماں تک جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔“

عامر کو اپنی سوتیلی ماں میزہ کے ظلم و ستم یاد آئے اور ذرا دیر کے لیے میزہ کے بکبن چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوشی محسوس کی۔ وہ عکسین چہرہ تصور میں قتل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا۔ ”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“ ابراہیم نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“ عامر، ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا۔ ”لے، اسے رکھ لے“

بلا و فلسطین و شام، جی، لی اسٹریٹج، فتوح البلدان، بلاذری، تمدن اسلام، جرجی زیدان۔ تاریخ طبری، طبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ تاریخ شام، فلپ کے حسی۔

ماہیات

تھا۔ وہ اسے اٹھائے گھر کے اندر آیا اور بستر پر لٹا کر فون کی طرف جانے لگا تھا کہ رک گیا۔ باب جو راستے میں تھوڑا بہت بل رہا تھا، اب بالکل سلاکت تھا۔ اس نے باب کی بغض اور پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ انہیں سلاکت یا کڑوہم سے نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور اپنی سسکیاں دھونے لگا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کے آنسو رک گئے تھے۔ مگر اس کے دل میں اب آگ جل رہی تھی۔ اس نے باب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ میرے بچے میں تمہارا انتقام لے کر رہوں گا۔“

کچھ دیر بعد اس نے باب کی لاش ایک چادر میں لپیٹ کر ٹرک میں ڈالی اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ بولڈ ماؤنٹین کی اس پرانی بستی کی طرف تھا جہاں لوگ آج کے دور میں بھی خاصی قدامت پرستی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور ان کا رکن بہن بہت سادہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب سورج ڈھل چکا تھا، وہ بستی میں داخل ہوا اور اس نے رابرٹ کے مکان کے سامنے ٹرک روکا۔ انجن کی آواز سن کر وہ باہر آیا اور ٹرک کے عقب میں آنے کے تھیلے و کچھ کر اس نے اپنے بڑے کو آواز دی۔ ”برید! آکر یہ تھیلے اندر کے جاؤ۔“

برید وہی لڑکا تھا جس نے اسکی اور کرک کو کدو کے سر والے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ آکر ٹرک کے عقب سے تھیلے اتارنے لگا۔ ہارے بچے آگیا۔ اس نے رابرٹ سے کہا۔ ”مجھے اس عورت کا پتا چاہیے۔“

”کس عورت کا؟“ رابرٹ نے پوچھا۔

”جس کا تعلق کدو کے سر والے سے ہے۔“

”ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”وہ ہے اور میں نے اسے خود دیکھا ہے۔“ جیف ہارے نے یقین سے کہا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے دوست سام کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا اور وہ اس مخلوق کا شکار بن گیا تھا۔ جیف نے اپنی جیب سے رقم کی ایک چھوٹی گلدی نکال کر رابرٹ کی طرف بڑھائی۔ ”مجھے صرف اس کا پتا چاہیے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ رابرٹ نے غصے سے کہا۔ ”تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟“

جب جیف نے باب کی لاش سے کپڑا ہٹایا۔ ”یہ میرا چکا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے مارا ہے۔“

رابرٹ نے جھک کر دیکھا اور اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بچے کا فحش ہے۔ اسے لے کر فون کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

برید رک کر ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا مگر جب رابرٹ نے اسے گھورا تو وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور آٹے کی بوریاں اٹھا کر لے جانے لگا۔ دس منٹ بعد جیف واپس جا رہا تھا کہ ایک ٹنگ گلی سے گزرتے ہوئے اچانک برید سامنے سے نمودار ہوا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اس کے اشارے پر جیف نے ٹرک روک لیا۔ اس نے کھڑکی سے لنگ کر کہا۔ ”میں ہارے! میں نے تمہاری اور برید کی بات سنی ہے۔ میں اس عورت کو جائز ہوں۔ اس کا نام میگاٹ ہے۔“

جیف منہ پر ہاتھ جیف نے فون کی گلدی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے لے کر جیب میں رکھی۔ جیف نے اسے کال کر کے پوچھ لیا۔ ”مجھے صرف نام نہیں پتا چاہیے۔“

”میں دیکھا کرتا ہوں۔“ برید نے کہا اور اچھل کر ٹرک کے پیچھے سوار ہو گیا۔ اس نے جیک کر جیف سے کہا۔ ”بولڈ ماؤنٹین کے اوپری حصے کی طرف چلو جہاں پرانی دلدل ہے۔“

جیف فون کی آواز پر چلا اور اپنی دلدل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ آباد علاقہ تھا اور یہاں کے لوگ بھی وہاں جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہاں اکثر دلدل سے زہریلی گیس خارج ہوتی تھی۔ کئی جان لیوا حادثات کے بعد لوگوں نے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب جیف اس کے اوپری حصے کے پاس پہنچا تو برید نے صمت پر ہاتھ مار کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور ٹرک رکنے ہی وہ بچے اتر آیا۔ اس نے جیف سے کہا۔ ”یہاں سے آگے تم خود جاؤ۔ یہ راستہ سیدھا میگاٹ کے گھر تک جاتا ہے۔“

”اوکے تم چا سکتے ہو لیکن وہ نہ ملی تو میں سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔“

”اگر وہ زندہ ہے تو یہیں ہے۔“ برید نے کہا اور پلٹ گیا۔ جیف نے گاڑی آگے بڑھادی۔ یہ دلدلی علاقہ تھا جہاں زمین بہت نرم تھی اور راستے سے ہٹنے کی صورت میں ٹرک کے ٹائر زمین میں جھنس سکتے تھے۔ بالآخر ایک جگہ راستہ ختم ہو گیا اور اسے بچے اترنا پڑا۔ وہ پیل آگے بڑھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد تاری ہوئی تھی مگر اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں راست دکھائی دے رہا تھا۔ دلدل سے بتارات کے ساتھ گیس اور بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔

عام حالات میں جیف یہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن باب کا انتقام لینے کے لیے اس وقت وہ جہنم جانے کو بھی تیار تھا۔ اسے کچھ دور ایک ٹیلے پر لکڑی کا بنا ہوا جھونپڑا دکھائی دیا جس کی چٹنی سے دیو اس خارج ہو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی اور دلدل تھی اور جانے کا واحد راستہ لکڑی کا بنا ہوا تختہ حال میں تھا۔ وہ اس سے ہوتا ہوا جھونپڑے تک آیا اور دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

جھونپڑے کے اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسے کسی جاو گرنی کے ٹھکانے کا ہو سکتا ہے۔ جگہ جگہ مردہ جانوروں کے ڈھانچے اور حنوط کیے جانور موجود تھے۔ ایک طرف ریک پر زندہ الو بیٹھا تھا جس نے جیف کے اندر آتے ہی بڑی کربہی آواز نکالی۔ اس کے سامنے والے ریک پر چرے کچھ کھا رہے تھے اور وہ الو کی موجودگی سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ آتش دان کے سامنے سفید بکھرے بالوں والی میگاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

جیف آگے آیا اور اس نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں موجود ہونے کے سیکے کرسی کے ساتھ رکھی میز پر موجود بلوری گولک میں ڈال دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا ہے۔ یہاں کا ماحول ہے۔“

”جیف میگاٹ نے سر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تو جیف کا پٹ اٹھا۔ اس کے سامنے چھریوں اور دانوں سے بھرا ہوا ایک انسانی چہرہ تھا جس کا اس نے بھی قصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ایک آنکھ میں سفید جالا تھا اور دوسری خشک تھی۔ میگاٹ اس علاقے کا ایسا کردار تھی جس کے بارے لوگ بہت کم جانتے تھے اور اس سے بھی کم لوگوں نے اسے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ وہ چیزیں تھی اور کم سے کم ایک صدی سے یہاں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر جیف کو لگا کہ اس کی عمر ایک صدی سے بھی زیادہ تھی۔ کدو کے سر والا اصل میں میگاٹ کا مہرہ تھا، وہی اسے زندہ کرتی تھی اور جن لوگوں کے لیے وہ زندہ ہوتا تھا انہیں ختم کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ ساری کہانیاں تھیں جو اس علاقے میں ایک صدی سے سینہ بہ سینہ چلتی آ رہی تھیں۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کدو کے سر والا میرے بچے کا انتقام لے۔“

عورت کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔ ”سوچ لو، بعد میں کچھ بتاؤ۔“

”میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں رہا ہے۔“

جیف جذباتی ہو گیا۔ ”میرا بچہ میری کل کا نساٹ تھا اور وہ مر

چکا ہے۔“

عورت نے سر ہلایا۔ ”بچے کو یہاں لے آؤ۔“

جیف جا کر باب کی لاش لے آیا۔ عورت نے اسے ایک طرف رکھی کرسی پر ڈالنے کو کہا اور بولی۔ ”اب تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے۔ تم دلدل کے اوپری حصے میں جاؤ گے۔ وہاں ایک بڑے درخت کا کٹا ہوا ٹانہ ہے۔ اس سے تم کے اوپری حصے میں ایک لاش فون ہے۔ تم وہ نکال کر لاؤ گے۔“

جیف کچکا کچکا اٹھ کر اپنی دیر میں عورت نے اسے پیچھے تھوڑا دیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور دلدل کے اوپری حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے کٹا ہوا ٹانہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑا تھا اور اس کا قطر کم سے کم بھی دس فٹ تھا۔ وہ اس کے کھر درے حصے کو پکڑ کر اوپر آیا۔ کٹا ہوا ٹانہ اوپر سے ہوا نہیں تھا اور اس کے وسط میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ جیف نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ پیچھے چلنا شروع کیا اور مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے ابھی مشکل سے ایک فٹ مٹی ہٹائی ہوگی کہ پیچھے کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے پیچھے رکھا اور ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگا۔ جلد ایک سکڑا سا ٹانہ ہوا ہاتھ سامنے آیا جس میں لمبی انگلیاں اور ان پر لمبے ناخن تھے۔ جیف مٹی ہٹانے لگا۔ جلد اس کے سامنے ایک عجیب الخلق انسان کی لاش آگئی۔ اس کا سر غصے سے بھرا ہوا اور جسم چھوٹا سا تھا۔ بالکل کی آنکھوں والے کٹے ہوئے سر کے ساتھ اس کی آنکھیں سر کے کٹے ہوئے سر سے بدلو کے جیسے اٹھ رہے تھے۔ لاش تقریباً ڈھانچا ہوئی تھی مگر اس کی ساخت واضح تھی۔ جیف نے ایکایاں روکے ہوئے اسے باہر نکالا اور اٹھا کر میگاٹ کے جھونپڑے میں لے آیا جو باب کی لاش پر بھی کچھ کر رہی تھی۔ اس نے جیف سے کہا۔

”آسے میز پر ڈال دو۔“

میز صاف تھی۔ میگاٹ نے اس سے تمام چیزیں اٹھا لی تھیں۔ جیف نے بڑے سر والے کی لاش میز پر ڈال ڈالی۔ میگاٹ مزی تو اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک پھیلے کناروں والا جام تھا اور اس میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ وہ جیف کے پاس آئی اور مطالبہ کیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

جیف نے ہاتھ آگے کیا تھا کہ اس نے نہایت بھرتی سے اس پر اپنا ناخن مارا۔ جیف کی تھیلی پر کٹ ٹھوڑا ہوا اور اس سے خون بہنے لگا جو میگاٹ جام میں جمع کرنے لگی۔ اب جام نصف کے قریب بھر گیا تھا۔ وہ کھوی اور اس نے بہت محنت سے جام لاش کے منہ سے لگا دیا اور اس کا سر اٹھاتے ہوئے جام اس کے حلق میں اندر ڈال دیا۔ جیسے ہی خون اس

کے منہ میں گیا، اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور اس کی لمبے جیپ کو لگا کر اس کا سر پھرا رہا ہے۔ وہ سر ہمارے کمر پہنچے گیا اور پھر اس نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا کہ لاش میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ صرف حرکت نہیں بلکہ وہ بڑھ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قد آور غریبہ میں بدل گئی۔ جیپ اسے بھولا نہیں تھا حالانکہ اسے دیکھتے ہوئے انعامی سال گزار چکے تھے۔ چہرہ وہ پکارا کہ نیچے گرتا تو اسے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں کب اسے ہوش آیا تو کرسی پر بیٹھی میگاٹ نے کہا۔

”تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اپنے بچے کو لے جا کر دفنا دو اور دیکھو، اس کے قاتل کیسے مارے جاتے ہیں۔“

مکیا۔ ”پہلے تم نے دھوکے سے مجھ پر قابو پالیا مگر اب تم میرے پاس نہیں آ سکتے۔“
 مارش باہر جانے لگا تو رک اس کی طرف لپکا۔ ”ابھی مت جاؤ، دیکھو موسم خراب ہو رہا ہے۔“
 ”میرا ٹرک ہر موسم میں سفر کر سکتا ہے۔“ مارش نے فخر سے کہا اور باہر نکل آیا۔ فیرواس کے ساتھ تھی۔ وہ سب بھی باہر آ گئے۔ ہوا میں کاٹ گئی اور سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ رک اور ایملی انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔
 بیک کے ساتھ دونوں تعلق سے ایک طرف کھڑی تھی۔ مارش اٹکار کرتا ہوا آندے سے اتر کر نیچے
 چلا۔ ”میں نہیں رک سکتا۔“

کرنی ہوگی۔“
”پولیس کیا کر لے گی؟“ میک بولا۔ ”ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔“
اجانک انہیں کیمین کی طرف سے لوکیوں کے چلانے کی آواز پائی تو وہ پلٹ کر بھاگے اور جب وہ کیمین کے سامنے پہنچے تو انہوں نے مارش کو بری طرح اڑھا دیا اور پڑا پایا۔ غیر دور ہی اسی اور کبہ رہی گئی۔ ”مارش مر گیا ہے۔“
رک نے اس کی نبض دیکھی۔ مارش واقعی مر چکا تھا۔ اس نے حسمے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اسے اندر لے چلو۔“
میک اور رک مارش کی لاش اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے کہ اجانک فہر کو کی چیخ سنائی دی۔ اس کا سر اسی بڑے

کہیں آپ کو
اعصابی کمزوری
تو نہیں؟

”جلدی لے آؤ۔“ رک نے کہا۔ رون اندر چلی گئی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں آجانا چاہیے تھا مگر اس سے اوپر وقفہ ہو گیا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تو رک اندر گیا۔ لاکھ بچ میں سنا تھا اور وہاں صرف مارش اور فیرو کی لاشیں چادر تلے پڑی تھیں۔ اچانک ایک بیڑوم کا دروازہ کھلا اور رون اس سے ہزام سے آکر باہر گری۔ اس نے رک کو دیکھا اور چلائی۔ ”مجھے بچاؤ۔“

تب رک نے اس کے پیچھے اسی بڑے سروالے عفریت کو دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے اندر آیا تھا اور اس نے رون کو دبوچ لیا تھا۔ اس نے جھک کر رون کی ٹانگیں پکڑیں اور اسے کھینچ کر لے گیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میک اور ایملی دوڑے ہوئے آئے تھے۔ میک نے سکتے میں کھڑے رک کو سمجھوڑا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ..... وہ رون کو لے گیا۔“ رک نے یہ مشکل کہا۔ بیڑوم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایملی نے اندر آتے ہوئے سین کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا اور اب انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے محبت پر کوئی چیز چل رہی ہو۔ پھر عفریت رون سمیت چن والی طرف سے نچے گوا۔ اس نے رون کا سر پکڑ رکھا تھا اور اس کا چہرہ چکن کی کھڑکی کے شیشے سے دبا رہا تھا۔ وہ کرب سے چلا رہی تھی کہ اس کی آواز نہیں مل رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے؟“ اچانک عفریت نے رون کو پیچھے کیا اور پھر زور سے کھڑکی پر رار اوڑھ کھڑکی توڑتی ہوئی اندر آگری۔ میک کے منہ سے چیخ نکلی، وہ رون کی طرف بھاگا۔ اس نے خون میں ڈوبی رون کو سیدھا کیا مگر وہ مر چکی تھی۔ شیشوں نے اسے بری طرح کاٹ دیا تھا۔ میک دھاڑیں مار کر رونے لگا تو باہر سے عفریت نے حیوانی قہقہہ لگایا۔ ایملی رو رہی تھی اور رک ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ ٹوٹا۔ ”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک اس درندے کو مار نہیں دوں گا۔“ میک نے کہا اور رون کی لاش فرش پر ڈال کر اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ رک نے اس کا بازو پکڑ کر سمجھوڑا۔ ”وہ درندہ نہیں ہے، وہ کدو کے سروالا ہے۔ ہم یا کوئی انسان اسے مار نہیں سکتا۔“

”صرف وہی انسان اسے مار سکتا ہے جس کا خون اسے زندہ کرتا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہوا ہے۔ رک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلتا چاہیے۔“

”چلو۔“ رک نے میک کو پکڑ کر کھینچا اور وہ تینوں کیمپ سے باہر نکل آئے اور پھر تیزی سے اس جگہ کی طرف بھاگے جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں مگر جب وہ گاڑیوں کے پاس آئے تو غصہ کئے۔ دونوں گاڑیوں کی حالت بری تھی۔ ان کی باڈی پینک کی تھی اور سارے ٹائر تباہ ہو گئے تھے۔ شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ رک کی پانچک جسے وہ پکڑ چھوڑ گیا تھا، اس کی حالت زیادہ خراب تھی وہ ترمیم کر کے صورت میں ہو گئی تھی۔ میک نے پک اپ پر کھڑکی لپٹ کر بائیک اتاری اور لنگ مار کر اسے اسٹارٹ کیا تو وہ اسٹارٹ ہوئی مگر جب اس نے اسٹیبلر ٹیڑ دیا تو بائیک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ انہیں وہی حیوانی ہنسی سنائی دی اور انہوں نے ایک طرف کھڑے عفریت کو دیکھا۔ بائیک کی جین اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایملی ہڈ پانی انداز میں چلانے لگی۔ عفریت نے ہاتھ میں موجود زنجیر کھینچ کر میک ماری۔ وہ بائیک سے الٹ کر دوڑ جا کر۔ اسے شدید زخم آئی کی مگر وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے رائفل اٹھاتے ہوئے عفریت کا نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میک نے دوبارہ گولی چلائی۔ اس بار بھی عفریت پیچھے گیا۔ مگر پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ایملی کی چیخیں ایک سارے کیمپ میں گونجنے لگیں۔

جیف نے قبر ہوار کی اور بیچل ایک طرف پیسٹک کر باتوں سے قحام کیا۔ ”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟“ جب تک وہ باب کی قبر کھود کر اسے دفن کرتا، اب وہ کمر پکڑانے کے دورے پڑتے رہے۔ اس وقت اسے لگتا جیسے اس کا تعلق آس پاس کے ماحول سے کٹ گیا ہے۔ چند منٹ میں وہ ٹھیک ہو جاتا۔ اس دورے میں اسے لگتا کہ وہ کچھ کر رہا ہے اور جیسے کسی کو مار رہا ہے لیکن اسے کچھ دکھائی یا سنا نہیں دیتا تھا۔

اچانک اسے چلانے کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے مرد اور عورتیں چلا رہے ہوں۔ اس کے بعد فائرنگ آواز آنے لگی۔ جیف تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس اپنے ٹرک میں موجود شاٹ گن نکالی اور درختوں میں کسی کی جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازیں نزدیک آگئی تھیں اور ان میں ایک عورت کی چیخوں کی آواز نمایاں تھی۔

☆☆☆
”اس پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا۔“ رک بولا۔ ”یہاں سے نکلو۔“

مگر عفریت اس دوران میں ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میک کا گلا دبوچ لیا۔ پھر وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ فائر کی آواز آئی تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ دور کھڑا جیف شاٹ گن سے عفریت پر فائر کر رہا تھا۔ شاٹ گن کی گولی زیادہ سن سے عفریت کے پیچھے سے میک کا گلا چھوٹ گیا۔ دوسرے فائر پر وہ مزید پیچھے گیا اور تیسرے فائر پر وہ دھڑام سے پیچھا اور ساکت ہو گیا۔ جیف نے شاٹ گن میں خالی ہونے والے کارٹوس کی جگہ نئے کارٹوس ڈالنے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”اس درندے نے ہمارے تین ساتھی مار دیے ہیں۔“ رک بولا پھر اس نے جھپکا کر کہا۔ ”مسٹر ہارلے! تین کرو تہارے بچے کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے بچے کے پیچھے بھاگتا ہوا رائفلنگ رینج میں آ گیا تھا اور ہمیں بالکل پتا نہیں چلا۔“

جیف کا چہرہ مت گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رونے کے چند کسکے دے کر ایک ایسا عفریت حاصل کر لے گا جو اس کے بچے کے قاتلوں سے اتنا بھیانک انتقام لے رہا تھا۔ میک نے رک کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اتنی وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

ایک ماورائی کردار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آتا ہے جن پر نشان لگایا جائے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں آیا ہے؟“ ”میں نہیں جانتا۔“ جیف نے آہستہ سے کہا۔ ”اب یہ کچھ ہے۔“

”یہ نہیں مرا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”یہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس کا مشن پورا نہیں ہو جاتا یا اس کا ماسٹر نہیں مر جاتا۔“

جیف چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کیا اس عفریت کا ماسٹر وہ تھا؟ اس نے ایملی سے کہا۔ ”لگتا ہے تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ اس کا ماسٹر کون ہو سکتا ہے؟“

”وہ جس کا خون اسے زندگی بخشتا ہے۔“ ایملی بولی۔ اس دوران میں میک عفریت کے پاس چلا گیا تھا۔ رک نے اس سے کہا۔

”آگ مت جاؤ۔“ ”میک اوپس آؤ۔“ ایملی بولی۔ ”یہ میرا نہیں ہے۔“ میک نے رائفل کی نال کا رخ عفریت کے بڑے سر کی طرف کر کے گولی چلا دی اور ان کی طرف دیکھا۔ ”اب یہ مر چکا ہے۔“

مگر ایسے لمبے عفریت نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر گر گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا عفریت نے اٹھتے ہوئے اس سے رائفل جھین لی۔ رک اور ایملی چلا رہے تھے۔ جیف نے دوبارہ شاٹ گن عفریت کی طرف سیدھی کی تھی کہ اسے جھٹکا سا لگا اور ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے ڈھلنے لگا۔ عفریت نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے رائفل میک کے سینے کی طرف کی لیکن گولی چلانے کے بجائے اچانک رائفل کی نال بہت قوت سے اس کے سینے میں اتار دی اور پھر اسے نال میں پر کر کر اوپر اٹھالیا۔ رک چلا یا اور میک کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ایملی اس سے چٹ گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر اس سے وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت دم توڑتے میک کو اوپر کیے ہوئے اپنی مخصوص شیطانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ جیف چکر کر گرا تو عفریت نے میک کو رائفل سمیت ایک طرف پیسٹک دیا۔

ایملی اور رک ایک طرف بھاگ نکلے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان اندھا دھند دوڑ رہے تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ایملی کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں اور رک بھی بھائی کا سوگ منا رہا تھا مگر وہ انہیں نہیں کہتے تھے۔ وہ ان کے پیچھے چلے اور انہیں ہر صورت عفریت سے دور جانا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ شاٹ گن کی مہلک گولیاں بھی اس کا پتہ نہیں لگا سکتی تھیں۔ ایسے میں اس کے سامنے رکنا محافط اور خودکشی ہی ہوئی۔ اچانک انہیں کچھ دور روشتیاں نظر آئیں۔ ایملی نے کہا۔ ”وہ..... اس طرف آبادی ہے۔“

وہ بھاگتے ہوئے اس قصبے تک پہنچے جو تہ در تہ حلال پر آباد تھا۔ یہاں مکان قدیم طرز کے تھے اور خاصے شہر حال تھے۔ گاڑیاں بھی پرانی کھڑی تھیں۔ ایملی نے راپتے میں آنے والا پہلا دروازہ بجایا اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ مگر اندر سے کوئی جواب ملنے کے بجائے مکان کی روشتیاں بھی بند ہو گئیں۔ رک اور ایملی دوسرے مکانوں کی طرف بڑے۔ وہ باری باری دروازے بجارہے تھے اور اپنے اوپر گزرنے والی روداد سنا تے ہوئے پناہ مانگ رہے تھے۔ مگر کسی مکان سے نہ کوئی نکلا اور نہ ہی کسی نے جواب دیا۔ وہ رابرٹ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اندر پیچھے کے کمرے میں موجود بڑے نے اپنی بہن مار یا سے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں ہارلے کے اسٹور پر ملے تھے۔“

ڈبل فلورائید، ڈبل طاقت دو محافظ، دہری حفاظت

FREE
Toothbrush

Liquid Cavity
Protection

Cavity Protection All Day Long

English
Fluoride Toothpaste
Supermint

English
Toothbrush

EBP-02-14

25
کریکٹ کی بیٹنگ

قدم رکھا، وہ تینوں دوسری سمت سے نکل بھاگے۔ رک
آگے تھا اور وہ ایسی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ بریڈ ان کے
پیچھے تھا۔ وہ اب پیچ کی طرف جارہے تھے۔ تیز ہوئی وجہ
سے مٹی اڑ رہی تھی اور انہیں آنکھیں کھولے رکھنا بھی مشکل
ہو رہا تھا مگر وہ نہ تو رک سکتے تھے اور نہ آنکھیں بند کر سکتے
تھے۔ اس لیے تکلیف برداشت کرتے اور گرتے پڑتے
بھاگے جارہے تھے۔ جیسے جیسے وہ پیچے آرہے تھے، دلدلی
زمین کم ہوتی جا رہی تھی اور درختوں کے بجائے خشک
صحرائی جھاڑیاں زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں کہیں
کہیں اکا دکا درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ ایسی نے ہانپتے
ہوئے کہا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہمیں کسی سڑک تک یا ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں
سے ہم پولیس کو کال کر سکیں۔“ رک نے جواب دیا اور سڑک
دیکھا۔ بریڈ ان سے کچھ دور تھا۔ کیونکہ عفریت نظر نہیں آ رہا
تھا اس لیے انہوں نے رفتار ڈرام کر لی۔ ورنہ اس سے پہلے
سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی ہمت جواب
دے گئی تھی۔ بریڈ ان کے پاس آگیا۔ اس نے ہانپتے
ہوئے کہا۔

”رک! ہمیں یہاں سے فوراً نکل سکتے ہیں۔“

نکل جاؤ۔“ مگر کیسے؟ ہم مسلسل نہیں بھاگ سکتے اور یہاں کوئی
گاڑی نہیں ہے۔“

”وہ رہی گاڑی۔“ بریڈ نے دور سڑک پر کھڑے
جیف کے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس کی طرف
بھاگے۔ ان کا خیال تھا کہ جیف بھی ٹرک میں ہوگا مگر ٹرک
خالی تھا۔ وہ تینوں ٹرک کے کہیں میں گھسے۔ انہیں میں چابی
نہیں تھی۔ انہوں نے تلاشی لی تو ڈیش بورڈ کے خانے سے
ایک اضافی چابی نکل آئی۔ رک نے جلدی سے اسے انہیں
میں لگایا اور تھمرا کر انجن اسٹارٹ کیا تھا کہ اس کی طرف کا
شیشہ ٹوٹا اور عفریت کا ہاتھ اندر آیا۔ اس نے رک کا سر پکڑا
اور اسے کسی کھلونے کی طرح باہر کھینچ لیا۔ ایسی چلانے لگی۔
وہ دوسری طرف سے اترنے لگی مگر بریڈ نے اسے پکڑ لیا۔
”نہیں، وہ اسے لے گیا ہے۔ تم بھی ماری جاؤ گی۔ ٹرک
اسٹارٹ ہے۔ یہاں سے نکلو۔“

ایسی کی حالت بری تھی مگر بریڈ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ
انہیں یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ رک کی کوئی مدد نہیں کر سکتے
تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ

اسے دوسرا سیٹ پر لگا تھا۔ چاک اس کا سر ڈولے لگا اور
آنکھوں کے آگے مائل سرخ سا ہو گیا۔

☆☆☆

بوڑھی میگاٹ آنکھیں بند کیے زیر لب کہہ رہی تھی۔
”میرے بچے، اب وقت آگیا ہے۔ تم ہمیشہ کی زندگی
حاصل کر لو گے۔ بس دو شکار اور ہیں۔ اس کے بعد تمہیں پھر
کوئی نہیں مار سکے گا اور اس علاقے پر تمہاری حکومت ہوگی۔
یہاں کا ہر شخص تمہارا غلام ہوگا۔“
یہ کہہ کر میگاٹ کچھ پڑھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ
یہاں بیٹھ کر عفریت کی رائیٹائی کر رہی ہے۔

☆☆☆

ایسی کی چوچ نکل گئی۔ وہ ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک
آگیا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا
ہوگا۔“

رک اس سے متفق تھا۔ اس نے بریڈ سے
کہا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ یہ یہاں تک نہیں آسکے گا مگر یہ
آگیا ہے۔“

”یہ شاید اندر نہ آسکے۔“ بریڈ نے ہنٹوں پر زبان
کھینچ کر انہیں خود پس کے بارے میں نہیں جانتا صرف
دوسروں سے سنا ہے۔

عفریت چرچ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب
میں مسلسل بجتی چمکنے سے ماحول ٹینگوں روشنی میں نہایا ہوا لگ
رہا تھا۔ ایسی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اشارہ
کیا۔ ”اس کا چہرہ دیکھو، پہلے یہ درندوں جیسا تھا مگر اب اس
پر انسانوں جیسے نقوش آ گئے ہیں۔“

رک نے غور کیا تو واقعی اس کا چہرہ اب انسانوں جیسا
ہو رہا تھا۔ اسے اس کے نقوش جانے پہچانے لگ رہے
تھے۔ چاک وہ بولا۔ ”میرے خدا! اس کا چہرہ تو مسٹر
ہارلے جیسا ہو رہا ہے۔“

”تب یقیناً اسے جیف ہارلے کے خون سے زندہ کیا
گیا ہے۔“ بریڈ بولا۔ ”وہی اس کا ماسٹر ہے۔“

”یعنی وہ اسے قابو کر رہا ہے۔“
”نہیں، ماسٹر سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی جیف کی
وجہ سے ہے۔ جب تک جیف زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہے گا اور
جیف مر جائے گا تو وہ بھی مر جائے گا۔“ بریڈ نے کہا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ رک چلا یا کیونکہ عفریت آگے
بڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ ہچکچا رہا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ
اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی اس نے چرچ کی حدیں

سنبھالی اور گیتنگ کر ڈک آگے بڑھا دیا۔ بریڈ مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس نے دیکھا کہ عفریت رک کو سر سے پکڑ کر پھینکا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”جلدی کرو، وہ پیچھے آ رہا ہے۔“

یہ راستہ جیف کے قارم کی طرف جا رہا تھا اور چند منٹ بعد وہ قارم تک پہنچ گئے۔ بریڈ نے اسمبلی کو بتایا۔ ”یہ جیف کا قارم ہے۔“

”شاید وہ یہیں ہے۔“ اسمبلی نے ٹک روک دیا۔ ”وہی اس عفریت کو زندہ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اب جیف کو ہی اسے روکنا ہوگا۔“

وہ دونوں نیچے آئے اور پھر اسمبلی کا کھلا دروازہ دیکھ کر آگے بڑھے۔ اندر معمولی سی روشنی تھی اور کہیں کہیں اندھیرا تھا۔ بریڈ نے آواز دی۔ ”مسٹر ہارلے... کیا تم یہاں ہو؟“

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اسمبلی آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ جیف ایک کونے میں کھڑا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جیف.....“

”تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“ جیف مڑے بغیر بولا۔ ”وہ آواز اچانک ہوئی۔ اسمبلی نے دیکھا کہ اس کی آواز عجیب سی ہو رہی تھی۔“

”ہم کہاں جایں؟ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ اسمبلی بولی۔ ”وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے رک کو بھی پکڑ لیا ہے۔“

جیف اس کی طرف مڑا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”صرف تمہارے افسوس سے کام نہیں چلے گا۔“ اسمبلی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے اسے زندہ کیا ہے اور اب تم ہی اسے مار سکتے ہو۔“

”میں اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔“ جیف نے سیلنڈر کا آخری نٹ بھی لگا دیا اور اس کا نوزل پائپ اٹھا کر اسے تیلی سے آگ دکھائی۔ فوراً ہی سرسرا تا ہوا تیز شعلہ نوزل سے نکلنے لگا۔ ”میں اسے جلا کر ختم کر دوں گا۔“

”شاید آگ اسے ختم کر دے۔“ اسمبلی بولی۔ ”اس کی اصل موت بھی جلنے سے واقع ہوئی تھی۔“

جیف نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”مجھے بریڈ نے بتایا ہے۔“ اسمبلی نے کہا اور مڑ کر دیکھا۔ ”وہ میرے ساتھ ہے۔“

مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بریڈ شاید بھاگ نکلا۔

تھا۔ باہر اب بجلی بہت تیزی سے چمکنے لگی تھی۔ جیف نے باہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ آگیا ہے۔“

اس نے سیلنڈر اٹھا کر نشانے پر ٹانگا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اسے پکڑا تا شروع ہو گئے اور وہ خود کو گرے سے بچانے کے لیے میز کا سہارا لے کر اس پر جم گیا۔

بریڈ نے عفریت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسمبلی سے نکلا اور اس کے برابر میں موجود اسٹور روم میں گھس گیا۔ عفریت نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ زخمی اور نیم بے ہوش تھا۔ اسٹور کا دروازہ بجا تو عفریت نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اسٹور کی طرف بڑھا۔ بریڈ اندر گھس کر ایک الماری میں چھپ گیا۔ اس کا روال روال کا پ رہا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کوئی آواز نہ نکلے۔ اسٹور کا دروازہ آواز سے کھلا اور

الماری کے دروازے کے رختوں سے بریڈ نے عفریت کا بڑا سا سر اندر آتے دیکھا۔ اس پر انسانی خدو خال بہت نمایاں ہو گئے تھے اور یہ تقریباً جیف جیسے تھے۔

فرق صرف سلاخی مٹی سرخ کھال اور سائز کا تھا۔ اس کا سر کسی بھی انسانی سر سے دو گنا بڑا تھا۔ اس کی آنکھیں مڑک رہی تھیں۔

تھا۔ اچانک باہر سے اسمبلی کے چلانے کی آواز آئی تو عفریت نے سر گھما کر دیکھا۔ اسمبلی نے رک کو دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ عفریت غرایا اور اس نے اچانک الماری کا دروازہ کھول کر بریڈ کو باہر پھینک دیا۔

وہ خوف سے بچا اٹھا مگر عفریت نے اسے کچھ کہا نہیں۔ صرف کھینچتا ہوا باہر لایا اور میدان کی طرف پھینک دیا۔

اسمبلی نیم بے ہوش رک کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بریڈ اٹھ کر ایک طرف بھاگ مگر عفریت نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اسمبلی اور رک کی طرف بڑھا۔

اسمبلی چلا رہی تھی اور رک سے ہوش میں آنے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت کو نزدیک آتے دیکھ کر اسمبلی نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا۔ عفریت نے اسے سر سے پکڑ کر اٹھ لیا۔ اسمبلی اسمبلی کی طرف بھاگی جہاں جیف ابھی تک بیٹھ

پر جمنا ہوا تھا۔ اسمبلی نے چلا کر کہا۔ ”خدا کے لیے وہ رک مار دے گا۔“

مگر جیف میز پر جمنا ہوا عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اسمبلی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھی۔ ”جیف! جیف! سن رہے ہو؟“

جیف نے جواب نہیں دیا۔

سب سے ڈانچسٹ

جنوری 2015

”ہاں۔“ جیف نے عجیب سی آوازیں نکالیں اور اچانک سمجھا تو اسمبلی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ جیف کی آنکھیں بالکل عفریت جیسی ہو رہی تھیں اور چہرے کے تاثرات حیوانی تھے۔ ”اب بس تم بچتی ہو۔“

اسمبلی باہر کی طرف بھاگی۔ جیف اس کے پیچھے نکل آیا تھا۔ اس نے سیلنڈر اٹھا رکھا تھا وہ عفریت کی طرف بڑھا مگر وہ عفریت کے لیے نہیں جا رہا تھا۔ اس نے نوزل کا شعلہ تیز کیا اور آگے بڑھا تھا کہ اس کا ہاتھ وہاں دسے کے بل زمین میں گرے گا۔ اسے نکلنا پڑا اور اس کا ٹانگہ اس کی

کلائی میں گھس گیا۔۔۔ یہ گندم اور ریشے الگ کرنے کے کام آتا تھا۔ جیسے ہی کاٹا جیف کی کلائی میں گھسا، عفریت نے دھاڑ ماری اور اپنا ہاتھ دیکھا۔ اسی ہاتھ سے اس نے رک کا سر تھا ہوا تھا۔ اس سے سر چھوٹا تو رک پیچھے گرا اور

ریٹک کر اس سے دور جانے لگا۔ جیف کو درد کا احساس ہوا تو اس نے اپنی کلائی دیکھی اور پھر اسے آزاد کرانے کے لیے کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ بازو ہلا رہا تھا، عفریت کا بازو بھی ویسے ہی ہل رہا تھا۔ کوشش میں ناکامی کے بعد جیف نے سیلنڈر اتار پھینکا اور پھر دوسرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنا پھنسا ہوا ہاتھ کانٹے سے نکال لیا۔

اسمبلی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے دو ٹوک سیلنڈر اٹھا لیا اور شعلے کا رخ عفریت کی جانب کر دیا۔ جواب اسمبلی کے پاس آ رہا تھا۔ شعلے اس سے ٹکرانے لگے اس پر

کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیف ہاتھ تھام کر لوٹھراتا ہوا اسمبلی کی طرف چلا گیا۔ اسمبلی پیچھے ہوتے ہوئے عفریت پر شعلے پر ساری مٹی اور یہ آگ اس کا کچھ گاڑنے سے قاصر تھی۔ اس کی صورت بالکل جیف جیسی ہو گئی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ مارا اور اسمبلی کے ہاتھ سے پائپ نکل گیا۔ اس نے گردن سے دو بوج کر اسمبلی کو آگے

کھینچا اور اس کے شانے سے سیلنڈر اتار لیا۔ پھر اس نے پائپ اٹھا لیا جس سے بدستور شعلہ نکل رہا تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اسمبلی کو دیکھا تو وہ اس کے عزائم بھانپ کر لرز اٹھی۔

جیف لوٹھراتا اور کراہتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اندرونی والی دروازہ کھولی اور اس میں دکھا ہوا چھوٹا سا روم نکال لیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا اور پھر اندر سے لگا کر قاز کر دیا۔ قاز کی آواز باہر تک آئی اور عفریت جس نے اسمبلی کا گلا دیو جا ہوا تھا اور شعلہ اس کے چہرے کی طرف لا رہا تھا، اس نے عجیب سی آواز نکالی اور نیچے گر

کر گیا۔

جیف نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

کر ساکت ہو گیا۔ اسمبلی لوٹھڑا کر پیچھے ہٹی اور اپنی سانس بحال کرنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ عفریت اچانک کیوں گرا اور اندر سے قاز کس نے کیا تھا۔ گولی عفریت کو نہیں لگی تھی اور لگتی بھی تو بیکار تھی کیونکہ اس پر گولی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں اندر سے جیف لوٹھڑاتے قدموں سے

باہر آیا اور اسمبلی کے سامنے زمین پر بالکل اسی انداز میں ڈبیر ہو گیا جیسے عفریت گرا ہوا تھا۔ اسمبلی نے دیکھا اس کا چہرہ بھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ اس کی کپٹی بھی گولی کا سوراخ تھا مگر وہ ابھی زندہ تھا۔

اب اسمبلی کی سمجھ میں آیا کہ عفریت کیوں گرا تھا۔ یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے باسٹر کی موت تک زندہ رہتا تھا اور اب اس کا ماسٹر نے والا تھا اس لیے وہ بھی مر رہا تھا۔ اسمبلی نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ سے ریمو اور نکال لیا اور اس کا رخ جیف کی طرف کر دیا۔ وہ ہمت کر رہی تھی کہ اس پر گولی چلائے۔ اچانک جیف نے حرکت کی۔ اس نے سر اٹھا کر اسمبلی کی طرف دیکھا اور

بولا۔ ”اسے مار دو۔“

جیف کا ہاتھ عفریت کی طرف اٹھا ہوا تھا مگر جب عفریت اچانک اٹھا تو اسمبلی کی سمجھ میں آیا۔ جیف عفریت

نے کہا کہ وہ اسے مار دے۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

اس نے اسے دیکھا۔

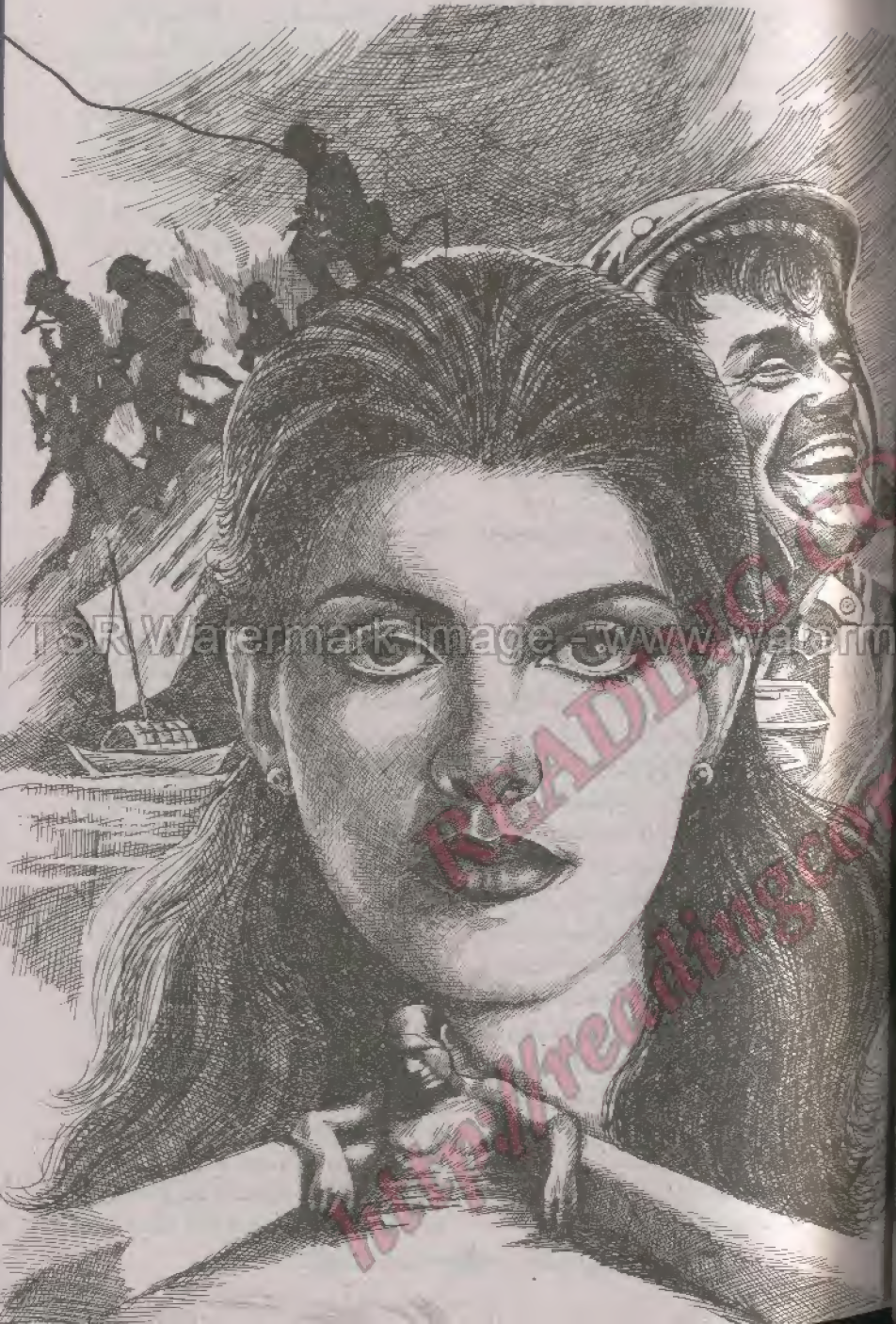
اس نے اسے دیکھا۔

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف رہے ہیں۔ اس رپے کائنات کا بھٹی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعون کی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سیناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی بلفاں ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے پیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی۔۔۔ جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی بے ذہکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن۔۔۔ آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں۔۔۔

اجلی رنگت اور مکروہ چروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لڑخیز منظر



”کیا مطلب..... کیا اس میں ہمارا قصور ہے؟“ اس بار نامہ نے شیخ رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے ترقی سے کہا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ شیخ خود اسرائیلی خفیہ اہل جس موساد کا ہی جاسوس تھا، ابھی ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی کہ ایک غصے قد کا مگر چوڑے اور مضبوط شانے والا شخص چار اسرائیلی پولیس اہلکاروں کے ساتھ وہاں آکر پہنچا۔ یہ اسرائیلی پولیس چیف تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کھنڈی ہوئی تھی اور چندی چندی آنکھوں میں مکاری دکھوے لے رہی تھی۔ جب نامہ اور عابد نے بھی اس سے بحث میں الجھنا چاہا تو اس نے تعبیر اور کرحت آواز میں ان سے قہقہا اٹھایا۔

”ہم آپ کو مجرم کی حیثیت سے پھانسیاں ڈال کر نہیں لے جا رہے ہیں..... ضابطہ کی ایک معمولی کارروائی کے بعد آپ کو اسی طرح باغزت طریقے سے یہاں دوبارہ پھوڑ دیا جائے گا۔“

ناچار دونوں کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس دوران جب عابد اور نامہ پولیس چیف کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے، شیخ رمضان نے معنی خیز نظروں سے اسرائیلی پولیس چیف کی طرف دیکھا۔ پولیس چیف کے بدہیت ہونوں پہ بڑی نصیحت مسکراہٹ تھی۔

”موساد کے کسی ذمہ دار اہلکار سے رابطہ کر کے اسے نامہ اور عابد سے متعلق تازہ ترین رپورٹ دینے لگا۔ اس رپورٹ کے اختتام کے چند منٹوں بعد موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ فوراً حرکت میں آگئے، ان میں دو ایجنٹ وہ بھی شامل تھے جنہوں نے قبرص میں سیما سول کی بندرگاہ میں دو جلاوطن فلسطینی آفیسروں احسن الزہرونی اور ابو جواد اعزیر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

منصوبہ یہ تھا کہ یہ پانچوں اسرائیلی ٹاپ ایجنٹ فلسطینی حریت پسندوں کے گھیس بھر کے پولیس کی اس جیب پر حملہ آور ہوں گے اور نامہ اور عابد کو ان کی کسٹری سے چھڑا کر... فی الفور موساد کے ہیڈ کوارٹر کا رخ کریں گے اور مشہور کر دیا جائے گا کہ یہ کارروائی حریت پسند تنظیم بی فرٹ کے کمانڈر کی تھی جبکہ اس ”ڈرائے“ کا پہلے سے ہی مذکورہ اسرائیلی پولیس چیف کو بھی پتا تھا اور محض عذرہ ڈرائے میں رنگ بھرنے کے لیے وہ ان کا جعلی مقابلہ بھی کریں گے۔ مقصد یہی تھا کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ نامہ اور عابد کو ایک سازش کے تحت درحقیقت موساد کی قید میں ڈالا گیا ہے۔ بہر طور دونوں اس کریمہ حقیقت سے بے خبر تھے، سفر اپنے

ہونے کے نصف گھنٹے بعد شمال جنوب کے ”ریڈ زون“ میں داخل ہو چکے تھے، جمال ٹرک ذرا نیچے رہا تھا اور باقر اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ان کے جسموں پر ان دونوں جہنم واصل اسرائیلی فوجوں کی وردی بھی اور ایک بڑا امتحان ان کے سر پہ تھا۔ اب کسی بھی وقت وہ اس مورچہ چڑھ چکی تک پہنچنے والے تھے، جسے ابھرے ”پوائنٹ تھری“ کا نام دیا تھا۔

پوائنٹ تھری کی بیتیاں دور سے چمکی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور دونوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے اور اعصاب تن چکے تھے، فوجی نوپیاں انہوں نے دانستہ پیشانی سے ذرا نیچے جھکا کر آئی ڈی کارڈز ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ بالآخر جب وہ قریب پہنچے تو انہیں چوکی کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر باہری روک لیا گیا۔ گویا فیصلہ کن گھنٹی سر پہ آچکی تھی۔

☆☆☆

سیما سول بندرگاہ کے قریب واقع ہوئی پورٹ لینڈ کے گیٹ کے قریب جو بھاری گاڑیاں پینگی تھیں، وہ اسرائیلی پولیس کی تھیں..... خنصر کی پریشانی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دونوں عرب مہمانوں نامہ اور عابد مستحق کلاب ہوئی کی انتظامیہ پولیس کسٹری میں دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور خنصر جاتا تھا کہ ان کے دونوں مہمانوں کو اسرائیلی پولیس کے پاس جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس لیے خنصر نے اپنے دونوں ساتھیوں معید اور حارث کی مدد سے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جیسے ہی پولیس نامہ اور عابد کو گردانہ ہوگی، ان پر راستے ہی میں حملہ کر کے انہیں جھڑا لیا جائے گا۔ وہ اپنے اس منصوبے کی غلطی رپورٹ اپنے سیکرٹ ان کمانڈر خالد حسین کو دے چکا تھا۔

نامہ کی طبیعت اب تک کافی سنبھل چکی تھی، پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد وہ خاصی ہراساں رہی پھر عابد شکری کو ساتھ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی مگر عابد خاصا پریشان اور متشکر نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ معاملہ پولیس کا بن چکا تھا اور انہیں دائرہ نقیش میں لانے کے لیے اسرائیلی پولیس کا سامنا کرنا پڑتا..... اور پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے پولیس کی دو گاڑیاں آچکی ہیں تو عابد نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہوش کا شیخ رمضان اپنے چہرے پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ بکھیرے ہوئے عابد سے بولا۔

”آپ دونوں ہمارے معزز مہمان ہیں لیکن مگر آپ کو قانون کے مطابق اس کارروائی سے تو گزرنا پڑے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہاں آپ دونوں ہی کی وجہ سے کس قدر ہنگامہ اور خون ریزی ہو چکی ہے۔“

کر..... برابر کی سیٹ پر بیٹھے اس کے ساتھی نے بھی یہ سب کچھ نظر یاد کیا تھا اور ابھی اس نے بسرعت اپنی گن سیدھی ہی کی تھی کہ ساعت شکن دھماکا ہوا۔ ٹرک کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بدست ہاتھی کی طرح ڈولنے لگا۔ دونوں فوجی بری طرح یوگھلا گئے مگر جلد ہی اپنے حواسوں پر قابو پایا اور ٹرک کو اٹھنے سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بریک لگا دیے۔ گردوغبار کا عقب سے طوفانی بکولا نمودار ہوا جس نے چند ثانیوں کے لیے دونوں کو اندھا کر دیا۔ اس اثنا میں ڈرائیور فوجی نے بھی پھر پھر کے ساتھ اپنا پستول نکال لیا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈرائیور فوجی کی پچھلی چوٹی آنکھوں نے پہلے اپنے برابر میں بیٹھے اپنے ساتھی کا سر تباہ کر دیا۔ انہیں ہوتے دیکھا۔ اسے خاموش پستول کی گولی سے کسی نے نشانہ بنایا اس کا بھیجا کھو پڑی سمیت جھج گیا تھا۔ اس نے پستول سیدھا کیا تو دوسری طرف سے باقر نے اپنے خاموش ریولور کی گولی سے اس کی گردن پر مار کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

نفا ایک لمحے کو یکدم ساکت ہوتی محسوس ہوئی گئی، جیسے کوئی بڑا طوفان گزر گیا ہو..... پانچوں ایک جگہ کھٹے ہوئے۔

”صورت حال خراب ہوتے ہوئے بچی ہے..... لیکن..... تاثر درست ہونے کا دھماکا بھی کم نہیں تھا.....“ لیٹی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”عزیزم لیٹی اب عیوی دھماکا سمجھا جاسکتا ہے۔ شکر ہے کہ گولی کی آواز نہیں ابھری۔“

”دور تک پھیلے تاریک ویرانے میں معمولی دھماکا بھی..... کسی قریبی اسرائیلی چوکی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”ہمیں جلد ہی اپنا کام ٹھنڈا ہو گا۔ جو ہوا کم سے کم ہی ہوا، مزید تاخیر..... منصوبے کے لیے نقصان دہ ہوگی۔“ انجیلد کے قاسم عمر نے بحث کو سینے کی غرض سے کہا اور پھر سب حرکت میں آگئے، حسب توقع ٹرک میں فاضل غازی موجود تھا۔ لیٹی اور باقر چاروں اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھے، دوسرا ساتھی غازی بدلنے میں مصروف ہو گئے جبکہ باقی دو نے اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھایا۔

یہ سارے کام بہت تھکیل وقت میں مشترکہ طور پر ٹھنڈے گئے اس کے بعد منصوبے کے مطابق جمال اور باقر نے اسرائیلی فوجیوں کی وردی پائین کر ٹرک کا ڈرائیونگ کین سنبھال لیا، باقی چار ساتھی ٹرک کے عقبی حصے میں کھانے پینے کے اسباب کی آڑ سے چاہتے۔ ڈرائیور میں ٹرک روانہ ہو گیا۔ یہ لوگ طے شدہ منصوبے ”بلینک پوائنٹ“ سے روانہ

ان کی خوفزدہ نظروں نے دیکھا، ٹرک کی رفتار بجائے کم ہونے کے یکنگت تیز ہوئی تھی۔ یہ ایک خطرناک چوینشن تھی، جو ان کی توقع کے بالکل خلاف بھی تھی، اس طرح ان کے ساتھی کی جان خطرے میں تو تھی ہی، مگر ان کا یہ خفیہ مشن بھی متاثر ہو سکتا تھا جبکہ حالات کا تقاضا تھا کہ..... اس اہم مشن کو انتہائی رازداری کے ساتھ ٹھنڈا جانے لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس ہو گئی تھی۔ اس اعصاب شکن خطرے کی طرف بڑھتی ہوئی صورت حال پر فوری طور پر قابو پانے کے لیے گروپ کی کمانڈر ”لیٹی“ نے ”کرے والی دلیر مجاہدہ.....“ لیٹی آئندہ نے ہل کے مل میں ہی ایک جارحانہ فیصلہ کر لیا اور بجلی کی ہی سرعت کے ساتھ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی..... اور چلائی۔

”سائنس پستولوں سے ٹائر کا ایک ٹائر برست کر ڈالو اور ڈرائیونگ کین بلیٹ پڑو۔“

ٹرک دھڑدھڑاتا ہوا تیزی کے ساتھ سچ راستے پر لیے ان کے ساتھی کی طرف بڑھ رہا تھا، صورت حال کی سفاکی کا احساس اس وقت زیادہ ہوا جب ٹرک دھاڑتا ہوا اس کے عین سر پہ آن پہنچا۔ یہ صرف ایک ہل کے لیے ہوا اور دوسرے ہل کے لیے اب اسے ہل کھٹے کیلئے راستے دونوں ٹانگوں سے بھڑک پوری قوت کے ساتھ راستے سے ہٹ گیا۔ دھماکا دھاڑتے ہوئے ٹرک کے چوڑے موٹے ٹائرس کے بالکل سر کے قریب سے گزرتے چلے گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ٹرک جیسے ایک طرف جھک کر زمیں بوس ہو گیا پھر تاحور کچے راستے پر دوڑ تک گھسنا چلا گیا۔ گردوغبار کا یو قیامت مرغول اٹھا، لیٹی کی ہدایت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے ٹرک کے ایک ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹرک کے رستے ہی ان سب نے بیک وقت ٹرک کے ڈرائیونگ کین پر ہلا بول دیا۔

اسرائیلی ایسی بجلی گھر کو رسد پہلائی کرنے والے ٹرک ڈرائیور بھی عام آدمی نہیں تھے، دونوں تربیت یافتہ فوجی ہی تھے، اول خطرے کو بھانپتے ہی انہوں نے ٹرک کی رفتار آہستہ کرنے کے بجائے مزید بڑھادی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ساتھی کو گن الارٹ ہونے کا بھی اشارہ کیا تھا، ابھی اس کا دوسرا ساتھی سنبھل ہی پایا تھا کہ ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو راستے پر پھینک دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا۔ اس نے لیٹی کو بڑی پھر پھر کے ساتھ راستے کے پیچوں سچ ابھرتے اور پھر لیے ہوئے اپنے ساتھی کو ٹانگوں سے بھڑک کر کھینچے ہوئے دیکھا تو چلا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”ٹائر“

الجماد کے ساتھیوں اور دو پلی ایل ایس او کے محسن اور زبیر کے ساتھ تونانی کی طرف کارزن ہو چکی تھی۔

تونیائی اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت اور بناوٹ کے باعث پہاڑیوں اور گہرے جنگلات پر مشتمل تھا۔ اس کے وسط میں ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر تھا اور وہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جبریل آسزک فرناش اور اس کے نائب منجر ابودشاہک کی پرنسپل رہائش گاہیں بھی تھیں۔ ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ایک قلعہ نما عمارت پر مشتمل تھا۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرح یہاں بھی ایک بڑا منظم فائلنگ کپائل سسٹم موجود تھا۔ جہاں دنیا بھر کے ممالک کے اہم خفیہ رازداروں پر مشتمل کاغذات، ہم فائلوں کی صورت میں موجود تھے، جہاں سے ایک کاغذ کا کلوا بھی اڑانا ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ یہاں کی سکیورٹی کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس عمارت کو خالص جنگی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ یہاں بجلی پڈ، درن وے، طیارے، ایئر ولفنگ ٹائی جیڈ تھنڈر میزائل سے لیس بجلی کا پٹر بھی تھے، یوہی بریگیڈ اپنی ٹائیلن سمیت یہاں تعینات تھی اور چوبیس گھنٹے جو کس رہتی تھی۔

الجماد کے سبھی بھروسہ فروش جانناڑوں کا شب خون مارنا تو یہ ظاہر ایک بڑبڑلے کا خواب ہی نظر آتا تھا لیکن اپنی سرزمین فلسطین کو ان غاصب یوڈیوں کے ناپاک وجود سے خالی کروانے کے آہی کرم اور سوائے جنوں جیسے بلند حوصلوں کے حامل مجاہدوں نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کو قوت ایمانی اور اللہ واحد کی مدد کے سہارے شکست دینے کا عزم محکم کر رکھا تھا۔ سو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے نیک مقاصد سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

زہیدہ کو ڈیوڈ اسٹار کی قوت کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے گروپ پی کے مشن کو سب سے زیادہ اہم کام سمجھا تھا کہ وہ صحرائے نجف میں ڈیمون اسٹیجنگی جگہ (ریسرچ پلانٹ) کو اڑانے کی کامیاب کوشش کر ڈالے تو ایکٹ پورا... یروٹلم اور تل ابیب نہ صرف گھناؤں تاریکی کی زد میں آجائے بلکہ گریٹر اسرائیل کے پلان کا اہم ترین جزو کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور بے غرضے تک اسرائیل کی کمرٹوت کر رہ جاتی۔ جیسا کہ مذکورہ اسٹیجنگی گھر کی آڑ میں ایک ان ڈائریکٹ خفیہ معاہدے کے تحت فرانس کی مدد سے اسرائیل یہاں بجلی گھر کی آڑ میں یورپیہ افروڈ کی کا پلانٹ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح وہ اسٹیجنگی ہتھیاروں کے سلسلے میں طویل عرصے تک خود کفیل ہو جاتا۔ اس کی کامیابی کے بعد اگلا مرحلہ کیمیا کی اور جراثیمی ہتھیار بنانے کا تھا۔

تھا کہ جام شہادت نوش کرنے والے وہ تینوں مجاہد انہی کی وجہ سے اسرائیلی پولیس ٹیم سے نکلے تھے۔ وہ یقیناً انہیں اسرائیلی پولیس کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے، ان سب باتوں کے باوجود عابد شیکری کو یکلخت ہی کسی گہری سازش کی پیموش ہوئے لگی، اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا احساس دلارہی تھی، کچھ ہونے والا تھا۔

مطلوبہ مقام پر گاڑی پہنچنے ہی موساد کے پانچوں ٹاپ ایجنٹ حرکت میں آئے۔ وہ ایک بندوبست میں تھے جس کا رنگ سیاہ تھا، ایک دوسری ڈیلی سڑک سے اچانک ہی یہ سیاہ فاس وین نمودار ہوئی اور سڑک کے پیچوں سچ اس طرح کھڑی ہوئی کہ آنے والی پولیس گاڑی کا راستہ بلاک ہو چکا تھا۔ پانچوں ایجنٹ جنہوں نے سروں پر عربی صاف باندھ رکھا تھا اور ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ فائرنگ کر کے پہلے پولیس گاڑی کے ٹائر برست کر دیے اس کے بعد سب کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ دکھاوے کی خاطر اسرائیلی پولیس اور ان کے چیف نے برائے نام حمایت بھی کی مگر پھر انہوں نے نامہ اور عابد شیکری کو ان کے حوالے کرنے کا درست حکم دیا۔

یہ سہارا ڈراما درشتہ طور پر شہر کے معروف اور معروف جہاز سے انجام دیا گیا تھا اور اس دوران موساد کے ایجنٹوں کے ہوائی مارنگ بھی کی گئی تھی، جس کے وہاں اطراف میں خاصی جھلکڑی مچ گئی، نیز انہوں نے یہ آواز بلند مخصوص قسم کی فلی اور اسلامی نعرے بھی بلند کیے تاکہ ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر دیا جائے۔

اگلے چند منٹوں کے بعد یہ پانچوں ٹاپ ایجنٹ نامہ اور عابد کو اپنی گاڑی میں ڈالے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نامہ خوش تھی کہ مجاہدوں کے دوسرے گروپ کو کامیابی ہوئی تھی لیکن عابد شیکری کا معاملہ اور تھا۔ وہ پہلے ہی خطرے کی بوکھڑے چکا تھا اور پھر بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوئی لیکن سب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ان سے کوئی سوال کرتے ان کے چہروں پر ایک مخصوص جھلک کا سپرے کر دیا گیا۔ دونوں بے سندھ ہو کر لڑھک گئے، دونوں کو دین کی منجی سیٹوں پر لٹا دیا گیا۔

☆☆☆

”الجماد“ کی لیڈر زہیدہ قیسری کا ”گرینڈ پلان“ کے عمل کا دارومدار اگرچہ گروپ پی کی کامیاب کارروائی پر منحصر تھا لیکن ایک مقررہ وقت تک اس کے بعد زہیدہ نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دینا تھا۔ وہ اپنے پانچ

کے بیک وقت چار برست ان کی کار پر پڑے۔ حارث کی گردن میں دو گولیاں پیوست ہو گئیں وہ موقع پر ہی جام شہادت نوش کر گیا۔ کار کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے لڑھک جانے کے باعث کار نے لہراٹا شروع کر دیا۔ خسر کے شانے میں تین گولیاں لگی تھیں جبکہ معید غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے جھک گیا تھا۔ اس وقت کار کا ٹائر بلاست ہو گیا۔ عام ٹریک روال تھا۔ کار ڈول رہی تھی، معید چونکہ حارث کے برابر والی سیٹ پر براہمن تھا اس لیے اس نے فوراً اسٹیرنگ پر مقدور بھر گرفت جمانے کی کوشش چاہی مگر کار کا ایک ٹائر برست ہونے کے باعث اس کا توازن بڑھ گیا۔ وہ پہلے تین باری تھی، معید کو اپنا مشن ناکام ہوتا محسوس ہوا تو اسے اور تو کچھ نہ سوچا۔ اس نے فوراً اسٹیرنگ بائیں جانب موڑ دیا۔ نتیجتاً اس کی ڈوٹی ہوئی کار ایک دھماکے سے پولیس گاڑی سے ٹکرائی، عقب میں کئی گاڑیوں کے بارن کی پر شور آوازیں ابھرنے لگیں جبکہ دونوں گاڑیاں سچ سڑک پر پھرنے کی طرح گھومتی گئیں اور سڑک کے کنارے کی سیٹھ منڈیر توڑتی ہوئی گھاس کے میدان میں جا گئیں۔ معیدہ نے اپنی گن سنبھالنے ہی فائرنگ کی جبکہ عقب کی سیٹ میں موجود خسر ڈی حالت میں پڑا تھا۔ نامہ شیکری کو سر پر بھانپتے ہی وہ اپنی گن سنبھالنے لگا۔

پولیس گاڑی میں موجود نامہ اور عابد شیکری بری طرح پریشان اور متوش تھے جبکہ اسرائیلی پولیس نے پھرتی کے ساتھ اتر کر معید کی کار کو فائرنگ کر کے چھٹا بنا ڈالا۔ خسر اور معید موقع پر ہی دم توڑ گئے، تھوڑی دیر بعد یہودی پولیس چیف ڈائریکٹ سیٹ پر ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کر رہا تھا۔ اس کے ذرا دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی، نکلانے کے باعث گاڑی کی ایک سائڈ پر خاصا بڑا ڈیٹ پڑ گیا تھا۔ نامہ کار کے مقابلے میں یہ گاڑی بڑی اور مضبوط تھی، اس لیے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا، اندر موجود پریشان حال نامہ اور عابد پولیس چیف سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن وہ ان کے جوابات آنا کافی سے دے رہا تھا، وہ جلد سے جلد اس مقام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا جس پر ایسا ہی ایک جملی ڈراما ”پلے“ کیا جانے والا تھا، اندر سے یہ مکار یہودی خزاہ پولیس چیف مسرور تھا کہ کار والے ان تینوں حریت پسند مجاہدوں کے ناکام حملے کے باعث ان کے اگلے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر جائے گا۔

جبکہ یہاں تک تو نامہ اور عابد کو بھی اندازہ ہوئی چکا

اند کی طوفان بلا خیز چھپائے یہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔ اور خسر اپنے دونوں مجاہد ساتھیوں معید اور حارث کے ساتھ ایک کار میں ان دونوں پولیس گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی تعاقب میں لگ گیا۔ ان کے شاید سان ولمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ عین ایسا ہی ایک خطرناک منصوبہ موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ بھی... فلسطینی حریت پسندوں کے گیمس میں بنا چکے تھے چونکہ ان کا منصوبہ طے شدہ تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں گاڑیاں کس وقت اور کہاں سے کس راستے سے گزریں گی، اس لیے اس Fake Action کے لیے وہ پہلے ہی سے گھات لگائے موجود تھے۔

سفر جاری تھا۔ پورٹ روڈ پر گاڑیوں کا رش تھا، تاہم پولیس کی دونوں گاڑیاں تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی دوڑتی جا رہی تھیں، اور ان کے لیے راستہ صاف اور آسان تھا۔ ان کے تعاقب میں ذرا فاصلے سے پی فرنٹ کے تینوں مجاہدوں کی کاررواں دواں تھی، ایک برج پارکر کے نیچے کھلی اور کم رش والی جگہ پر سڑک نوے ڈگری کے قوس نما موڑ پر تھی۔ حارث نے کار کا اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا کیلیم ردو لائن تبدیل کی اور اسی وقت عقبی سیٹ پر براہمن خسر کے لیے ایک نیا نقشہ آگے بڑھ گیا۔ گاڑیوں کا توازن سنبھالنے کی بجلی گاڑی تھی، نشاندہیے ہی اس نے ٹریک میں پس کیا۔ دھوکے کی کثیر چھوڑتا ہوا راکٹ فائر ہوا اور سنسناتی ہوئی لہر کے ساتھ پولیس گاڑی کے درمیان جاکے لگا۔ ایک دھماکے سے گاڑی کے پرچے اڑ گئے، آگے والی گاڑی کی رفتار یکدم تیز ہوئی مگر اس میں سے فائرنگ شروع ہوئی۔ اس گاڑی میں پولیس چیف اور نامہ اور عابد شیکری موجود تھے، نیز ڈائریکٹر سمیت چار پولیس اہلکار بھی سوار تھے، دھماکے کی آواز اور سٹ کا انہیں پوری اندازہ ہو گیا تھا، پہلے تو یہ لوگ بھی سمجھے کہ شاید ان کے ”ایٹوں“ نے یہ دھماکا کیا ہوگا لیکن اپنے ساتھی اہلکاروں کی گاڑی کا حشر دیکھ کر انہیں ”خطرے“ کا احساس ہوا تھا۔ پھر یہ ان کے ”ایٹوں“ کا ”حملہ“ کرنے کا اصل مقام بھی نہ تھا۔ جو ظاہر ہے پہلے سے طے شدہ تھا۔ تاہم یہ ان کی غیر معمولی چابک دستی اور بیدار مغزی کا نتیجہ تھا کہ ان کی فکری مگر متلاشی نظروں نے جلد ہی اس ہلکے نیلے رنگ کی کار کو دیکھ لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اب ان تین کارسواروں میں سے دو کو گنیں بھی کھڑکی سے باہر سیدھی کرتے دیکھ لیا تھا۔ پھرتی کا مظاہرہ پولیس گاڑی سے پہلے کیا گیا اور ایک ساتھ چار گنیں گری گئیں۔ خسر اور اس کے ساتھی پہلے بھی نہیں پائے تھے کہ گولیوں

ایک برست فائر ہوتا۔ لیکن کا تیسرا ساتھی بھی اس کی زد میں آ گیا۔ اس کے سینے پر تاریکی لکیر پڑی تو اسے حرکت کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور اس کے طعق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی تھراوے والی تھی۔

”بکر کے اندر بند کر دینا چھو۔ جلدی۔۔۔۔۔ ورنہ چشم زدن میں سب مارے جاؤ گے۔“ لیکن پھر چلائی۔ سب سے پہلے اس نے ہی اپنی کانڈوکت سے ایک دہائی نکال کر بکر کی طرف اچھالا تھا۔ جمال اور باقر نے بھی چشم زدن میں اس کی تقلید کی مگر جمال نے جیسے ہی دہائی بھینچنے کے لیے لیٹے لیٹے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ موت کا رخص کرتی تھری قاتل ریز کی رنج میں اس کا وہ ہاتھ آ گیا۔ اسے ہم اچھالنے کا بھی موقع نہ ملا۔ ایک قاتل برست فائر ہوا جمال کا ہاتھ بھی کی طرف سے اڑ گیا اور وہاں سے خون آلود ٹینڈ مٹر بازو کی پٹی جھانکنے لگی۔ جمال دردی کی اذیت سے تڑپ اٹھا، اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر باقر پرچھے خون سوار ہو گیا۔ اس نے درے مزید دو دینیں ہم بکر کی طرف اچھال دیے۔ وہاں کی دھماکے ہونے لگے۔ سسٹم میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی۔ موت کا رقص کرتی ہوئی قاتل ریز زبچنے لگیں اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو گئیں۔

یہ موقع کی زحمتی ساتھی کو سنہالنے کا نہیں تھا مگر باقر اپنے ساتھی جمال کو اس حال میں چھوڑنا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف دوڑا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ جمال جانتا تھا کہ اس وقت کیا صورت حال ہے۔ اپنے ساتھی پر بوجھ مٹانا مشن کو کھٹائی میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ابھی اس کا دایاں ہاتھ باقی تھا۔ اس نے اس ہاتھ میں گن پکڑ لی۔ بائیں بازو کے وردو۔۔۔۔۔ دانتوں تلے پیچھے کر لی گیا اور باقر سے پیچھے بچتی آواز میں یولا۔ ”تمہیں دوست! میں شیک ہوں۔ آگے بڑھو۔ مجھے نہیں۔۔۔۔۔ مشن سنہالو۔“

لیکن نے اپنے بہادر مجاہد کی یہ وردو جوش میں ڈوبی آواز سن لی تھی، حالانکہ وہ مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کی مالک تھی مگر جمال کی بات پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

خطرناک بکر تباہ ہو چکا تھا۔ پوائنٹ تھری کی چوکی سر ہو چکی تھی مگر گروپ کے تین مجاہد بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے، جبکہ لیکن۔۔۔۔۔ جمال، باقر اپنے ساتھیوں کی قربانی ضائع نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

تینوں آگے بڑھے اور فائرنگ کرتے پلانٹ کے گیٹ تک جا پہنچے۔ وہاں سے بھاری بوٹوں اور وردی پوش

سامنے چوکی پر جدھر سرخ لائٹ ان کے ڈک پر پڑ رہی تھی ایک چان بھی، وہاں موجود چار فوجیوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی گنوں کے منہ کھول دیے مگر اس سے پہلے ہی جمال ٹرک کا ایک سیسلر میز پوری قوت سے دبا چکا تھا۔ ٹرک دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور چنان سے جا کر آیا مگر اس سے پہلے جمال اور باقر بجلی کی پھرتی کے ساتھ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے گر چکے تھے اور سیسلر ہی انہوں نے پوزیشنز سنہال لیں۔ ٹرک چنان کے دوستوں سے ٹکرایا اور چنان بری طرح لرز کر رہ گئی، تاریک فضا میں گولیوں کی دل خراش تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری مگر توازن بگڑنے کے باعث اوپر موجود چاروں فوجیوں کا نشانہ خطا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دو فوجی جو شاید بالکل چنان کی دیوار کے کنارے کھڑے تھے چنان کے بری طرح لرزنے پر نیچے آ گئے۔ حاد اور باقر کی گنوں نے انہیں بھون ڈالا۔ اوپر موجود دو باقی فوجیوں کو ٹرک کے عقبی حصے میں پیچھے ہونے مجاہدوں نے جہنم واصل کر دیا۔ چنان خاموش مضبوطی سے تاہم ٹرک کے ٹکرانے سے تھوڑا جھک کر رو گئی تھی۔

لیکن اپنے تینوں ساتھیوں سمیت ٹرک سے اتر آئی تھی۔ تقاضا اب فوری پیش قدمی کا تھا۔ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، پوائنٹ تھری کو اس کے کے اندر داخل ہونے۔ وہاں چند فوجیوں سے ان کا سامنا ہوا مگر ان کی گولیوں نے انہیں بھی بھون کے رکھ دیا۔ یہ لوگ مزید آگے بڑھے۔ ٹھیک اس وقت انہیں تاریکی لکیریں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ لیکن کا دل اچھل کر حلق میں آن کا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل بجتی۔ ”خبردار! ان کیرول کی زد میں مت آنا۔“

پوائنٹ تھری کے خفیہ بکر میں نصب آٹومیٹک سرچنگ اینڈ لائٹ سسٹم کا لیڈر گا بنڈو فائرنگ میکنزم آن ہو چکا تھا، بدقسمتی سے لیکن کے دوست بھی اس کی زد میں آ گئے۔ اگلے ہی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔۔۔۔۔ اور مذکورہ دونوں ساتھی کرب ناک چبڑوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئے۔ یہ سسٹم اتنا فاسٹ اور خطرناک تھا کہ باقیوں کے لیے ان قاتل تاریکی شعاعوں کی ہلاکت خیزی سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ آگے دوڑ گئیں سازن بھی جیتنے لگا تھا۔ صورت حال بگڑتی تھی مگر اب اس بگڑی ہوئی خطرناک صورت حال میں انہیں کس نہی دوں کی حالت میں ہر صورت اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔

یہ لوگ زمین پر لیٹ کر لوکلٹنا کھانے لگے۔ قاتل ریز کی گنیں خاموش تھیں، مگر جیسے ہی کوئی ان کی زد میں آتا

بھڑ جانے کی صورت میں یہ مشن نامکن حد تک مشکل بھی ہو سکتا تھا۔

ٹرک رکے ہی دو گن بردار وردی پوش اسرائیلی دونوں طرف سے ان کی گنوں کی طرف بڑی مستعدی کے ساتھ بڑھے تھے۔ جمال اور باقر نے اپنے آئی ڈی کارڈز ڈالنے ہاتھ کھڑکی سے باہر کر دیے۔ یہ ظاہر دونوں ساکت تھے مگر انداز سے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے گویا کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانے جیسی خطرناک جوبلیں کو فیس کرنے کے لیے اترتے تھے۔

دونوں فوجیوں نے ایک سر دی نگاہ ان کے نصف ٹوپی سے ڈھکے بشروں پر۔ اور پھر ان کے آئی ڈی کارڈز پر ڈالی۔ باقر کی گنوں کی طرف والے فوجی نے تو کسی حد تک مطمئن ہو کے دھیرے سے اپنے سر کو جیش دی تھی مگر جمال کی طرف والے فوجی کو جانے کس بات کا شبہ ہوا تھا کہ اس نے اپنی گن کی نال سے جمال کے چہرے پر پھینکی ہوئی ٹوپی کو ڈرا دھیرے دھیرے اور پر کیا۔ جمال کی رگوں میں دوڑنے لگی کرش لکھت تھیں۔ چہرہ تدرے واضح ہوا تو اس فوجی نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”اس کا رڈ

میں تمہاری تصویر کیوں بدلی ہوئی ہے؟“

جمال اس سے بے خبر رہے۔ وہ اپنے آپ کو تو پہچانتا تھا۔ پلاٹنل یولا۔ ”سراسر انہی تصویر مجھے لگتی چاہیے مگر تمہیں لگا سکا تھا۔ سوری! اگلی بار اس کی غلطی نہیں ہوگی۔“

”تھویر تو اس کی بھی بدلی ہوئی ہے۔“ معاذ دوسرے فوجی کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا جس نے باقر کا آئی ڈی کارڈ دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلا دیا تھا لیکن پھر مختصر ہنکار پر وہ چونک کر دوبارہ باقر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے نہ صرف آئی ڈی کارڈ کی تصویر چیک کی بلکہ اپنی گن کی نال سے اس کی ٹوپی کو بھی اڑا دیا تھا۔

دونوں فوجی یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ان پر گنیں تان لیں اور پھر انہیں مزید چیکنگ کے لیے پیچھے اترنے کا حکم دیا۔ جمال اور باقر کے دل یکلخت ساتھیوں کی گنوں کی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگے۔ ہر قسم کی متوجہ وغیر متوجہ خطرناک جوبلیں پر انہیں فوری طور پر کیا قدم اٹھانا تھا، یہ طے شدہ تھا لہذا جمال اور باقر نے ان دونوں فوجیوں کی کنپٹیوں پر ایک وقت خون کے چھینٹے اچھلتے دیکھے اور دونوں ہی تھوڑا کر گئے۔

ٹرک کے عقبی حصے میں موجود ان کے ساتھیوں سے خاموش پستول کے ذریعے دونوں کو جہنم واصل کر ڈالا تھا۔

تینوں کی طرف ان کا سرفرات کو شروع ہوا تھا اور یہ دو تیز رفتار گاڑیوں میں ایک مقررہ مقام پر پہنچ کر اتر گئے تھے، دونوں گاڑیاں انہیں ایک کھٹے جنگل اور پہاڑیوں کے سرے میں اتار کر وہاں پلٹ چکی تھیں۔۔۔۔۔ گوریلان مشن تھا اور بہت اہم ترین بھی۔ یہ سب ایک دوسرے کو فالو کرتے ہوئے تاریک کھٹے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے چست کانڈو ڈرائیگ کر رہی تھی اور تھیلاروں کے زیور سچا کر جانیں چھلی پر رکھی ہوئی تھیں خود کوسر سے پاؤں تک کیونقلان کر رکھا تھا۔ اس طرح وہ رات کی سیاہی کا ہی ایک جزو نظر آتے تھے، اس گروپ کی کانڈو بیدہ ہی کے ہاتھ میں تھی جبکہ گروپ میں اپنا نائب اس نے جس کو بھی بنا یا ہوا تھا اور اسے کچھ صوابدیدی اختیار دے رکھے تھے، یہی سبب تھا کہ پیدل تھویر اسفر کرنے کے بعد جب یہ لوگ ایک مقام پر رک کر آگے پیش قدمی کی پلاننگ کرنے لگے تو دشمن نے زبیدہ کو شورشہر دیا کہ انہیں دو مختلف حصوں میں بٹ کر مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ زبیدہ کو اس کی تجویز اچھی لگی۔ وہ پہلے ہی انہیں ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کے محل وقوع سے اچھی طرح آگاہ کر چکی تھی۔ چنانچہ دشمن اور زبیر کے ساتھ المجاہد کے دو ساتھی چال ہو گئے۔ دونوں گروپوں نے ایک ”مٹنگ پوائنٹ“ طے کرنے کے بعد اپنی راہ لی۔ ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ان کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھے۔

تھویر ڈیر بعد یہ دونوں الگ گروپوں میں بٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ ان دونوں گروپوں کو ایک مقررہ وقت میں ہیڈ کوارٹر کے قریب پہنچنا تھا اور بجلی کے شٹ ڈاؤن ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ بالآخر یہ دونوں تھویر ڈیر کی کامیاب گوریلان پیش قدمی کے بعد ہیڈ کوارٹر کے قریب ایک مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

چیکنگ معمول کی تھی، ایڈمنسٹریٹو کے مطابق یہ ڈیوڈ اسٹار ریسرچ پلانٹ کی سب سے اہم چوکی پوائنٹ تھری تھی، جو ایک طرح کا کامیوم تھا جیسی تھی، ظاہر ہے یہاں کی چیکنگ بھی سخت تھی، اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انہیں مطمئن ہو کر آگے جانے دیا جاتا یا پھر کسی مزید تفتیش کے لیے کسی شبہ کی بنا پر وہاں بھی جاسکتا تھا اور یہ دوسری صورت خطرناک بھی ہو سکتی تھی جبکہ سرائے کے مالک دھردہ ابوالنصر نے انہیں اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کا نقشہ سمجھاتے ہوئے تاکید کی تھی، ”پوائنٹ تھری“ سے یہ خبر وعافیت گزر جانے کے بعد ان کا یہ خطرناک مشن نصف حد تک آسان ہو جاتا جبکہ

نہی... اور وہ دھڑا دھڑا شعلوں کی لپٹ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ آس پاس کا ماحول دور تک سرخ رنگی کی قمری روشنی میں نہا گیا تھا۔ پلانٹ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور اپنے ساتھ ان دونوں اسرائیلی جنگی ہیلی کاپٹروں اور ان کے سواروں کو بھی نکل چکا تھا۔

اس عظیم فتح کی خوشی میں مسلمانوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ان میں اپنے ساتھیوں اور بالخصوص جمال کی آخری فیصلہ کن لمحات میں دینے والی بے دریغ قربانی کا جذبہ بھی شامل تھا۔

”اٹھو سچا!..... اللہ نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔“ باقر نے ہولے سے کہا اور پھر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کا دل ابوفر کی سرانے کی طرف تھا۔ ابوفر نے کہا تھا کہ وہ ان کی کامیاب واپسی کا منتظر ہوگا اور موقع ملا تو وہ انہیں لینے کے لیے جی آئے گا اور وہی ہوا۔ انہوں نے ابھی چند فرلانگ کا سفر کیا تو ابوفر ایک اونٹ پر بیڑے میں اٹھیں لینے آئے پہنچا تھا۔ اسے باقی ساتھیوں کی موت کا دھوکہ بھی تھا۔ تاہم خوشی جتنی بھی انہوں نے اسرائیل کی کرتوز دی تھی۔ ان کا مستقبل کا ایک براخیزہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سوتا کرڈالنا تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا کھلم کھلا بھی تیار کیا تھا۔ ابوفر اسرائیل کے چند بڑے شہروں کو ہلکا پلٹا

یہ لوگ یہ خبر وعافیت سرائے پہنچ گئے لیکن ابولہصر نے نہیں رکے نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت یہاں بڑے پیمانے پر تلاشی اور اکٹھا ہجڑا کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے انہیں عرب بدو کا ہمیں بھر کے آگے روانہ کر دیا۔

ان کا رخ بہت صفائی کی پہاڑیوں کی طرف تھا، جہرہ
 "الجبہ" کا خفیہ ٹھکانا تھا۔ اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے کئی
 کو محفوظ اور خفیہ گزرگاہوں کا بہ خوبی علم تھا۔ باقر اور علی
 دونوں ایک اوٹ پر سوار تھے۔ اوٹ سدا ہایا ہوا تھا جو
 مسافر کو چھوڑ کر خود ہی واپسی کا رخ کرتا ہے۔ خشک ویران
 تاریک رات دے پے پاؤں سرک رہی تھی۔ اوپر تاروں
 بھرے آسمان پر کلاطابق چاند گرہن میں غلٹائی چاندنی
 چمکھار کر رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے تاہم دل ہی دل میں
 پریدہ اور اپنے ساتھیوں کی ہم کی کامیابی کی دعا مانگ رہے
 تھے۔ باقر کے دل میں سلی کے لیے جو جذبات تھے وہ رات
 کی اس غلٹائی فضا میں اپنا اثر دکھانے لگے۔ باقر بھی ایک
 جوان مرد تھا۔ اس کے دل میں بھی جذبات تھے، پھر وہ سلی

مطالعہ کیا تھا اب تک اسے اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب ایسا محسوس نہیں ہوا تھا جس نے سب سے انسانیت اور انسان سے محبت کا درس دیا تھا۔ علم، زیادتی اور نفرتوں کو فساد کی جڑ کہا تھا جبکہ باغض خود اپنی آنکھوں سے اپنی یہودی قوم کو مبینہ ظلم و ستم، ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتا دیکھتی آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ باغض کو ایک یہودی ہونے کے ناطے خود اپنے آپ سے بھی شرم آ رہی تھی۔

جنرل فرمائش کے اس اعلان کی تائید میجر ایسود شاہک اور بارن شمعون وغیرہ نے بھی کی تھی۔ جنہیں اختلاف تھا وہ اپنا اعتراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

فائرنگ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، دستِ بزم بھی
بچنے جا رہے تھے، جنرل فرناش اور اس کے ہمناؤں نے
ہو گئے تھے اور اپنے ارد گرد غوروں اور بچوں کو زبردستی اکٹھا
کر لیا گیا تھا۔ اسی وقت دھڑے دروازہ کھلا۔

☆☆☆

سوچنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس..... دونوں نے خیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھکے جھکے انداز میں دوڑتے ہوئے عمارت کے چوٹی سے دیوار کی جانب بڑھ گئے۔ لیکن انہیں آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو باقر نے اسے آڑہ ہاتھ سے تھام لیا اور بولا۔ ”ابھی ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دونوں کی ناک پر ہم پر گرنے والی دھل کے“۔

”تم پاگل ہو گئے ہو؟“ لیلیٰ بولی۔ ”مندر میں نغمہ ہم
 دت کر چکی ہوں اور صرف میں منٹ کا نغمہ نہیں گایا ہے میں
 نے یہ عمارت تباہ ہونے والی ہے۔ ہم جلیں.....“
 ”لیلیٰ!..... جبرو کہہ رہے ہیں کہ میں ایک منصوبہ
 ہے، تمہارا انتظار کرو۔“ باقر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ لیلیٰ
 الجھی۔ باقر کی ذہانت سے وہ واقف تھی، اس لیے وہ بھی
 کرتے کرتے وقت کا خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔

دروں کیلئے کا پٹر پہلے چند منٹوں تک عمارت کے اوپر
منڈلاتے رہے اور نیچے سرخ لائی پھینٹتے رہے۔ اس کے
بعد وضع و عرض میں اٹھائے میں اتر گئے۔ ادھر ہم پھینٹنے میں
صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے، جسے یہی نیکی کا پٹر نیچے
ہوئے، یا ترنے کیلئے کا بازو پکڑا اور ایک طرف دوڑ کر آیا۔

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جنرل فرناش..... کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ فوراً عورتوں اور بچوں کو دوسرے کمرے میں منتقل کرنے کا بندوبست کرو۔ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔“ اس وقت جنرل فرناش کے ایک ہاتھ میں پتول چمکے لگا۔ جس کی نال کا رخ اس حکومتی انسپری کی طرف تھا۔ دوسرے ہی لمحے نالی سے ایک دھماکا ہوا اور گولی اس جتنے چلاتے حکومتی اہلکار کی پیشانی میں بیوست ہو کر اس کا بھیجا چاٹ گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ کئی خاتون اور بچوں کی دلی دہلی سسکیاں خارج ہو گئیں۔ جنرل فرناش کے سفاکانہ اقدام پر جیسے نکتہ سب کو سناپ ہو سکے گیا اور اس خوفناک ماحول میں جنرل آئزک فرناش کی بھیڑیے جیسی غراہک سے مشابہ آواز ابھری۔

”یہاں صرف میرا حکم چلے گا۔ جنرل آئزک فرانس کا حکم..... یہودی قوم اور گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں کسی بھی مصلحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی بھی ایسی نکتہ سے بچے گا بھی نہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ کسی کو کچھ بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم ان فلسطینی حریت پسندوں کی فطرت کو جانتے ہیں یہ لوگ کسی عورتوں اور بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتے ان کی سوجھ بوجھ ہمیں تحفظ دے گی۔“

بڑے غور سے دیکھو اساتذہ کے سربراہ جنرل آنرک فرمائش کی بات سن رہی تھی اور اس سفاک اور منافق شخص سے سخت نفرت بھی محسوس کرنے لگی تھی، جو اپنے منہ سے حریت پسندوں کی نیک فطرت کا خود اعتراف کر رہا تھا۔ بازغہ کا جی تو چاہا کہ وہ جنرل فرمائش سے پوچھ لے کہ جب مسیحی حریت پسند عورتوں اور بچوں کا اتنا جاگرتے ہیں تو پھر اسرائیلی بمبار طیاروں نے غزہ، جنیدہ اور نابلس کی مسیحی مسلم آبادیوں میں، حتیٰ کہ اسپتالوں میں (دھشتانہ گولہ باری کیوں کی تھی، جس کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے تھے مگر بازغہ باوجود اپنی شدید خواہش کے جنرل آنرک فرمائش سے یہ کڑوا سوال نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس بھیاک انسان کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے اور اس کے باپ پر مذاہدہ کو بھی گولی مار سکتا تھا۔

لہذا بازنہ نے چپ ساوہ لی مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے اب جزل فرما کر وغیرہ ہے یہیں اپنی مکار و دغا باز اور منافق قوم سے بھی نفرت ہو چلی تھی۔ بازنہ نے نیویارک یونیورسٹی میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے حقیقتہً اقوام اور مذاہب سے متعلق ہنس بھل کر کچھ بھی

کی وجہ سے اب تاریکی کے پردے میں ہلکتے شعلوں کے
جہازوں کا اندازہ کر کے موت و زندگی کا یہ ”جوا“ کھلیا جا رہا
تھا۔ زہیدہ کے گروپ نے اپنا داؤ پیچا۔ جدھر سے شعلے
جگے تھے اس طرف اس نے فائرنگ داغ دی۔ کئی دشمنوں
کی کپڑے انگیز بیخیں ابھری تھیں اور اس دوران زہیدہ حلق
کے بل شیرنی کی طرح کرجی۔ ”اندھا داخل ہوئے کی کوشش
کرد۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔“

اس وقت جانے کیوں بار بار اس کی لہو رنگ آنکھوں کے سامنے ہزاروں بے گناہ فلسطینی عورتیں بچوں کی آہیں دسکاپا گونجنے لگیں اور ان ہڈیاں کے چہرے بھی جن میں صادق الخیری اور قیصر الخلیل کے چہرے بھی شامل تھے، صادق الخیری کو جس بیدردی اور بربریت کا ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے مشترکہ چیوس آپریشن میں نشانہ بنایا گیا تھا، زبیدہ آج جلد سے جلد وہ حساب بے باق کرنے کے لیے بے چین تھی۔ ادھر عمارت کے اندر بری طرح کھلبلی مچ گئی تھی، عورتوں اور بچوں نے رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جنرل فرناش، ایجوو شاہک، اسحاق شامیر، باریق شمعون اور دیگر حکومتی افسران بری طرح ہوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے، مگر اس کے بعد صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً آپریشن میں اپنے آپ کو روک دیا اور اسے ختم کر دیا۔ پسند چھاپا ماروں کے حملے کی اطلاع..... اسرائیلی جی آفج کیو کووے دی گئی تھی کبھی بھی وقت وہاں سے کمک کی آمد متوقع تھی مگر دھاوکوں سے عمارت کے درو دروازہ زبرہ تھے۔ اس دوران جارح لائشیں اور جینی ایمرضی لائشیں موجود تھیں وہ روشن کر لی گئی تھیں..... بازو بھی فکر مند نظر آ رہی تھی، یہودی کنسٹرپیڈز ناؤں کو ابھی پٹی کی بھی لگاتار ہو رہی تھی۔ جانے کس حکومتی اہلکار نے چلا کہا۔

”عورتوں اور بچوں کو ایک کمرے میں لے جا کر محفوظ کرو یا جائے فوراً۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“ دفعتاً جنرل فرناش کی تھمسانہ اور کرخست آواز گونجی۔ ”یہ عورتیں اور بچے۔۔۔۔۔ ہمارے لیے تحفظ کا باعث بنیں گے۔“ جنرل فرناش کے مکروہ لہجے سے ہلاک عماری پھولی پڑ رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت چند اہلکاروں نے اندر آ کر بدحواسی میں اعلان کر دیا۔ ”حزبت پسند چھاپا ماروں کا بلڈا بھاری ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً کمک کی ضرورت ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں درانداز ہو سکتے ہیں۔“

اطلاع پر بروہی حکومتی اہلکار بھر جلا یا درجنز فرناثر

پھنسانا اسے مشکل نظر آ رہا تھا مگر اب مزید جانس لینے کا وقت بھی نہیں رہا تھا، اس کے دائیں بائیں ان گنت بھاری بوٹ نظر آنے لگے تھے اور دشمن گاڑیوں کے نیچے جھپک جھپک کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے نظر آ جانے کی صورت میں وہ اپنے ہتھیاروں کے منہ کھول سکتے تھے۔ عابد ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر جیپ کے نیچے جھپکے جسے میں نصب ایک آہنی راڈ کو پکڑ کر اوپر کاٹھ گیا۔ وہ لینے لینے پوزیشن میں اوپر کی طرف سپاٹ ہو گیا تھا مگر رکنے رہنے کی معقول صورت پھر بھی اسے نہیں ملی تھی۔ وہ محض اپنے دونوں بازوؤں اور ٹانگوں کو جیپ کے آہنی بچھر میں اٹکائے اس طرح بھول رہا تھا کہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ اس وقت کئی گرومیں جھپک کر جب کے نیچے خلا کا جائزہ لینے لگیں، عابد نے بازوؤں اور ٹانگوں کا تھوڑا اور زور لگا کر اپنے وجود کو مزید اوپر کر دیا۔ مجھے آہنی جھنگے میں لگے آکل اور گریس سے اس کا اپنا حلیہ بھی بدل گیا تھا مگر اس پوزیشن میں اسے بڑی طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی، اس کا سارا جسم پل بچھر میں مل ہوئے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے پیچھے لیے تھے، اگر وہ نیچے فرش پر گر جاتا تو دیکھ لیا جاتا۔ دشمنوں کی نظروں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہاتھوں بیروں کی قوت سے اپنے وجود کو جیپ کے نیچے

میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئے..... اوپر ہی ہیں۔ ہمیں اوپر ہی تلاش کرنا چاہیے۔“ اس آواز پر عابد ٹیکھری نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ اسے مزید خوشی ہوئی جب وہاں جاتے قدموں کی آواز ابھری۔ مگر جلد ہی عابد کی خوشی غم ناک سکتے میں بدل گئی۔ نہ جانے تاخیر کے ساتھ کیا ہوا تھا، یا پھر وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکی تھی کہ عابد کو دھپ سے اس کے فرش پر گر گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بھی اتنی نہیں تھی کہ جاتے ہوئے دشمنوں کو سنائی دیتی لیکن جانے کیا ہوا تھا کہ جس ٹرک کے نیچے مشینری والے آہنی خلا میں عابد نے اسے اپنی طرح ہاتھوں بیروں کی مدد سے لینے کے انداز میں ٹکایا تھا بد قسمتی سے کوئی آہنی راڈ نکل گئی تھی اور تاخیر سمیت نکل کر وہ آہنی راڈ زور سے پختہ فرش پر پڑ گئی تھی۔ جانتے ہوئے دشمنوں کے بھاری قدموں کی آواز کو یکدم بریک لگ گئے۔ عابد ٹیکھری کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ آہنی راڈ کے گرنے کی آواز پورے ہیمنسٹ میں گونجی تھی۔ عابد نے تھوڑا نیچے سر کر کے

ٹرک کی طرف جھانکا اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ آکل اور گریس میں ٹیکھری ہوئی تاخیر ٹرک کے نیچے فرش پر گری ہوئی تھی اور بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی، وہ باہر دو بارہ ٹرک کے خلا میں اٹھنے اور اٹکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اب اس کا فائدہ نہ تھا۔ دشمنوں کو شبہ ہو گیا تھا۔ وہ آواز کی سمت اب تیزی کے ساتھ پلٹ رہے تھے، جھپکی ہوئی بازی ہادی طرف مڑ گئی تھی۔ ایسی بار..... جس میں تھیں موت کے سوا زندگی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

☆☆☆
زوردار آواز سے دروازہ کھلتے ہی وہاں موجود عورتوں اور بچوں کے ملحق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اس بلند چھت والے بڑے سے ہال کمرے کے روپٹ چوڑے دروازے پر سب سے پہلے زبیدہ اور حسن جھپکار بست خود اڑھٹے۔ اس کے بعد ان کے باقی ساتھی جو تعداد میں اب جا رہے تھے۔ جنرل فرناش سمیت باقی شمعون ان چار مجاہدوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو حیرت زدہ بھی رہ گئے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چھاپا بار حریت پسند تعداد میں کئی ہوں گے، جنہوں نے آٹا فافا پوری عمارت پر دھاوا بول کے اس پر اپنا تسلط جمایا ہو مگر ان ساتھی پھر چند مجاہدوں کو دیکھ کر انہیں اس بات کا شک نہ تھا کہ وہ انہیں بھی ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تھے کہ یہ سرفروش گفنی میں تھوڑے ہی گمراہ کے جوہلے اور آہنی عزم اپنے سے کئی گنا زیادہ نفری رکھنے والے دشمنوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے تھے اور ایسا ہوا تھا مگر فرناش اور شمعون وغیرہ کو کبھی بھی کئی کہ وہاں پہنچنے والی بھاری ٹلک کے سامنے یہ چند مجاہد زیادہ دیر نہیں ٹلک سکتے۔ ”ہالٹ..... کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔“ زبیدہ نے بھری ہوئی شیرنی کی طرح ہڈاڑ کر کہا۔

زبیدہ کی عقلمانی اور برائی ہوئی نگاہیں جنرل فرناش اور باقی شمعون پر جمی ہوئی تھیں، نیز وہ ان کے دست راست ساتھیوں کو بھی پہچان رہی تھی جبکہ فرناش وغیرہ نے بھی اپنے پستول نکال لیے تھے۔ جنرل فرناش اور شمعون نے اپنے گرد عورتوں اور محصور بچوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ قریب کھڑی بازغہ کے چہرے پہ نفرت کے تاثرات تھے۔ ”چٹ دی کن ڈاؤن..... ہری اپ.....“ حسن نے گرجدار آواز میں فرناش وغیرہ سے کہا جبکہ زبیدہ کے چہرے پر اب جوش کے ساتھ کچھ اچھن آئیز پریشانی کے تاثرات نمودار ہونے لگے تھے وہ شاید ان کی بڑ دلا نہ چلائی اور مکاری کو سمجھ رہی تھی۔

”نواپڑ نیور..... ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے۔“ جنرل فرناش کی کمریہ آواز ابھری۔ ”الٹا وہ انہیں دھمکی دیتے ہوئے بولا۔“ ”تم سب زندہ نہیں بچ سکو گے۔“ بھڑکی ہے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ اس وقت ہال کمرے میں برست چلنے کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ کئی عورتوں اور بچوں کے منہ سے بار..... دہشت کے چہچیس نکل گئیں۔ چھت کا پلستر اکٹھا کر پھینچے اور گروڈو خاد کا مختصر سا سر غولہ ہال میں رقص کرنے لگا۔ یہ حسن نے برست چلا یا تھا۔ نشانہ ہال کی بلند چھت ہی تھا۔

زبیدہ ہڈاڑ کر فرناش سے بولی۔ ”ہتھیار پھینک دو..... جنرل اور نہ ہم کو گولیوں کی بارش کر دیں گے۔“ بازغہ غوران مٹھی بھر جیتا لے جا بازوؤں کی طرف نکلے جا رہی تھی۔ جواب میں ایہود شاہک نے کہا۔ ”تم لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ کمرے سے نکل جاؤ۔ ورنہ ہم فائر کھول دیں گے۔“

اب زبیدہ سمیت حسن کے چہرے پر بھی الجھن طاری ہونے لگی تھی کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ یہاں عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں یہ مجاہد فائر کھولنے سے قاصر تھے، بے شک یہ یہودی تھے مگر انہیں ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ وہ نتیجے محصور بچوں اور عورتوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔

زبیدہ اب ہمارے ساتھ مکالمی کر رہے ہیں۔ ”ایک مجاہد نے چٹا کر زبیدہ سے کہا تو وہ ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر منع کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں گولیاں چلنے کی صورت میں یہاں موجود بچے اور عورتیں بھی زد میں آ جائیں گے اور ہمارا امنیہ اور ایمان گوارا نکلیں گے۔ ہم ان محصور نہتے بچوں اور عورتوں کو جان لیوا خطرے میں ڈالیں۔“ بازغہ نے سن کر تحقیر ہوئی۔ اس کا چہرہ کئی اندرونی جوش تلے تھماتے لگا۔ وہ چٹا کر زبیدہ اور حسن کی طرف دیکھ کر عجیب دیوانگی کے عالم میں بولی۔

”یہ جنگ ہے اسے جنگ ہی رہے دو۔ جذبات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم بھول گئے..... اسرائیلیوں نے تمہارے گھروں پر بمیں دھشیاں بمباری کی تھی، کتنی عورتیں اور بچے اس میں قہر اہل بنے تھے، اب تم کیوں اپنے دشمنوں پر یہ دم کر رہے ہو۔ چلاؤ..... گولیاں..... ایک عجیب جوش سے بازغہ کا دم پھولنے لگا تھا۔

زبیدہ اور حسن قدرے حیرت سے اس خوب صورت کی مگر شیدہ صورت یہودی لڑکی کو دیکھنے لگے۔ اس پر جنرل

فرناش خارش زدہ کئے کی طرح بلبل کر کشمیر پیر سے بولا۔ ”کشمیر پیر! اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھاؤ، یہ کیا لو اس کر رہی ہے..... ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“

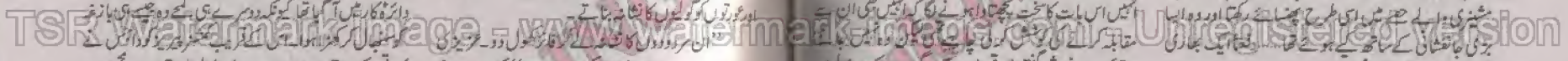
”میں تین تک گنتی گنوں گا۔ اس کے بعد تم پر فائر کھول دوں گا۔“ اس درمیان میں ایہود شاہک نے پیچ کر کہا۔ ”ایک.....“

”مجھے آج اپنی یہودی قوم کا اصل اور بھیا تک چہرہ دکھائی دے گیا ہے۔“ ایسا اور مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ ”بازغہ بھی خاموش رہنے والی کہاں تھی۔ اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ وہ بیٹی کو خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگا مگر اس دوران حسن کی عقلمانی نظروں نے دیکھا۔ جنرل فرناش کے پستول کا رخ قریب کھڑی اس لڑکی (بازغہ) کی طرف ہونے لگا۔ حسن جنرل فرناش پر ابھی گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر اس نے فوراً ایک جرأت مندانہ حرکت ضرور کر ڈالی۔ ادھر جنرل فرناش کے پستول نے دھماکے سے شعلہ اٹھا۔ ادھر حسن نے بازغہ پر جست بھری اور اسے رگیدتا ہوا پختے فرش پر جا پڑا۔ بازغہ پر چلائی ہوئی جنرل فرناش کی گولی حسن کے بائیں بازو میں جا گئی۔ عورتوں بچوں کی چیخیں خارج ہوئیں..... مگر بازغہ کی کئی تھی اور حسن خطرے کے

دائرہ کار میں آ گیا تھا کیونکہ دوم سے ہی لینے وہ مجھے اپنا بازغہ کو مجھ سے کہہ رہا تھا۔ اس نے کئی بار کھینچ کر اس کے پھر کر کے ساتھ اپنا سروں پر لیا اور نکال لیا تھا اور..... حسن پر تان لیا۔ بازغہ نے جو اپنے باپ کی یہ حرکت دیکھی اور یہ بھی کہ اسے بچانے کی خاطر یہ دلیر مجاہد خود بھی زخمی ہو کر موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا ہے تو وہ یکدم حسن کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہوئی اور اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ”چپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ جس نے میری شخص انسانیت کی خاطر جان بچائی..... آپ اسے گولی کا نشانہ بنارہے ہیں۔“

”یہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہماری قوم کے دشمن ہیں۔ ہٹ جاؤ آگے سے بیٹی۔“ کشمیر پیر نے چیخا۔ تو اس وقت جنرل فرناش نے پیر سے جھمکنہ درستی سے کہا۔

”کشمیر! اڑ دو گولی سے دونوں کو..... شوٹ قہم.....“ صورت حال ایسا کی جان لیوا حد تک خطرناک ہو گئی تھی، دفعہ فائر ہوا اور ہال میں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل فرناش کے نائب میجر ایہود شاہک کی کمریہ انگیز چیخ ابھری۔ زبیدہ کی چلائی ہوئی گولی اس کی گردن میں بیوست ہو گئی تھی اور غالباً شرک متاثر ہونے کے باعث



خون کا فوارہ اس کی گردن سے اٹھ پڑا۔ گولی زہیدہ نے...
 ایہود شاہک... پر تانک کر فائر کی تھی۔
 ایہود شاہک درحقیقت محسن کو خاموشی سے اپنے ہتھول
 کی گولی کا نشانہ بناتا چاہ رہا تھا۔ زہیدہ کی عقابانی نگاہوں نے
 اس کی ہکارانہ اور سفاکانہ حرکت کو بروقت تازیا تھا مگر پھر تو
 جیسے جھلکدڑی بچ گئی۔ ایہود شاہک کی موت نے فرناش اور
 شمعون وغیرہ کو ہلکا کر دکھ دیا۔ انہوں نے عورتوں بچوں کی
 پرواہ کیے بغیر زہیدہ اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کر دی۔
 اندھا دھند فائرنگ میں زہیدہ کا ایک ساتھی شہید ہو گیا۔ زہیدہ
 نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو واپس پلٹنے کا حکم دیا اور وہ خود بھی
 پلٹی۔ محسن بھی بازغہ کو چھوڑ کر دوڑا۔ اس کے بازو سے ہوز
 خون جاری تھا مگر اسے اس کی کب پروا تھی۔ یہ لوگ...
 کمرے سے باہر ایک راہداری میں کھڑے ہو گئے۔
 ”ان کی کمک کسی بھی وقت پہنچنے والی ہے۔ تاخیر
 مشکل کا سبب بنے گی بلکہ ہمیں مارے جا سکیں گے۔۔۔۔۔“
 ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ محسن نے کہا۔ اس کے بازو
 والے زخم پر کسی ساتھی نے رومال باندھ دیا تھا۔ ابھی اس
 نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر ان کے کان کھڑے
 ہو گئے۔ یہ مخصوص قسم کی گڑگڑاہٹ تھی۔

”مکمل کاروبار...“
 سے برآمد ہوا۔ لگتا ہے ان کی کمک آئی ہے۔

ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے
 ہو گئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔

”زہیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ
 کسی کمرے سے جزل فرناش اور بارق شمعون کو بھٹ کرنے
 کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں کمک کو
 روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”مگر...“ زہیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے
 ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی
 اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی
 تھا کہ خشک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی
 بازغہ کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازغہ محسن کے قریب
 آ کے بولی۔

”تم لوگ... سخت خطرے میں ہو۔ باہر ملک پہنچ
 چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جزل
 فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“
 ”ان بزدلوں نے عورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی
 ہے۔“ محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

”میرے ساتھ آؤ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے...
 کس کمرے میں گئے ہیں۔“ بازغہ نے انکشاف کیا۔
 سرخ و سپید حسین چہرہ جوش سے لرز رہا تھا پھر واپس پلٹی۔ محسن
 اس کا ساتھی عیداس کے عقب میں چل پڑے۔ بازغہ کو
 مختلف راہداریوں سے گزارتی ہوئی ایک ایسے کمرے سے
 سامنے والی راہداری میں لے آ۔ جو در و درم ہلکا تھا۔
 ”اس کمرے کے اندر وہ دونوں شہید
 موجود ہیں۔“ بازغہ نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے کہا۔ خشک اسی وقت ہماری قدموں کی آواز
 ابھری۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی گولیوں کی ہیک تڑتڑاہٹ سے
 کور پڑور گونج اٹھا۔ اس میں محسن کے ساتھی عیداس کی چیخ بھی
 شامل تھی۔ محسن نے عقب میں محکم گرد و بار کی آڑ لیتے ہی
 اپنی گن کا رخ سیدھا کر کے لپٹی دوڑا دی۔ ایک گرجتا ہوا
 برست فائر ہوا اور کئی وردی پوش اسرائیلی فوجی کمرے میں
 چپقلش مار کر زمیں یوں ہو گئے۔ محسن ان کی نفی کا اندازہ
 نہ کر سکا تھا اور یہ بھی کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں
 ٹھک۔ آگے بڑھا اور بازغہ سے بولا۔ ”تم چل جاؤ۔ وہ
 میرے ساتھ تمہاری جان میں خطرے میں پڑ جائے گی۔“
 ”میں نے اپنے لوگوں کو اسے اور اپنے باپ کا روپ دیکھا
 ہے۔ اب میری گن میں تمہاری دھنکنا چاہتی ہے۔“
 بازغہ بولی۔ محسن نے اس کے بازو اور گردن پر ہتھوڑی
 محسن نے ایسا ہی کیا۔ مذکورہ دروازے پر اس نے اپنی گن
 کا رخ کر کے برست فائر کر دیا۔ دروازے کا لاک اڑ گیا۔
 محسن نے اسے لات دے ماری۔ پھر بازغہ سے بولا۔
 ”تم کسی طرح عورتوں اور بچوں کو عمارت سے باہر
 دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“ بازغہ نے سن کر پلٹ گئی۔
 محسن اندر داخل ہوا۔ سامنے اسے مختلف تھیل کے
 پاس۔۔۔۔۔ جزل فرناش اور بارق شمعون نظر آ گئے۔
 برست چلنے کی آواز پر بری طرح چونک کر اٹھے تھے۔
 یکدم اوپر اٹھ چھپنے لگے۔ محسن نے ان پر اندھا دھند
 فائرنگ کر دی۔ کئی تھیل اور اسکرین ترخ گئے۔ جزل
 فرناش جانے کس دروازے سے غائب ہو چکا تھا جبکہ باقی
 شمعون اس کے نرے میں آ گیا۔ ”خبردار!...! آگے
 پلٹنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔“
 بارق شمعون نے ٹھکت خوردہ انداز میں اپ
 دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ خشک اسی وقت کئی مسلح وردی چل
 اندر دوڑ آئے۔

☆☆☆

زہیدہ نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جھڑکارا کیا
 تھا وہاں اس کی زد میں اشحاق شامیر آ گیا جو ہال کمرے کے
 ایک بجلی دروازے سے عمارت کے کچلے اندرونی گوشے کی
 طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”رک جا۔۔۔۔۔ یہودی کتے۔۔۔۔۔! ورنہ گولیوں سے
 بیون ڈالوں گی۔“ زہیدہ کی گرجتی آواز پر اشحاق شامیر لرز
 اٹھا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے ہتھول نکال لیا مگر اسے
 فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ زہیدہ نے اپنی گن کی لپٹی دبا
 دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اشحاق شامیر کو چھلکی کر رکھ
 دیا۔ وہ چیختا ہوا فرش پر گر۔ زہیدہ نے اپنے تینوں ساتھیوں
 کے ساتھ آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو یکایک عقب میں کئی
 دھڑکنے قدموں کی آواز ابھری۔ زہیدہ بری طرح تھکی۔
 اسے جزل فرناش اور بارق شمعون کی تلاش تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتی
 تھی کہ یہ دونوں اسرائیل بلکہ یہودیوں کے لیے کس قدر
 اہمیت رکھتے تھے مگر پہنچنے والی کمک نے ان کے منصوبے کو
 مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں مبتلا تھی کہ
 اچانک عقب سے ہالت ہالت کی آوازیں ابھریں اور اس
 کے ساتھ ہی اندھا دھند گولیاں چلیں۔
 زہیدہ اور اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً حرکت کی۔

”مکمل کاروبار...“
 سے برآمد ہوا۔ لگتا ہے ان کی کمک آئی ہے۔

ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے
 ہو گئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔

”زہیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ
 کسی کمرے سے جزل فرناش اور بارق شمعون کو بھٹ کرنے
 کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں کمک کو
 روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”مگر...“ زہیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے
 ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی
 اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی
 تھا کہ خشک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی
 بازغہ کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازغہ محسن کے قریب
 آ کے بولی۔

”تم لوگ... سخت خطرے میں ہو۔ باہر ملک پہنچ
 چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جزل
 فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“
 ”ان بزدلوں نے عورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی
 ہے۔“ محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

☆☆☆

غاصب سہو بیوں کی لیے عرس تک کر ٹوٹ جائے گی۔“
 لیلیٰ نے کہا تو عارف حسیب کے ایک ساتھی نے کہا۔
 ”انشاء اللہ وہ بھی ضرور کامیاب ہوں گے۔ ویسے تم
 لوگوں نے اسرائیل کے ایجنسی کھڑ کو تباہ کر کے بڑا کارنامہ
 انجام دیا ہے۔ اس سے اسرائیلی خفیہ ایجنسی پر وگرام کو کافی
 دھچکا لگا۔ لیکن جانے کیوں میرا دل سے چین ہو رہا ہے۔“
 باقر نے کوگو سے لہجہ میں کہا۔ ”کاش ہم بھی عزیزی
 زہیدہ اور اپنے دوسرے گروپ سے اس کی مدد کر سکتے۔“
 ”اطمینان رکھو دوست! اور اللہ سے ان کی کامیابی
 کی دعا کرو۔“ عارف حسیب نے کہا۔ اچانک باہر دور کہیں
 گولیوں کی ترتر اٹھ ابھری۔ وہ سب چونک پڑے اور
 ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ انہیں جیت... طیاروں کی
 خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اگلے ہی لمحے کے بعد
 دھڑکنے کی سماعت ممکن اور لرزا دینے والے دھماکوں کی
 آوازیں ابھریں۔۔۔۔۔ جس گھیا میں یہ لوگ موجود تھے، وہ
 بھی انہیں لرزتی محسوس ہوئی، ایک بم شاید ان کی گھپا کے
 کہیں قریب گر تھا۔
 ”دشمنوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ ہوشیار!...“ باہر سے کسی
 ساتھی نے خبردار کیا اور یہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیلیٰ
 نے فوراً ہتھول نکال کر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔
 ہتھول سے سب اسلحہ سنبھال کے باہر دوڑے۔ عارف آگے
 تھا وہ جیسے ہی گھپا سے باہر نکلا اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔
 وہ وہیں دم توڑ گیا۔ لیلیٰ اور باقر کا دل دکھ اور جوش انجام
 سے بھر گیا۔ ان کی اسلحہ کٹوں میں جس قدر ایمونیشن ماسک
 تھا وہ انہوں نے بھرا یا اور باقیوں نے عارف... کا انجام
 دیکھتے ہوئے گھپا سے نکلنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا بلکہ گھپا
 کے شکستہ ڈھانچے کے سرے سے کھڑے ہو کر پوزیشنز
 سنبھال لیں۔ بیت صفائی کی پہاڑیاں اس وقت گولہ باری
 اور دھماکوں سے لرز رہی تھیں۔ آسمان پر کئی اسرائیلی فوجی
 طیارے گردش کرتے نظر آئے تھے اور پہاڑیوں میں جیسے
 قلعہ شکنی عہدہ ایئر کرافٹ اور راکٹ لانچرز سے انہیں
 گرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسرائیلی طیاروں
 میں مشین گنیں بھی فٹ تھیں، ان کا بھی ایک ساتھی راکٹ
 لانچر کا ندھ سے پرے کر نمودار ہوا۔ باقر اور لیلیٰ نے بڑی
 مستعدی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیا اور انہیں احساس
 ہو گیا کہ اسرائیل کی طرف سے یہ ان پر فضائی حملہ کیا گیا
 تھا۔ یہ لوگ اسرائیل کے اس بڑا دلچسپی انداز سے واقف
 تھے۔ یہ ان کی اولین حکمت عملی ہوتی تھی۔ وہ پہلے فضائی

”مکمل کاروبار...“
 سے برآمد ہوا۔ لگتا ہے ان کی کمک آئی ہے۔

ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے
 ہو گئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔

”زہیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ
 کسی کمرے سے جزل فرناش اور بارق شمعون کو بھٹ کرنے
 کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں کمک کو
 روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”مگر...“ زہیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے
 ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی
 اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی
 تھا کہ خشک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی
 بازغہ کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازغہ محسن کے قریب
 آ کے بولی۔

”تم لوگ... سخت خطرے میں ہو۔ باہر ملک پہنچ
 چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جزل
 فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“
 ”ان بزدلوں نے عورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی
 ہے۔“ محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

☆☆☆

جنگ کے دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے تھے اس کے بعد دوسرے مرحلے میں وہ اپنے کانڈوز روانہ کرتے تھے۔ باقر نے راکٹ لانچر سنبھال لیا اور لٹل کے ساتھ باہر آگیا۔ اس وقت انہوں نے ایک اسرائیلی طیارے کی دم سے گڑھا دھواں نکلتے دیکھا اور لڑوہ کبیر بلند کر دیا۔ مجاہدین دشمن کا ایک طیارہ مار گرانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو آگے جا کر سنگناخ پہاڑیوں کے دامن میں گر کر دھماکے سے تباہ ہو گیا تھا۔

لٹل اور باقر جس وقت ایک سنگناخ دڑے سے گزر رہے تھے، اچانک اس کے سامنے والی ایک نسبتاً بلند پہاڑی چوٹی سے ایک اسرائیلی طیارہ بہت نیچے پرواز کرتا ہوا کسی دیوار آدہی پرندے کی طرح نمودار ہوا۔ جو مسلسل گولیاں برسا رہا تھا۔ باقر نے پہلے ہی سے اپنے کانڈوزوں پر راکٹ لانچر اٹھا رکھا تھا مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ راکٹ فائر کرنے کے لیے اپنی مخصوص پوزیشن سنبھالے۔ تاہم اس نے ایک چٹائی دیوار کے سہارے خود کو لٹایا اور تاک کر نیچے پرواز کرتے اسرائیلی طیارے پر راکٹ فائر کر دیا۔ یہ سہری موقع تھا جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ راکٹ فائر ہوا اور سنبھالتا ہوا تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھنے لگا۔

اسے ہدف کی طرف بڑھنے لگا۔ باقر نے پہلے ہی سے اپنے کانڈوزوں پر گولیاں برسا کر شروع کر دی تھیں۔ طیارے کے پائلٹ کو اس طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے ایک مارٹر گولہ داغ دیا مگر اس کے اگلے ہی لمحے اس کے طیارے کو زبردست جھٹکا لگا۔ باقر کا فائر کیا ہوا راکٹ طیارے کے پچھلے حصے سے جا لگ گیا تھا۔ اسرائیلی پائلٹ نے فوراً ایئر اسٹک کو اوپر کیا مگر طیارے کا عقبی حصہ تباہ ہونے کے باعث طیارہ خاطر خواہ بلندی کو نہ چھو سکا اور سامنے کی ایک بلند پہاڑی چوٹی سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس کا پھینکا ہوا مارٹر لٹل اور باقر سے تقریباً بیس تیس گز دور گر گیا تھا۔ ایک لڑوہ خیز دھماکا ہوا اور لٹل نے مارٹر کرتے ہی خود کو بڑی پھرتی کے ساتھ ایک چٹائی آڑ کے پچھے لگا کر مارٹر بدھشتی سے باقر کو چھینکا مومن ڈیل سکا۔ تاہم دھماکا ہوتے ہی اس نے خود کو فوراً سنگناخ اور تاحور زمین پر گر گیا تھا۔ گولہ گرتے ہی کان بھاڑ دھماکا ہوا اور کئی تباہ کن ٹیکل چٹائی سنگ ریزوں کے ساتھ گر دو پیش میں پھیلے، ان کے ہلک پھلکے کی زد میں باقر بھی آگیا۔ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا اور بایاں کا ندھا ایک بارودی ٹیکل نکلنے سے بری طرح متاثر ہو گیا۔ مارے اذیت کے باقر کے حلق سے کرب ناک چیخ ابھری تھی جس

نے کچھ فاصلے پر چٹائی آڑ میں اوندھی پڑی لٹل کو بری طرح دھلا کر رکھ دیا۔ وہ شدت کرب سے تقریباً بیچتی ہوئی پتھر ٹلی زمین پر خون میں تر ہو کر لٹا ہوا باقر کی طرف دوڑی اور اسے سنبھالا دیا۔ گولیوں دھماکوں کی آوازیں بہ دستور گونج رہی تھیں، تاہم گولہ باری میں کچھ کی آفتی محسوس ہوئی، شاید مجاہدین دشمنوں کے کچھ طیارے مار گرانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ادھر باقر کی حالت دیکھ کر لٹل کا دل بری طرح دھک رہا تھا۔ ”باقر..... باقر!..... تھمت..... تھمت..... زخمی ہو.....“ لٹل کی آواز شدت غم سے لرزے لگنے لگی۔ باقر نے کچھ کمزور سہری سانس لینے کی کوشش کی بعد کراہتی ہوئی آواز میں یہ مشکل کہا۔

”ہم..... میں ٹھیک ہوں۔ تھمت..... تھمت..... تم ایک کام کرو۔“ کی طرح میرے زخمی کا ندھے پر میری میٹھی کراہتی باندھ دو۔“

”دیر..... مت کرو لٹل! ہمیں آخری سانسوں تک دشمنوں سے لڑنا ہے۔“ باقر نے جوش سے ہاتھ ہوا کہا اور لٹل نے اپنی میٹھی کراہتوں کو بند کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے اپنے بھائی اور بھتیجی کی شہادت کے بعد خشک کر ڈالے تھے۔

حریت پسند مجاہدوں کی جنگی کٹ میں مقدمہ بھر رہی پٹی کا سامان بھی ہوتا تھا۔ اس وقت لٹل کے پاس وہی ایک کٹ تھی، اس نے جلدی جلدی پہلے باقر کے زخموں کا معائنہ کیا پھر اس کی قمیص کا ندھے کی طرف سے پھاڑ ڈالی۔ کٹ سے مرہم نکال کر زخم پر اس کا پیسٹ لگا دی پھر پٹی باندھ دی۔ خون کا رساؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ باقی زخموں پر بھی اس نے اسٹینسیلک لوشن لگا کر مرہم رکھ دیا۔ مرہم کافی تھا جسے تیسے کر کے باقر کو سنبھالا دے کر چٹائی دیوار کے سہارے اٹھا کے بٹھا دیا۔ باقر نے دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں پھر ایک طرف پڑے راکٹ لانچر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ راکٹ اس نے دائیں کا ندھے سے جھلا دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

نے فوراً سہارا دیا۔ باقر کے تھوڑے قدم ڈگمگائے پھر اپنی مضبوط قوت ارادی سے دشمن سے ایک بار پھر نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

اسرائیلی طیارے اب بھی آسمان پر گردش کر رہے تھے اور مجاہدین کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث بن

ہوئے تھے۔ باقر کو اسرائیلی طیارے مار گرانے کی زیادہ تر کٹیں بھرخص راکٹ لانچر سے وہ ان طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جبکہ طیارے زیادہ تر اس علاقے میں گولہ باری کر رہے تھے حریت پسند..... اگرچہ اسٹینسیلک ایئر کرافٹ گنوں سے ان کا زور توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر لٹل تھا آج کے اسٹینسیلک گھڑکی جیسی نے اسرائیلیوں کو بری طرح تھلا دیا تھا۔ وہ اپنی اس برادری پر زخم خوردہ تھے اور مجاہدوں کے کھنکھنے ٹھکانوں پر ہلے بول دیا تھا۔

راکت لانچر اب لٹل نے سنبھال رکھا تھا۔ دور راکٹ ابھی اس کی جنگی کٹ میں موجود تھے، باقر بھی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ وہ لٹل کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں پر چلے۔ اس نے راکٹل اب اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس دوران چند سح مجاہد ان سے آنے لے۔ ایک نے انہیں پہچان کر کہا۔ ”اس طرف سے پیچھے نکلنے کی کوشش کرو..... دشمن بھاری تعداد میں پیدل اس طرف آ رہے ہیں۔“

”ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمیں دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔“ لٹل نے بے پرواہی سے کہا تو باقر نے بھی اسی انداز میں تاکید کی۔ بولا۔

”دشمن چاہے کتنی ہی تعداد میں ہوں ہم ان کے آگے ڈٹ جائیں گے۔“ وہ باقر کی حالت دیکھ کر حیران پریشان ہوئے مگر پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ اس جگہ چٹانوں پر پوزیشن سنبھال لیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ انہیں سامنے تقریباً پچاس ساٹھ گز سے فاصلے پر اسرائیلی سح دستہ دکھائی دے گیا، جو چست وردیوں میں لمبوس تھے، انہیں دیکھتے ہی مجاہدوں نے اپنی رائفیں چلا دیں۔ دوسرے ہی لمحے میں گر دو پیش کی چٹانیں گولیوں کی توڑ تباہت سے گونج اٹھیں۔ چند اسرائیلی دشمن گولیوں کی زد میں آئے، دفعتاً باقر کی عقابی نظروں نے دیکھا دشمن دسنے کے چند سح فوجی ان کی طرف ایک وقت کی دبی قہقہے کی تیار کر رہے تھے، باقر نے لٹل سے تقریباً چلا کر کہا۔

”لٹل! ان پر راکٹ فائر کرو۔ جلدی.....“ باقر جاننا تھا اگر یہ وقت اتنے سارے دقتی ہم ان کی طرف اچھالے گئے تو..... کچھ بھی نہیں بچے گا۔ لٹل نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے راکٹ داغ دیا۔ ساعت شکن دھماکے کے ساتھ ہی کئی اسرائیلی دشمن جہنم واصل ہو گئے۔

دلچسپ معلومات

- ☆ دنیا کا سب سے پہلا بینک الکی میں قائم کیا گیا۔
- ☆ انسانی جسم میں دانت وہ بڑی ہے جس پر کوشت نہیں ہوتا۔
- ☆ اگر سانپ کا سر کاٹ دیا جائے تو بھی وہ آدھا گھٹنے ڈنکے سے قائل رہتا ہے۔
- ☆ قرطبی نامی پرندہ ایک بار بھی پر ہلائے بغیر سارا دن اڑ سکتا ہے۔
- ☆ قطب شمالی کے آسمان سے سال کے 182 دن سورج مکمل غائب رہتا ہے۔
- ☆ چمچہ گورے رنگ اور پیلے بالوں والے شخص کو کانٹا زیادہ پسند کرتا ہے۔
- ☆ تقریباً 5 ٹن وزن رکھنے کے باوجود 40 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے۔
- ☆ اگر دنیا کی ساری مرغیاں شکاری جائیں تو ہر شخص کے حصے میں صرف دو مرغیاں آئیں گی۔
- ☆ سورج کی روشنی زمین تک 8 منٹ میں پہنچتی ہے۔
- ☆ مسلسل۔ عاطف شاہین اٹھارہ اڈھاروتی

سپنس ڈائجسٹ ————— 101 ————— جنوری 2015ء

برائے وسعت ازق

(1) ”خواجہ احمد دین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (مغربیات دینی) میں تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص یا لباس پہنے سے پہلے پاک پانی پردس مرتبہ سورۃ قدر اور سورۃ اخلاص پڑھ کر لباس پر چھڑک دے تو جب تک لباس کا تار اس کے بدن پر رہے گا اسے مالی غمی نہیں ہوگی۔“

(2) گھنٹوں سے رنج کی آواز آتا۔ ”جن لوگوں کے گھنٹوں میں سے رنج کی آوازیں آتی ہوں ان میں دوا من ڈی 3 کی کمی ہو جاتی ہے، دوا من ڈی 3 کی کمی دور کرنے سے گھنٹے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“

(3) حضور ﷺ کا پیالہ حجام کی کلوئی کا تھا۔

حجام جسے عربی میں طرخا، فارسی میں گز، پنجابی اور سرائیکی میں لائی، مہر اور انگریزی میں تمارک ٹری (Tamarisk Tree) کہتے ہیں۔

ڈاکٹر کرنل چو پڑا نے ٹریک ٹری کے پیلے کے مندرجہ ذیل فوائد بتائے ہیں۔

اس پیلے میں پانی پینے سے جگر کے امراض (Liver diseases) خاص طور پر

درم جگر (Liver inflammation) استقام

(Oedema) ختم ہو جاتا ہے اس سے گردوں

کی درم (Kidney Inflammation) ختم

ہو جاتی ہے۔ پیشاب مکمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس

پیلے میں پانی پینے سے خون میں صفروای کیفیت

کم ہو کر خون میں چھیلے مواد کوٹیشنول

(Cholesterol) اور ایسی صفیں کم ہو جاتی ہے

پتہ (Gall bladder) میں پتھری بننے والا

مواد پیشاب کے ذریعے نکل جاتا ہے۔

مرسلہ: روشنی رشید، دھمیاں کیمپ، راولپنڈی

ام خالدہ تھوڑی دیر بعد لوٹ آئی۔ اس کے صبح چہرے پر ہنسنے کے آثار تھے، دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے ”اوپر کیا ہوا؟“ کی تقریر پیش کرنے لگے۔

”تم دونوں پر یہاں کسی کو کوئی شرت نہیں ہوا ہے مگر اسرائیلی خفیہ ایجنسی اور پولیس تم دونوں ہی کی تلاش میں خفیہ سرچ پر مشغول کر رہی ہے۔ یہ معمول کی چیکنگ ہے جو تقریباً ہر رہائشی بلڈنگ میں کی جارہی ہے۔ ام خالدہ نے بتایا۔ عابد اور نامہ کے چہروں پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ جان گئے تھے کہ ان کے قلیت کی بھی باری آسکتی تھی۔ تاہم عابد نے ام خالدہ سے کہا کہ اس کی کسی طرح اپنے شوہر طرخا سے بات کرادیں۔ ام خالدہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور قریب دھڑے ایک خوب صورت سے دیدہ زیب فینسی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔ نامہ نے عابد سے ایک خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”فون ذرا دھیان سے کرنا۔ ممکن ہے کالیں خفیہ طور پر چیکنگ کی جارہی ہوں۔“

ہاں۔۔۔۔۔ عابد نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔“

تھوڑی دیر بعد ام خالدہ نے بتایا کہ اس کے شوہر طرخا نے اس کا رابطہ دور کا دور کا کام سے ملنے میں مصروف تھا اور اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ بے چارہ یقیناً ان کے کام کے سلسلے میں دوزخ میں مصروف تھا۔

”میرا خیال ہے یہاں کی صورت حال پر ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ عابد نے خود کلامیہ انداز میں یہ کہتے ہوئے ہنسنے لگے۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اسی پر ام خالدہ بولی۔

”میرا خیال ہے آپ دونوں کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ دونوں اپنے اصل حلیے میں نہیں ہیں۔“ اس کی بات پر نامہ بولی۔

”بہشیرہ عزیز کی بات صرف حلیے بدلنے کی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ شامی کاغذات ہم سے مانگ سکتے ہیں، پھر ہم دونوں مرد و عورت کے جوڑے پر تو انہیں سب سے پہلے شہ ہوگا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھی لے جاسکتے ہیں۔“ نامہ پریشان ہو رہی تھی، کیونکہ اس کی وجہ واضح تھی، بڑی مشکل سے اپنی جائیں جو حکم میں ڈال کر تو یہ لوگ ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، اس پر کسی گہری سوچ میں مستغرق عابد ہنسنے لگا۔

کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آگیا اور ذرا پردہ سرکا کر یونہی باہر کا جائزہ لینے لگا۔ قلیت روڈ فینک تھا، ساری ٹریک نظر آ رہی تھی، سڑکوں کے کنارے واقع بازار۔۔۔۔۔ میں زندگی کی مصروفیات پوری شدت سے جاری تھیں۔ آسمان صاف تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا شور چاہوا تھا۔ چاکا عابد کے وجود میں سسکی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے مخصوص ساخت کی دو بھاری گاڑیاں حرکت کرنی دکھائی دیں۔ دونوں کا رخ اسی بلڈنگ کے مین باؤنڈری کیلٹ کی طرف تھا۔ وہ ان گاڑیوں کو پچاس فیٹ کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہی گاڑیاں تھیں جو اسے اسرائیلی ایجنسی کے کانڈو سینٹر میں نظر آئی تھیں، وہ دھڑکنے والے دل کے ساتھ دیکھتا رہا۔ گاڑیاں رکیں اور اس کے اندر سے مخصوص وردیوں میں مسلح افراد برآمد ہوئے، اب تو عابد کا ہاتھ ٹھکا۔ اسی لمحے میں نامہ بھی اٹھ کر اس سمت آ رہی تھی کہ عابد نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ فکری عابد نے فوراً کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور نامہ کو ساری صورت حال بتائی تو وہ بھی متوجہ سی نظر آنے لگی۔ عابد نے ام خالدہ سے پوچھا۔

”کیا طرخا سے اس وقت ملے گا کہ رابطہ ہو سکتا ہے؟“ ”میں کوشش کرے گی۔“ نامہ نے بولی۔ ”اس وقت کے نمبر پر ہی اس سے بات کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ وہ وہاں ہوں، لیکن بات کیا ہے۔۔۔۔۔ برادر عزیز کی؟“ اس نے آخر میں ابھی ہوئی نگاہوں سے عابد ہنسنے کی طرف دیکھا۔ عابد نے اسے بھی بتایا تو وہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ تاہم بولی۔ ”آپ لوگ ادھر ہی بیٹھو، میں خود جا کر باہر معلومات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے عمار بڑا سا اسکارف باغیچا اور قلیت سے نکل گئی۔ عابد اور نامہ مشترک سے کھڑے رہ گئے اور بے چینی سے ام خالدہ کی دانیسی کا انتظار کرنے لگے۔ عابد جلد از جلد طرخا سے فون پر رابطہ کر کے اسے اس تازہ ترین محدوش صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ تاہم انہیں کچھ اطمینان تھا کہ ان کے اصل حلیے بدلے ہوئے تھے کیونکہ کل رات ہی طرخا ان کے لیے ہلکا پھلکا ریڈی میڈ میک اپ کا سامان لے آیا تھا مگر۔۔۔۔۔ کاغذی شناخت وہ اپنی پھر بھی چھپانے سے قاصر ہوتے، اس کے لیے بھی طرخا نے انہیں کسی حد تک تسلی دی تھی کہ وہ کسی ایجنٹ سے بات کر کے ان کے موجودہ حلیے کے مطابق تصاویر اتار کے کاغذات میں ہیر پھیر کر اسے کی کوشش کرے گا۔

ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ”دونوں اگر ساتھ رہو گے تو شہر کی پہلی نظر تم دونوں پر ہی پڑے گی، تم دونوں کو الگ الگ ٹھکانا ہوگا۔“ اس کی بات پر عابد پھر ہنسنے لگا اور ایک نظر نامہ کے پیلے پڑتے چہرے پر ڈال کر طرخا سے بولا۔ ”اگر تمہیں یہ طریقہ نسبتاً زیادہ محفوظ لگ رہا ہے تو پہلے تم نامہ کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔“

”ہرگز نہیں، میں تمہارے بغیر حلیے سے نہیں نکلوں گی۔“ نامہ نے فوراً ٹھکرایا۔ عابد اس کی وجہ جانتا تھا اور شاید طرخا کو بھی کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ عابد نے طرخا کی طرف دیکھا۔ ”تم کوئی ایسا بندوبست نہیں کر سکتے کہ بے شک میں اور نامہ الگ الگ سفر کریں مگر حلیے سے نکلیں ایک ساتھ۔۔۔۔۔؟“ اس کی بات سن کر طرخا کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ایک گہری ہنسنے کی خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔۔ آج رات تم دونوں آرام کرو۔ اگلے دن میں تم دونوں کو یہاں سے نکالنے کا کوئی نہ کوئی محفوظ انتظام کرنا ہوں۔“ عابد اور نامہ نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اس دوران وہ ٹی وی پر چلنے والی شریات بھی دیکھ رہے تھے، جہاں چونکا دینے والی چیکنی چنگھاڑتی خبریں نشر ہو رہی تھیں، جس کے مطابق صلیب پر عظیم کھلی گھر تاج ہوئے۔ نامہ نے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ”یہاں عابد اور بی ایل ایس او کے بہادر مجاہدوں نے اسرائیلی ایگلی جس اور آرمی کو تانوں پتے چھوڑ دیے تھے جبکہ سرکاری دی وی میں اسرائیل اپنی اس ہزیمت کو چھپانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور کھلی گھر کی تباہی کے بجائے غلط روپورٹنگ دے رہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، ہاں البتہ کھلی میں کوئی فی خرابی پیدا ہونے کے سبب ایسا ہوا بہت جلد یہ خرابی دور کر لی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔“

عابد۔۔۔۔۔ نامہ اور طرخا۔۔۔۔۔ ”الحاجہ“ اور فلسطینی لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مجاہدوں کو دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔

اگلے دن دونوں دن چڑھے تک سوتے رہے۔ جاتے پر طرخا کی بیوی ام خالدہ نے بتایا کہ طرخا صبح سویرے ہی اپنے دفتر جا چکا تھا۔ نیز سستی سے تاکہ بھی کی تھی، یہ دونوں اس کے آنے کا انتظار کریں اور قلیت سے باہر بالکل نہ نکلیں۔

بہر طور مکمل وغیرہ کر کے یہ دونوں تازہ دم ہو گئے، پھر ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔ طرخا اور ام خالدہ کے دونوں بچے بہت پیارے تھے۔ اس دوران عابد چائے کا گمگ تھا

”میرا خیال ہے میں ان لوگوں کے ہتھے سرے سے چڑھتا نہیں جاؤں۔ جانے اب تک انہوں نے کتنے مشکوک لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا ہوگا۔“

عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ان کے فلیٹ کا دروازہ زور زور سے دھونڈھایا جانے لگا۔ ان کے چہرے فق ہو گئے۔ ”دروازہ کھلو۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔ ورنہ توڑ دیا جائے گا۔ پولیس۔۔۔۔۔ باہر ایک کرخت اور بھاری آواز ابھری تھی۔

☆☆☆

حسن اب اکیلا تھا مگر اندر جرمیوں کی یلغار سی جاری تھی۔ اس کا بازو زخمی بھی تھا مگر اسے اپنے رددی پرواکب تھی۔ دو آنے والے سب اسرائیلی فوجیوں پر اس نے برسات چلایا۔ ان کی پیش قدمی کو روکنے ہی وہ مختلف پتلی بورڈ کی آڑ لیتا ہوا راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بارق شمعون پر چھپا اور چشم زدن میں اسے گن پوائنٹ پر لے لیا۔ فوجیوں نے موساد کے اہم افسر کو حسن کی گن پوائنٹ پر دیکھا تو اپنی ٹیمیں اس پر تان لیں مگر وہ حسن پر فائر کرنے سے قاصر ہی رہے کیونکہ اس نے بارق شمعون کو اپنی ڈھال بناتا رکھا تھا۔

”خردوار۔۔۔۔۔ اگر کسی نے گولی چلائی۔ میری گن اس کے پائینٹ لکھو گے۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں گولیوں کی فرس پر گرا دو۔ جلدی۔۔۔۔۔ ”حسن خون خوار انداز میں غرایا۔ بارق شمعون کا کمر وہ چہرہ موت کے خوف سے تاریک پڑتا جا رہا تھا جبکہ اسرائیلی دستہ شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ حسن نے بارق شمعون کی پشت پر اپنی گن کی ٹال چھوئے ہوئے اس بار اس کے ذریعے ہدایت دلائی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”جیسے یہ کہہ رہا ہے ویسے ہی کرو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ مار ڈالے گا جان سے۔“

فوجیوں نے اپنی ٹیمیں فرس پر ڈال دیں اور اس وقت حسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے بارق شمعون سمیت فرار کے لیے دروازے کی طرف رخ کیا۔ وہ زخمی تھا۔ مگر یہ جوش و خروش تھا جس نے اسے پامردی کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے رکھا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں نے طوعاً و کرہاً اس کی پیروی کی تھی۔ دوسرا حکم حسن نے انہیں دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرنے کا دیا۔ بارق شمعون کی مکار آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ وہ زخمی حسن کی ”کنڈیشن“ کو نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی طرف سے حمایت کے جواب میں اپنے اندر کتنی طاقت رکھتا تھا۔ بارق شمعون

خود بھی باغی میں ایک ٹاپ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ جسے قابلیت اور ”سیناریو“ کے بل بوتے پر۔۔۔۔۔ موساد کا اسٹنٹ ڈپٹی اور اب اسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کی تجربہ بھارتی ہوئی مکار نگاہوں نے فوراً تاثر لیا کہ اس کا زخمی حریف اب۔۔۔۔۔ اپنی پہلے جیسی تیزی یعنی ”لان آف فاسٹ ایکشن“ کھو چکا ہے اور موقع ملنے ہی کسی بھی وقت اسے برسات چلا کے ختم کر دینے کے درپے۔۔۔۔۔ بارق شمعون نے اسی لیے فوجیوں کو مستعد کیا تھا کہ وہ بلا چون و چرا حسن کا حکم مانتے رہیں۔۔۔۔۔ جس کے باعث حسن کے انداز و اطوار میں وہ تیزی نہ رہی اور پہلی گولی ہی بارق شمعون کے اندر کے ٹاپ ایجنٹ نے فوراً بھاگ پٹی تھی۔ وہ اب اس سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھا کہ ایک موقع پر جب حسن نے دروازے سے اس سمیت باہر قدم رکھا اور حسن کی آنکھوں میں غیظ کا شعلہ چمکا۔ وہ بارق شمعون کو جنم دامن کر کے آگے کی راہ لیتا جا رہا تھا کہ دفعتاً دروازے کی غیر معمولی چوڑی چوکت پار کرتے وقت بارق شمعون نے دانستہ اس طرح جھٹکا کھا یا جیسے چوکت پار کرتے وقت اس کا پاؤں رہتا ہو۔ اس طرح وہ اپنی غیر ارادی حرکت کو ظاہر کرنے کی غرض سے دانستہ طور پر جھٹکا بھی کیا اور بل کے بل جیسے وہ اپنی پوائنٹ سے آگے بڑھتا ہوا اپنی گن کی تیزی سے حرکت میں آئی جس کی ضرب حسن کی زخمی ران پر لگی، حسن اس کی چالاکی کا سمجھ پایا۔ زخم کی ٹیس نے اسے ایک لمحے کے لیے لرزادیا اور اس دوسرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بارق نے اسے اپنے بھاری بھر کم کا دھڑے کی زوردار ٹھوک بھی رسید کر ڈالی۔ حسن جب تک اس پر اپنی گن سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، وہ خود کھڑا کر دوڑ جا کر۔

بارق شمعون نے اس دوران ایک اور خطرناک حرکت کی۔۔۔۔۔ حسن کے لڑکھانے کے باعث اس کے ہاتھ سے پھوٹی گن پر بھی گرفت جمانی چاہی مگر گرتے ہوئے حسن کی خوش قسمتی یہ رہی تھی کہ وہ راہداری کی دیوار سے ٹکرا کر گرا تو گن بھی چھوٹ کر اس کے پاس ہی گری، اپنے زخموں کی تاب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان اعصاب شکن لمحات میں بھی حسن نے جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گن پر جھپٹا مارا۔ ادھر بارق شمعون شکاری کو ”شکار“ بننے دیکھنے کی حسرت لیے اپنی جان بچانے پر ہی۔۔۔۔۔ موقوف ہونا پڑا اور فوراً حلق کے بل چیختا ہوا کمرے کے اندر دوڑ گیا۔

”بھیا رستہ لالو۔ شکار سامنے ہے۔“ فوجی جیسے جالی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گئے۔ حسن کو خطرناکی

کا احساس ہوا اور اس نے سنبھلتے سنبھلتے اندر برسات فائر کر دیا پھر ایک ہاتھ سے گن سنبھال ہوا کہ یڈور کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گن اب بیکار ہو چکی تھی، اس کا خالی بوجھ اسے گراں گزرنے لگا۔ وہ اس نے پیچک دی۔

وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا بازو سے سامنا ہو گیا۔ اس کی حسن پر نگاہ پڑی اور اسے مہتا اور زخمی پا کر بازو کی آنکھوں میں تشویش و فطرت کی لہریں سم آئیں، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر حسن کو سنبھالا، حسن پر بھی اب نیم غشی سی طاری ہوئے لگی تھی، بازو کے نرم سہارے سے اسے کچھ طمانیت محسوس ہوئی تھی جبکہ بازو اسے لیے۔۔۔۔۔ ایک کمرے کا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

”تم کسی طرح ایک عدد ہتھیار کا بندوبست کر سکتی ہو؟“ حسن نے ہاتھ کی ہوئی آواز میں بازو سے کہا تو

بازو بولی۔

”تم شدید زخمی ہو۔۔۔۔۔ تمہارا بازو اور ٹانگ بری طرح کھال ہیں۔ اپنی جان کی فکر کرو۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ تمہیں ہتھیار کی ٹیمیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔“ حسن کی حالت خیر ہونے لگی تھی، تاہم اس نے نیم غشی کی حالت میں کمرے کا دروازہ بازو سے لیے اپنے اندر دھکیلا۔ دروازے سے دوسری طرف ایک ایسی جگہ کے آئی۔۔۔۔۔ جدھر ایک دیوار میں سرنگ سے مشابہ عرابی دہانہ دکھائی دیا۔ یہ زینیں دوڑ جگہ معلوم ہوئی تھی، یا پھر اس کا اندرونی گوشہ کسی طویل قسمت سے جڑا تھا کیونکہ یہ کمرہ ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا مگر یہاں اسے بہت ہی ٹھوڑے ٹرائیاں موجود نظر آئیں اور ایک بیڑی سرنگ کے اندر غائب ہو رہی تھی۔ بازو نے ٹرائی سنبھالی اور حسن کو سنبھال کے اس پر سوار کر دیا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور ٹرائی کے چھوٹے سے قبیل پر نکلے چند بیٹوں کے ساتھ پھیر چھاڑ کرنے لگی۔ دوسرے ہی نے ٹرائی حرکت میں آ چکی تھی۔

”ہم کدھر جا رہے ہیں؟“ حسن نے پوچھا۔ اس کے لیے میں بیٹگی سی ابھن آمیز حیرت کا شائبہ تھا۔ بازو جواب بولی۔

”اپنے کمرے۔۔۔۔۔ میں اس ٹرائی کے ذریعے اپنے پاپا کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“ ان کی ٹرائی نیم تاریک سرنگ میں آگے کی طرف اپنے سفر پر گامزن تھی، سرنگ کی گول چھت پر کہیں کہیں بلب روشن تھے۔۔۔۔۔ حسن ہونٹ پیچھے چند ثانیے پر سوچ اور

کا احساس ہوا اور اس نے سنبھلتے سنبھلتے اندر برسات فائر کر دیا پھر ایک ہاتھ سے گن سنبھال ہوا کہ یڈور کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گن اب بیکار ہو چکی تھی، اس کا خالی بوجھ اسے گراں گزرنے لگا۔ وہ اس نے پیچک دی۔

نبی اسرائیل ملک پہنچے یہ زبیدہ اور اس کے دونوں
ساتھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر..... زبیدہ
کو کھن کی بھی فکر تھی۔ بجائے وہ کہاں اور کن حالات کا شکار
تھا؟ فرہاد اور عامر اس کے ہمراہ تھے نبی ملک کی آمد کے
ساتھ ہی ڈیوڈ اسرار کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے کونے کونے
میں ملک الموت بن کے کھیل چکے تھے، اب چارہ بندہ لو اپنا یہ
اہم مشن ادا ہو اور چھوڑ کر فرار ہونے کی حکمت عملی پر مجبور ہونا
پڑا، جو سردست مشکل کی نظر آ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں
نے دوڑ کر یروشلم اختیار کر لیا۔ وہاں جاکر انہوں نے کہا
پچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مقام پر ان تینوں کو اسرائیلی
دستے نے گھیر لیا..... یہ عمارت کا قلعہ بھی اور آخری گوشہ تھا.....
دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تو ناچار فرہاد
نے زبیدہ سے کہا۔

”عزیزی زبیدہ!..... آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں، میں اور عامر دشمنوں کو کور کر رہے ہوئے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر نہیں لوٹ سکتی۔“ نکلیں گے تو ساتھ ہی ”زبیدہ نے حتیٰ لچہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا تو عامر کو بھی بولنا پڑا۔

”فرہاد ٹھیک کہہ رہا ہے عزیز ی زبیدہ.....! آپ ہمارے لیے نہیں پوری مسلمان قوم کے لیے اہم ہیں۔ آپ کا بیچ لکنا ہم سے زیادہ ضروری ہے..... خدا کے لیے اپنی قوم اپنے آدوس کی خاطر..... مانیں ہماری بات۔ یہ یہودی کہے کہ آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے ہم انہیں نہیں آپ ہیں۔“ زبیدہ نے اندرونی کرب سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چبھنے لگے۔

”سوچتے کا وقت نہیں..... عزیز می!..... آپ پوری

فلسفیانہ توہم کی ہی نہیں امت مسلمہ کی بھی امانت ہیں۔ ابھی ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ فرہاد نے بھی حرمش سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو زندہ رہنا ہے ابھی..... ہم سب کے لیے..... صادق الخیرؒ کی اور قیصر انگریجی جیسے جاں باز عباد کا رخ بھی ابھی ہمارے سینوں میں تازہ ہے۔ ہم آپ جیسی عظیم عبادہ کے مزید کسی ایسے زخم کے ہر زخم محل نہیں ہو سکتے..... جو خدا خواست ہماری کمر توڑ دیں۔“

زہیدہ نے ایک گھری سانس لی۔ ایک مجبور سی نگاہ
بچے دونوں سماجی مجاہدوں پر ڈالی اور وہاں سے رخصت
ہو گئی۔ فرہاد اور عامر اسرائیلی کوچیوں کے سامنے اس وقت
تک ڈٹے رہے، جب تک ان کے بھتیجا ساتھ ویجے رہے
اور زہیدہ ان کی پیروی سے دور نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں
نے بالآخر جام شہادت نوش کر لیا۔ اس امید فرما کے ساتھ کہ
بہت جلد ان کی دلیر لیڈر زہیدہ تازہ دم ہو کر اسرائیلی
ظالموں کو خاک جانتے پر مجبور کر دے گی۔

☆☆☆
 کہی گئے بیت چکے۔ ارض فلسطین کے لہو افق سے
 پوچھنے لگی تھی مگر اب اس صبح کی پییدی بحر میں مظلوموں اور
 نیتے بے گناہوں کے فریادی لہو کی سرخی شامل تھی جو ابھی
 اصل پییدہ کی تھی۔ یہ صبح تو کبھی نہ ہو سکتی تھی۔
 ہونے کی آس باقی تھی۔ ابھی کل لالہ کا دامن دل و جان
 اپنے ہی لہو سے خوں رنگ تھا۔ ابھی مٹی بھر سرِ مردِ شانِ وطن
 کے اسلام کے سودائے جنوں خیزی کی ردفکری جاری تھی تو
 دوسری جانب انسان نما شیطانی ٹولوں کی چال گری بھی
 عروج پر تھی۔ حق و باطل کی جنگ کے میدان کا زارِ ایش اگر
 ایک طرف رقص الٹیں نظر آتا ہے تو دوسری طرف آبروئے
 وطن اور اسلام کی سر بلندی کی خاطر جامِ شہادت نوش کرنے
 والے پرچمِ اسلام کے نام پر دھن زنجیر بکریں کرتے نظر
 آتے ہیں۔ غلط ہے ان کی سوچ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ
 صرف فلسطین کی جنگ ہے۔ مگر کہ نہیں..... یہ تو پورے عالم
 اسلام کی جنگ ہے۔

جزل آنکھ فرماش کی حالت اس وقت خارش زدہ
 کہے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی بال نوچنے پر مجبور ہو رہا
 تھا۔ یہی حال باریق شمعون کا بھی تھا۔ دونوں اپنے اپنے
 ساتھیوں، ایہود شاہک اور امخانی شامیر سے محروم ہو چکے
 تھے مگر اس سے زیادہ ان کی خارش زدہ حالت ہونے کی
 وجہ حریت پسندوں کا اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر پر کامیاب حملہ
 تھا۔ جس کے باعث ان کی اس قدر سکی اور روانی ہوئی کہ

ان کے دیرینہ خواب ”عظیم تر اسرائیل“ کو عالمی سطح پر سخت ذلت و ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہی نہیں اسٹیجی کلکی گھر کی آڑ میں ان کا یورپیہ افروزدی کا پلاٹ بھی تباہ ہو گیا تھا پھر تینائی میں ڈیوڈ اسٹار کی عمارت پر چھاپا مار چاہوں کا حملہ بھی کم نہ تھا۔ جس میں اگرچہ فلسطینی عبادوں کے دوسرے گروپ کو خاطر خواہ کامیابی تو نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حملہ بھی پوری یہودی قوم اور اسرائیل کی اوپنی ناک کو کاٹنے کے ہی مترادف تھا۔ چونکہ یہودیت کا تیسری سرکاری اور دغا بازی سے اٹھا تھا اس لیے انہوں نے حتی الوسع کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر پر فلسطینی چھاپا ماروں کے حملہ کو از میں رہنے دیا مگر ڈیوڈیون حملہ اور اسٹیجی کلکی گھر کی تباہی کے واقعے کو چھپانے سے قاصر رہے تھے کیونکہ اس کی تباہی سے پورا یہود عزم اور قتل انبیب اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اسے بھی فی خرابی کا تام ڈسے کر اپنے سین چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی مگر وہ اس زخم کا اندھا حلقہ انتقام لینا چاہتے تھے۔ فلسطینی اور عرب بستیوں کے مظلوم اور مستعصم لوگوں پر گولہ باری اس طرح کی بزدلانہ کارروائی یہودیت کا بنیادی شیوا تھا۔ اس پر فی الفور التور کھیرا ہونے کے لیے اسرائیلی اتھارٹی نے فوراً چار ہڈوں کی ایک

یہ لفظ اسرار کا سربراہ ہنزل آکر لے کر پیش تھا۔ دوسرا موساد کا
ایجنٹی چیف ہارن شمعون، تیسرا یہودی ایجنٹی جسے یونٹ
”بگائے“ کا ڈائریکٹر آنرز میں بھی اور چوتھا انٹرویوین
سینئر کا چیف انچارج شمیر گویان تھا۔ جبکہ پانچواں ڈائریکٹر
آنرز میں کو ”شن بیٹھ“ نامی اسرائیلی کاؤنٹر ایجنٹی جس کی بھی
فہرست داریاں سوچی گئی تھیں جو ”الیاہیہ“ (aliyah
beth) کا بانی بھی تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ موساد اور یوڈ
سارور حقیقت ”ہنگائے“ اور ”شن بیٹھ“ کا بانی ایک پولینڈ
خود یہودی آنرز میری تھا جو صرف بیس سال کی عمر میں
1901ء میں ایسٹریچ میں پیدا ہوا تھا، وہ اس یہودی تحریک
کا تخیل جاں نثار تھا جو یوڈی غاصب سے ایک سازش کے تحت
نیا یجر سے یہودیوں کو فلسطین پہنچ کر آباد ہونے کا مشورہ دیا
کرئی اور پھر اس کا بندوبست بھی کرتی تھی۔

آنرز میری نے حیف سے اپنی ملکی زندگی کا آغاز ایک
راج ستری کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی اس نے اپنی
تفسیرشن معنی قائم کر لی لیکن چند سالوں میں اس کا وہاں
گل گیا تو یہ وہاں پولینڈ آگیا۔ پھر یکا یک اس کی زندگی
پس انتخاب آیا اور 1938ء میں جب وہ دوبارہ اسرائیل

دوست کی خاطر

ملنگی بہت ظالم ڈاکو تھا اس کے خوف کے پیش نظر لوگ کہتے تھے۔ دے راج فرنگی داتے راتی راج ملنگی دا۔ عدالت سے سزا کے طور پر جس دن اس کو اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی جانی تھی۔ تو صبح سویرے جیل سپرنٹنڈنٹ اس کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”ملنگی کتنی منزل آگئی ہے اپنے آپ کو اس سفر کے لیے تیار کرلو۔“ ملنگی نے جواب میں یہ کہا کہ ملنگی موت کو دردمسرا معمولی خراش سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے گرفتاری کا سبب پوچھا تو ملنگی نے گرفتاری کا سبب بتایا کہ ہمارا ساتھی جواب بھی اگلی کوٹھڑی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے گرفتاری سے پہلے جنگل میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھے تھے ہمارا یہ ساتھی اس وقت بھی قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا اچانک ہمارے جاسوس نے پولیس آنے کی اطلاع دی ہم بھاگنے کو تیار ہو گئے اگر ہم اس وقت بھاگ کھڑے ہوتے تو کبھی گرفتار نہ ہو سکتے لیکن ہمارے ساتھی نے کہا ”میں جب تک قرآن مجید کا یہ پارہ ختم نہ کر لوں تلاوت نہیں چھوڑ سکتا۔“ ایک طرف اس ساتھی کے ساتھ موت اور دوسری طرف زندگی کے لیے فرار۔ ان دو صورتوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے دوست کے ساتھ مرنا گوارہ کر لیا کہ جو شخص قرآن دوتی کے مقابلے میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا ایسے دوست پر اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہیے۔

مرسلہ محمد جاوید شیر بربرہ علی پور مظفر گڑھ

چٹینیت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں بے گناہ معصوم شہریوں کا بڑی سفاکی سے گواہ بن گیا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف انسانی لاشیں، چھتروں کی صورت نظر آنے لگیں۔ کہیں معصوم۔۔۔ شیر خوار بچوں کے اجڑے بچڑے اعضا بکھرے نظر آتے تو کہیں صرف پرگوشٹ کے کوٹھڑے۔ اسرائیل کی اس ننگی جارحیت سے زمین و آسمان تھرا اٹھے مگر کرب ناگ الیہ تو یہ تھا کہ اس ظلم اور سفاکانہ بربریت کے انسانیت سوز شیطانی کھیل کی عالمی سطح پر پورے رنگ اور پی کی کورنگ بھی کی گئی مگر باوصف اس کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور عالمی امن کے داعی امریکا کے سر پہ جوں تک نہ رہیں، ان کے بعد سب ”ناٹھا“ پڑ گیا۔ حکومتی سطح پر احتجاج رکھا ڈر دیا گیا تو ڈرتے ڈرتے۔۔۔ یوں جیسے کسی چوہری کی ہینٹک میں کوئی خرب حزار عد ڈرتے ڈرتے اپنی مرضی پیش کر رہا ہو۔۔۔ عرب کنٹریز کے طعام خانوں میں لٹھے کے لیے لیے دسترخوان۔۔۔ بھانت بھانت کے سن و سلوی لکھانوں سے بھرتے رہے لیکن کسی نے خاطر خواہ طریقے اور ذرائع سے اسرائیل کی ریشہ دوانیوں کے آئینہ سہرو ہونے کی کوشش نہ کی۔ اقتدار کے بھوکے گدھے مردہ خوری کے ہی منتظر رہے مگر کسی نے امریکا کے آئینہ سہرو ہونے کی کوشش نہ کی۔۔۔ اس طرح نہ چلی کیا، جو حالات کے متقاضی تھا۔

ادھر فلسطینی مظلوموں کی اجڑی بچڑی بے گور و کفن لاشیں۔۔۔ بہ ظاہر مردہ آنکھوں سے آسمان کو کھتی رہیں اور خالق کائنات سے ہی انصاف مانگتی رہیں۔

ابھی فلسطین اپنے ہی خون میں نہایا ترپ رہا تھا کہ مسیحیوں نے ان کی غیرت و حمیت پر ایک اور چمکا لگایا۔ آئرلینڈ میں بری کے اگلے مکروہ پلان کے مطابق یہودیوں نے مسلمانوں کے قبلاہول مسجد اقصیٰ میں گھس کر اپنی مذہبی رسومات اور کارناموں کو گدس۔ اس کے بعد بھی بے رحمی کرنے والوں میں اکثریت اسرائیلی فوجیوں اور مشرود یہودی آباد کاروں کی تھی جو پہلے بھی مختلف رسومات کی ادائیگی کے بہانے سے مسجد میں گھس کر بے رحمی کے مرتکب ہوئے۔ ان میں اسرائیل کے اٹلی میس الکار بھی شامل تھے۔ جو بڑی تعداد میں مسجد کے اندر مسلمانوں کی سرگرمیاں مانیٹر کرنے اور پیکل سلیمانی کی تعمیر کے یہودی منصوبے کی تکمیل کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔

آج بھی مسجد کے اندر دراندازی کے دوران یہودیوں نے نئی ایسی کارروائیاں کر ڈالیں جن سے اسلامی

مجرور کرنا ضروری تھا، یہ ان کا دہرا انتقام لینے کا پرا، مذموم طریقہ کار تھا مگر ساتھ ہی آئرلینڈ میں بری جو نیئر نے ایک نیا بیڈنٹ بھی پیش کر دیا۔ جسے اسرائیل کا بینک کے ارکان نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد آئرلینڈ نے اپنی بدینیت آواز میں میٹنگ کے شرکائے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔ ”حریت پسندوں کی ایسی کارروائیاں ہمارے مگر اسرائیل پلان کو ہمیشہ سے ہی سوتا ڈکرتی آئی ہیں لیکن ہمیں اس کا متوڑ جواب بھی دینے دینا ہوگا مگر مصلحت سے بالاتر ہو کر ہمیں اس ایسی پر عمل کرنا ہوگا جو فلسطینیوں کو بری طرح کھلے اندر عرب بستیوں اور علاقوں پر ہمارے قدم مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوں۔“ سب نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

آئرلینڈ کے اس نئے بیڈنٹ کے مطابق اردن کی سرحد سے متصل مسلمانوں کے تاریخی و ثقافتی علاقے ”وادئ اردن“ (اغوار) کو مسیوہی ریاست میں ضم کرنا تھا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد اسرائیل مشرقی بیت المقدس اور وادی کولان کی طرف پر اس علاقے میں بھی اپنے قوانین لاگو کرے گا۔ اس مقدس وادی میں امت مسلمہ کے امین حضرت عبیدہ بن جراح اور علیہ السلام علیہ السلامی معاذ بن جبل بیت المقدس کے امام اور کئی علماء و ائمہ کی قبریں ہیں۔ آرم گا میں ہیں۔ یہ مقام کئی تاریخی اور مذہبی حوالوں سے پوری امت مسلمہ کے لیے مفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناپاک اور متنازع مسودہ قانون کو وہاں موجود اسرائیلی حکمران جماعت ”لیکود“ اور اس کی اتحادی ”جیوش ہوم“ کے دزرا کی پہلے ہی سے حمایت اور تائید حاصل تھی، جس کے مطابق مقبوضہ وادی اردن کو مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس کی طرح اپنے انتظامی کنٹرول میں لانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ کابینہ میں لیکود اور جیوش ہوم کے آٹھ وزرا نے اس متنازع قانون کی حمایت کر ڈالی۔ ان وزرا میں رکن پارلیمنٹ میری ریکی بھی تھا جو اس سے قبل وادی اردن میں یہودی بستیوں کی تعمیرات سے متعلق قانون سازی پر عمل درآمد کی بھی نگرانی کر چکا تھا۔ اس متنازع مسودہ قانون کی منظوری اور میٹنگ کے اختتام کے بعد اسرائیل کا شرمناک اور انسانیت سوز شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔

چیتنے چکھا ڈتے دیو قامت اسرائیلی جنگی طیاروں نے فلسطینی اور عرب بستیوں پر وحشیانہ گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ غزہ کو کھنڈر بنا دیا۔ نیچے معصوم اور بے گناہ فلسطینیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، مسیوہی

وہاں بھی اس کا ز پر مصروف کار تھی۔ مشن بیٹھ بالخصوص امریکا اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں مختلف اسلامی ممالک سے اسکالرشپ ”سٹراڈی“ کے لیے آئے ہوئے مسلمان طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور ان کے مستقبل کو سیوتا ڈ کرنے کے لیے ہر اوجھا جھٹکا استعمال کرتی تھی جیسی الزامات کے ساتھ ساتھ وہ حسین یہودی عورتوں کو بھی استعمال کرتے تھے، جو انہیں بے راہ روی میں جتلا کر کے اپنے مقصد سے بھانے کا باعث بنی نہیں بنتے بلکہ اپنے ملک اور قوم کی بھی بدنامی کا سبب بنتے۔

آئرلینڈ کے لیے بھی یہ ایک بڑا ختم تھا PLSO اور الجھاد نے اسے تہذیبی اور ثقافتی آپریشن کی صورت میں دیا تھا۔ بین اسی طرح جیسے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی سات سنگال فورس نے اپرا سالٹ ون اور ٹو کے ذریعے جنس آپریشن کے دوران غضب خدا کے فلسطینی مجاہد رہنما طیل الوڑ پر اور بی فرنٹ کے صادق الخیری کو شہید کر کے فلسطینیوں کو دم دیا تھا۔

اس جنگی میٹنگ میں اسرائیلی حکومت کی پارلیمانی کمیٹی بھی موجود تھی اور ان سب کے چہرے بری طرح تھے ہوئے تھے، بگاڑ آری کے آئرلینڈ میں بری جو نیئر کو اسرائیلیوں کے یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان میں اس کا حکومتی مکمل داری میں بھی موساد اور ڈیوڈ اسٹار سے زیادہ دخل تھا۔

آئرلینڈ میں بری جو نیئر ایک لہارتیگا اور کالی رنگت کا گول چہرے والا کنٹر یہودی تھا۔ سر بالکل گنجا، ناک قدرے پچی ہوئی تھی جبکہ چند ہی چند آنکھوں میں ہلا کی مکاری ایک خباثت لیے ہوئے تھی۔

اسٹین لیس اسٹیل راڈز کی سپاٹ میزکریوں پر یہ سارے اکابرین بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے ناپاک اذہان میں خون مسلم بہانے کے لیے بے چینی پھیلی ہوئی تھی، آج یہ مفت فروع و انہیں انتقام کے نئے میں اندھے ہو کر بیت المقدس قبلاہول اور اراضی فلسطین کے خلاف مذموم اور بھیا تک فیصلہ کرنے والے تھے۔

میٹنگ کی ابتدا پہلے تو دھواں دھار انداز میں ہوئی اور وہاں موجود سب ہی گویا پہلے سے اس بات پر متفق ہوئے بیٹھے تھے کہ الجھاد اور PLSO کی ان چھاپا مار کارروائیوں کا بدلہ یہ لوگ فلسطین کے معصوم اور نیمہ عوام سے لیں گے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ صرف مار باری میں پورا انتقام نہ ہوگا۔ انتقام کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات بھی

110 جولائی 2015ء

”میں نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے کمال!“ جینی نے ایک موڈ کاٹتے ہوئے خیریت کہا۔

تمام ترقیاتی اور کسی حد تک نظریاتی ہم آہنگی کے باوصف ان دونوں کے درمیان بھی بحث چھیڑ جایا کرتی تھی، مگر باوجود اس کے دونوں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھ لینے تو ایچھوتوں کی طرح حقیقت بھی ہوجاتے۔

”تم لوگ بھی سب سے بڑی غلطی کرتے ہو کہ ہر کسی کو سب سے پہلے مذہب اور پھر بعد میں فرقے کی بینک سے دیکھتے ہو۔ کیا ہمارا ایک دوسرے سے محض انسانیت کا تعلق نہیں ہو سکتا؟ میں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کر رکھا ہے اور جس قدر میں نے مذہب اسلام میں کشادگی، روشن خیالی اور وسیع النظری دیکھی ہے وہ مجھے آج تک کسی اور مذہب میں نہیں نظر آسکی۔ تمہارے پیغمبر اسلام نے بھی انسانیت کے درس کے ساتھ ہی ایک خدا اور ایک کتاب (قرآن مجید) کی تخلیق کی۔ خود ان کی اپنی زندگی انسانیت کی اعلیٰ معراج کا نمونہ نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ تو مجھے بھی یاد آتا ہے تمہارے پیغمبر کا کوئی کافر عورت ہر روز ان کے اوپر کھڑا پھینکا کرتی تھی، ایک روز ایسا نہ ہوا تو تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ ان کافر عورت کے گھر تشریف لے گئے، کافر عورت کو حیرت ہوئی۔ آپ کے اس دورے سے فرمایا۔ ”آج تم نے مجھ پر کھرا نہیں پھینکا تو میں سمجھا کہیں تمہاری طبیعت نہ خراب ہو۔ تمہاری خیریت پوچھنے آ گیا ہوں۔“ اس کافر عورت پر اس حسن سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً مکہ پڑھ کر مسلمان ہوئی۔ غرضیکہ تمہارے پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ آپ کے حسن اخلاق اور آپ کے کامل انسانی نمونے کو تو غیر مذہب کے لوگوں نے بھی کشادہ دلی سے تسلیم کیا ہے۔ آپ کی ذات پاک تو خود ایک اللہ، اسلام اور آخری کتاب کا تبلیغی پرچار کرنے والی ذات تھی مگر.....

میں معذرت چاہوں گی ڈاکٹر کمال کہ میں آپ کی بات تو نہیں کرتی لیکن تم میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو مذہبی انتہاپنہ کی طرف گامزن ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ایک دوسرے کو فرقوں کی بنیاد پر جان سے مار ڈالتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک انسان کا نکل پوری انسانیت کے نکل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ”جینی نے اپنی بات ختم کی تب تک یونیورسٹی کیسپس کے گیٹ کے قریب ان کی کارکنج بھی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو ایک عجیب سی چپ کھائی تھی، اس سے پہلے وہ بھی جھٹتا تھا کہ پیغمبر یعنی جینی محض اس کی دوستانہ حمایت میں اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اسے جینی کی

باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی مذہب اسلام کے بارے میں خاصا مطالعہ رکھتی ہے اور ایسے ہی سنا نہیں ہوئی۔

”ایسا سب سازش کے تحت ہوا۔ مسلمانوں کو مسلمان سے لڑانے کے لیے۔“ ڈاکٹر کمال نے کہا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی آواز میں جھنسی جھنسی کی محسوس ہوئی۔

”دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے غالب۔“

دفعۃً ہی جینی کے لبوں سے غالب کی شاعری کا یہ مصرع ادا ہوا جس نے ڈاکٹر کمال کو صبح معنوں میں ورط حیرت میں ڈال دیا۔ وہ ایک تک اس کا چہرہ دیکھا رہ گیا۔

”مسٹر کمال!..... بے شک ہر فرد کے پیچھے ایک بڑی سازش ہی کارفرما ہوتی ہوگی مگر سازش کی بناؤ کی بھی بھڑکتی ہوئی آگ کے چولہے پر ہی پختی ہے تم لوگوں کے پاس بہترین ضابطہ حیات ہے ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب..... پھر اس سے آگے تم کیوں آپس میں بحث و مباحثوں میں پڑتے ہو.....؟“ جینی نے کہا اور کیسپس کی پارکنگ میں کار روک کر نیچے اتر آئی۔ ڈاکٹر کمال بھی اتر آیا۔ جانے کیوں اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو جینی کی نگاہوں میں چھوٹا محسوس کرنے لگا ہے۔

اسے جینی کی غلطی معلوم ہوئی اور یہ غلطی اسے نہ سونچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جینی بھی اس کی طرح اپنے فکری شعبے سے ہٹ کر کچھ ایسی اضافی تاج بھی رکھتی تھی جس سے انسانی دماغ اور دل کشادگی اور وسیع النظری محسوس کرتا ہے اور روح کی تسکین کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، لیکن آج ڈی کے طالب علم جن کے مطالعے میں دنیا جہاں کی معلومات اور غیر تصانیبی اسٹڈی کا موجود ہونا بھی ایسا کچھ ایسا عجیب کی بات نہیں ہوتی۔

پھر جب دونوں ہاسٹل بلاک کے قریب پہنچ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے سے پہلے ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے تو ڈاکٹر کمال نے مسکرا کر کہا۔ ”جینی! آج مجھے صبح معنوں میں تمہاری دوستی پر فخر اور خوشی ہے لیکن میرے کہنے کا مقصد اب بھی وہی ہے کہ تم نے انسانیت کے نامے ہی سے ہمارے مسلم فلسفہ میں بھائیوں کے حق میں ہمارے ساتھ مل کر آواز بلند کی۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے مگر تم نے کیا۔“

جینی کے نرم گلابی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور وہ ”اے اے“ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

پیغمبر سنوئیر..... مقامی ہونے کے باوجود ہاسٹل میں ہی رہنا زیادہ پسند کرتی تھی، اس کے مطابق گھر کے مقابلے

میں یونیورسٹی کیسپس میں پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم پر ابھی توجہ دیتی تھی۔

کچھ دن گزرے تھے کہ یونیورسٹی کی آرٹ اینڈ ہسٹری کی فیکلٹی میں ایک اسکارلر کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ایک برطانوی نژاد لبرٹریگ کالامیوڈی ڈی کارلو تھا۔ انتہائی متعصب ذہنیت کا مالک ڈی کارلو ایک شری پسند یہودی تھا۔ اس نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے مسلمان طلباء کا جینا حرام کر دیا۔ آئے روز وہ یونیورسٹی، سینٹرل کینٹن، ہاسٹل غرضیکہ جہاں اور جہاں سے صبح ملتا وہ مسلمان طلباء کو تنہیک کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے کچھ ہم خیال گوروں کا بھی ٹولہ بنا رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کمال کا ہم عمر ہی تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ فریڈ کارلو..... برٹش پارلیمنٹ کا رکن اور اقلیتی امور کا وزیر بھی رہ چکا تھا اور برطانیہ کی مقتدرہ شخصیت میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے اثر و رسوخ کا حامل تھا۔

متعصب ڈی کارلو..... سے امن پسند مسلم طلباء کئی کئی بارنے کی کوشش کرتے، وہ جانتے تھے کہ اس کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ وہ اس کی ہرزہ سرائی کی شکایت کرنے کی ہمت کرتے تھے، ڈی کارلو دانستہ جہر مسلم طلباء کی ٹولی کو دیکھتا اپنے ٹولے کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور مسلمان اور اسلام کے خلاف بیانات کا نشانہ بن جاتا۔ ایک دن اس کی مذہبی ڈاکٹر کمال سے ہوئی۔ دونوں ہم عمر اور یکساں قد و قامت کے تھے..... ڈاکٹر کمال کے بارے میں ڈی کارلو نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا اور بڑی شہود کے ساتھ اسے اس کی تلاش بھی مگر چونکہ ڈاکٹر کمال قاتلہ اوقات میں ادھر ادھر بیٹھنے کے بجائے سیدھا لائبریری کا رخ کرتا اور اضافی وقت وہیں گزارتا تھا۔ جینی بھی کبھی کبھار اس کے ہمراہ ہوتی، تو چاہے وغیرہ کی غرض سے..... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے سینٹرل کینٹن میں آ جاتے۔ ڈی کارلو کے ایک ساتھی نے اسے ٹیوڈا دے کر..... سامنے اشارہ کرتے ہوئے قدرے جھجک کر اس کے کان میں کچھ کہا..... ڈاکٹر کمال جن کے ساتھ بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھا، درمیان میں دو میزوں کا فاصلہ تھا۔ ڈی کارلو نے مستثنائی نظروں سے گردن ذرا گھما کر ڈاکٹر کمال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر نفرت انگیز تاثرات ادا آئے۔ چند ہی چند آکھوں میں شرچہ ہونے لگا۔ وہ کلام اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دانستہ پیچھتا ہوا سیدھا ڈاکٹر کمال اور جینی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جینی اسے پہچانتی تھی کمال نے بھی اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔

”کیا تم ہی وہ بڑے اور تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کمال ہو جو آئے روز ہائیڈ پارک سے جا کر اسرائیلیوں کے خلاف کچھ اچھالتے ہو؟..... یہ خیال کیے بغیر کہ جس ملک (برطانیہ) نے اپنی اعلیٰ تعلیمی درس گاہ میں تم جیسے پیغمبر پاکستانی گواہیشن دیا اور لندن جیسے جدید شہر میں تمہیں رہنے کا موقع دیا جس کے تم لوگ صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہو۔ وہاں آکر..... تم اس طرح کا انتشار پھیلاتے ہو اور اس کی فضا کو خراب کرتے ہو۔ شرم آتی چاہیے نہیں۔“

متعصب اور لمبے ترنگے کالے یہودی کی آواز کسی افریقی تیل کی طرح سینٹرل کینٹن میں گونج رہی تھی اور وہاں موجود بھانت بھانت کے ممالک سے آئے ہوئے طلباء یکدم خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں مسلم بھی تھے اور مقامی گورے بھی..... مکار یہودی کارلو نے ان کو روک کر کچھ خوش کرنے اور اسکاٹے کے لیے..... برطانیہ (لندن) کی بھی تریف کر ڈالی تھی۔ کئی ایک کے چہروں پر استہزائی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے شرارت آمیز شوق بھی مترشح تھا۔ جینی پریشان نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال نے یہ ظاہر بڑے تحمل سے یہ سب سنا پھر اپنی شفاف عدسے کی بینک درست کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی بھی اس کی طرف دیکھنے میں لگی۔ وہ بڑی کڑی نظر سے اس کے منہ لگے بغیر وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

ڈی کارلو اور اس کے ساتھی ٹولے کا ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال بھی دیگر مسلم طلباء کی طرح ڈی کارلو کی ہرزہ سرائی کا جواب دینے بغیر وہاں سے ٹھکے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ یہ ان بے چارے امن پسند اور ذہین اسکارلر مسلم طلباء کی مجبوری تھی کہ وہ اس طرح کے شرادہ گفتگو سے بچنے ہی کی کوشش کرتے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے کینٹن کے ہال میں سرگوشیوں کی سرسراہٹیں بلند ہونے لگیں اور پھر اس وقت سب کو یکدم سانپ سوکھ گیا جب انہوں نے ہال میں ڈاکٹر کمال کی پرجوش آواز گونجی تھی۔

”تم مجھے تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کہہ کر یہاں کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“ ڈاکٹر کمال نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں سے بینک اتارتے ہوئے ڈی کارلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت پلکے گرے گھر کے کوٹ پیٹ میں ملیں تھا جبکہ ڈی کارلو نے نائٹ جینوں پر صرف شرٹ پہن رکھی تھی اور کہیں سے بھی مہذب طالب علم نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آگے بولا۔ ”تمہاری اس ہرزہ سرائی



خبری انہیں سنائی کہ اس نے انہیں قبر میں روانہ کرنے کا ایک خفیہ بندوبست کر لیا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج رات ایک بچے کا گوشت سا پیس (قبرس) کی طرف روانہ ہوگا اور دونوں کو الگ الگ اس کے عملے کے طور پر اس میں سوار کرانا پڑے گا۔ جہاز کا کپتان عرب لبنانی تھا تاہم اس کا موٹی زہری تھا۔ طلحہ نے اسے پہلے ہی عابد شیکری اور ناعمہ کی پھوینچ سے متعلق آگاہی دے دی تھی۔ مسافر بردار جہاز سے زیادہ کارگو شپ میں عملے کے لوگوں کے ہمیں میں ان دونوں کا حیفہ کی بندرگاہ سے روانہ ہونا زیادہ مناسب اور محفوظ تھا۔

عابد کا اس روز بہت جی چاہا کہ وہ ایک بار اپنے باپ اور بہن سے ملنے کی بات کرے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ آگاہ کر دے۔ مگر طلحہ نے اس کا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس میں خطرہ تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس ان کی کال ٹریس بھی کر سکتی تھی اور راہ فرار کا سارا منصوبہ ٹل بھی ہو سکتا تھا۔ بہر طور طلحہ نے اور کچھ ٹی وی ریلے والی یوز سے یہ بھی پتا چلا کہ اس وقت اسرائیلی انٹیلی جنس اور خفیہ پولیس وغیرہ جرئت پسندوں کی تازہ کارروائیوں کے باعث اسرائیلی مشینری اس میں بری طرح الجھی ہوئی۔ تنہا آریٹن اور پی فرنٹ کے صادق الخیری کی اسرائیلی انٹیلی جنس کے خوفی دستے کے ہاتھوں شہادت کے بعد ”الجلاد“ اور PLSO نے اسرائیلی کوناکوں پتے چھوڑ دیے ہیں اور ان ٹی مھر پیادہ فلسطینی کفن بے دوش مجاہدوں نے موساد اور ڈیوڈ اسٹارکو ٹی کا ناچ بجا رکھا تھا۔

بہر حال طلحہ کا منصوبہ بے داغ تھا۔ ایک بار پھر ان لوگوں نے منصوبہ کی جزئیات پر غور کیا اور بالآخر طے یہ پایا کہ عابد تو ایک عیسیٰ کے ذریعے سب سے پہلے مذکورہ جہاز راں یعنی کے آفس پہنچنے کی کوشش کرے گا اور وہاں سے عملے کو بندرگاہ پہنچانے والی کوششیں... وہاں پہنچے گا جبکہ ناعمہ کو طلحہ ایک عیسیٰ کے ذریعے عین اس وقت پہنچنے کے دفتر

ذہن اس مشکل اور جان لیوا صورت حال پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب اس نے ام خالدہ کو آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کا کہہ دیا اور خود لپک کر دوسرے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اس کے پیچھے پرچا نکا۔ کھڑکیاں کشادہ تھیں اور بیس پر بھی پاؤں نکال کر کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ کھڑکی انہوں نے باہر سے بند کر دی۔ وقت گویا ان پر بھاری سل کی طرح مسلط ہو گیا تھا۔ جو گزرے نہیں گزرتا تھا۔ اندر جانے کیا ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عابد شیکری اور ناعمہ ساتھ ساتھ جڑے اونچے ہاتھی اپارٹمنٹس کی عمارت کی بارہویں منزل پر تھے۔ جان پر جی ہوئی تھی، یہ حصہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا اور دور ساحل سمندر کا منظر تھا۔ کافی دیر بعد کھڑکی کھلی کسی ممکنہ اور متوقع خطرے کے پیش نظر دونوں کے دل یکساں کی زور سے دھڑکے، پھر وہاں ام خالدہ کا چہرہ طلوع ہوتے دیکھ کر دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ام خالدہ انہیں وہاں نکال دیکھ کر ایک لمحے کو تو متحیر ہو گئی، پھر بولی۔ ”اندر آ جاؤ..... وہ حل کئے ہیں۔“

دونوں آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب آئے، پہلے عابد نے ناعمہ کو کھڑکی کے اندر داخل کیا پھر خود نہایت احتیاط کے ساتھ اندر دھا یا۔

”ابھی کی قسم کاہنہ نہیں جا؟“ اندر سے اس نے کہا۔ اگر عابد نے سوالیہ لگا ہوں سے ام خالدہ کی طرف دیکھا۔ ”دروازہ دیر سے کھولنے پر وہ اسرائیلی کے برہم ضرور ہوئے تھے۔“ وہ جواباً بولی۔ ”مگر میں نے بھانہ کر دیا کہ میں باجمہ دوم میں تھی اور بچوں کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔“

”ہوں.....“ عابد نے پرسوج ہرکاری بھری۔ ”میرا خیال ہے، خطرہ ٹل گیا۔“ ناعمہ نے کہا۔ ”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ ام خالدہ بولی۔ ”تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ باہر نکل کر جائزہ لے کر آؤں گی۔“ پھر تھوڑی دیر بعد خالدہ دوبارہ عیسیٰ کی بارہ نکل گئی۔ ناعمہ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمودار تھے، جسے محسوس کرتے ہوئے عابد نے نفی آمیز لہجہ میں اس سے کہا۔ ”پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ سے دعا کرو۔ ہم اللہ کا شکر و خیر و عافیت جھ سے نکل جائیں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ ناعمہ نے زیر لب کہا۔

خالدہ نے آکر انہیں مڑوہ جانفزا سنایا کہ اسرائیلی فوجی جا چکے ہیں۔ دونوں نے بے اختیار طمانیت کی سانس لی۔ اس کے دو گھنٹے بعد طلحہ بھی آ گیا۔ اس نے بھی ایک خوش

بل بوتے پر کھڑا پڑتا ہے اور یہی بات انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے پر بھیڑ کرتی ہے۔ تو بھلا ایک ترقی یافتہ ملک کے نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکھانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اسے دیے ہی گھر بیٹھے ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ اب رہی بات تمہاری ہائیڈ پارک سے متعلق تو ایک معمولی آدمی کو بھی اپنا جائز موقف پیش کرنے کی یہاں قانونی اجازت ہے اور ہم نے بھی اس قانون کی پاسداری میں ہائیڈ پارک میں پرامن احتجاج کیا..... مگر تم..... مسلم دشمنی کے لہجے میں اندھے ہو کر یہاں کیا گل کھاتے پھر رہے ہو..... سب جانتے ہیں۔“

ڈاکٹر کمال نے اپنی بات ختم کی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹیکہ دوبارہ اپنے چہرے پر چڑھائی اور دھواں دھواں سج پڑے والے ڈی کارلو کو دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اٹھائی۔

جس وی۔ اس وقت ہاں میں ڈاکٹر کمال کی اس منہ توڑ جوابی تقریر پر میز پر جتنا شروع ہوئیں اور ”شیم..... شیم.....“ کی آوازیں بھی گونجنے لگیں۔ ڈی کارلو کا سیاہ رو چہرہ احساسِ تزلزل سے سج ہو کر رہ گیا۔ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا جبکہ ڈاکٹر کمال میز سے اپنی چند کتابیں سمیٹ کر پر دوڑ چال کے ساتھ سینیٹرل کینٹین سے دروازے کی طرف دوڑا۔

اس منہ توڑ جواب کے بعد ڈی کارلو کی طرف سے دوبارہ مسلم طالب علم کے ساتھ بدتمیزی یا ہرزہ مرائی دیکھنے میں نہیں آئی، پوری یونیورسٹی نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ تک بھی ”مذاکرے“ کی جھلک پہنچ گئی تھی، ایک طرح سے وہ بھی خوش تھے کہ ڈی کارلو جیسے ”کالے تیل“ کو ٹیل ڈال دی گئی تھی کیونکہ وہ خود تو ڈی کارلو کے باپ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکے تھے، اور یہ سب بے چارے چند مسلم طلباء کے ساتھ ہی ہو رہا تھا، بھلا فقار خانے میں طوطی کی کون سا ہے۔ لہذا انتظامیہ میں جیٹ پویش اختیار کیے ہوئے تھے۔ تاہم مسلم طلباء بالخصوص عیسیٰ کا خیال تھا کہ اس طرح کی کراری جوابی کارروائی سے ڈاکٹر کمال..... اس متعصب یہودی ڈی کارلو کو اپنا دشمن بنالیا ہے مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چونکا تھا اور لندن بھی قیصر و سرکاری کے دربار سے کیا کم تھا۔

☆☆☆

اس کرخت آواز پر دونوں کے چہرے فٹ ہو گئے۔ ام خالدہ بھی بے چاری ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ عابد کا

کا جواب میرے پاس بالکل سادہ سا ہے کہ دوسرے پر اس طرح کی تمہاری لغو الزام تراشی درحقیقت تمہارے خود کے متعصب ہونے پر دلیل کرتی ہے اور ہاں تمہارے اس طرح کے اشتعال انگیز کر تو توں سے کون واقف نہیں ہے کہ تم خود اس معزز اور مہذب تعلیمی ادارے کا امن یا مال کرنے کی نیت سے آئے روز امن پسند مسلم طلباء کو کھٹک کا نشانہ بناتے رہتے ہو..... مگر وہ اس ادارے کے تعلیمی اقدس کو ہال نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی تمہارے جیسے کے ساتھ منہ ملتے ہیں، اب رہی بات ایک بڑبڑولے کی..... جو ہائیڈ پارک میں..... اسرائیلیوں کے خلاف پکڑا اٹھاتا ہے تو اس بڑبڑولے کے منہ سے تم بھی سن لو..... یہ کچھ..... بلکہ کاٹک..... اسرائیل نے خود اپنے منہ پر لی ہے۔ خود کو دنیا کی تعلیم قوم ثابت کرنے کے جنون نے تم غاصب یہودیوں نے اپنے ہی کر تو توں سے خود کو دنیا کی نظروں میں ملوٹوں اور پست ذہنیت قوم ثابت کر دیا ہے۔ فلسطین کے نیچے، بے گناہ اور مظلوم انسانوں پر اس طرح کی فتنی جارحیت کہاں کا انصاف ہے۔ آبادیوں والے علاقوں میں مہارطیادوں سے وحشیانہ کولہ باری کرنا کدھر کا دستور ہے؟ مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنا کہاں کا شیوا ہے؟ رہی بات انہیں میں کمرہ میں اسرائیلی مسلمان طلباء کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا..... تو..... یہ صرف برٹش حکومت کی خارجہ پالیسی ہی نہیں ہے..... دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی سب کچھ ہے..... اس طرح یہ ممالک..... درحقیقت اپنا ایک خلا پر کرتے ہیں، بہترین دماغوں کا خلا..... اعلیٰ تعلیم یافتہ اور Skill Persons اور ذہین لوگوں کا خلا..... کیونکہ ان افراد کی شرح ترقی یافتہ ممالک میں وہ نہیں ہے جو اب ہونی چاہیے۔ لہذا ایسے ترقی یافتہ ممالک ان تیسری دنیا کے ملکوں سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے ہوئے ان لوگوں کو بڑی بڑی آفرز دے کر ہائر کر لیتے ہیں۔ انہیں قابل بنا کر واپس اپنے وطن جانے سے روک لیتے ہیں اور ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے..... مذکورہ ممالک میں اس خلا کی وجہ بڑی محسوس ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں ہر عام اور چھوٹے سے چھوٹے شہری کو ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ بیروزگاری والا ڈس سے لے کر کسی کو معمولی کھانسی بھی ہو جائے تو ایبویٹس اسے لینے رات کے دو بجے بھی گھر آ جاتی ہے۔ ان کا معمولی سے معمولی دوسرے بھی حکومت نے اپنے ذمے لیا ہوتا ہے جبکہ تیسری دنیا کے لوگوں کو یہ سب آسائشیں حاصل نہیں یہ سب کچھ ان بے چاروں کو خود اپنے

جدالتظام

ظاہر حب اوید معسل

دل کا سارا نظام اللہ نے جانے کیوں پردے میں رکھا ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا احساسات کا معاملہ... اس کا دل بھی بہت اچھا تھا لیکن سرخ آنکھوں میں ایک دکھ کا احساس جھلکتا تھا۔ یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کئی پردوں میں چھپا ہوا... دل میں درد کی لہریں اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پہرے... عجب تماشا ہے زندگی بھی...

گم شدہ محبت کے سلال میں جتلا
ایک حسینہ کا مجرا



میں شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی، اس کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ حساس تھی، ذرا سردی یا گرمی لگی اور بیماری نے آن و لو جا۔ نزلہ زکام اور بخار بھی وہابی ٹیٹنیں بھی مجھے بڑی جلدی آ پکڑ لیتی تھیں۔ ایسے دنوں میں اکثر ای چندن کے لیے مجھے اسکول سے چھٹی کر لیتی تھیں۔ میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی زیادہ تھی۔ سارے کہتے تھے کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ پیاری ہوں۔ شاید اس وجہ

بہر طور عابد یہاں اتنی سخت چینگ دکھ کر یہ بھی سوچتے پر ضرور مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی سیکرٹ سروس کی نظروں میں کسی قدر "اہمیت" اختیار کر گیا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ وہ نہ صرف ساڑھے سات سو غریب الدیار اور جلاوطن فلسطینیوں کو ان کے وطن میں واپس پہنچانے کا سبب بنا تھا بلکہ اس نے آئندہ بھی اس نیک مقصد کو اپنا مشن بنانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ اسی طرح گامے... لگا ہے دیگر جلاوطن اور بے گھر فلسطینیوں کو ان کے وطن ضرور واپس لائے گا۔

بہر طور وہ نازک مرحلہ آن پہنچا۔ انیس قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ نامہ کا نمبر عابد کے بعد تھا۔ عابد نے اسے آخر میں تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ یعنی نامہ چینگ کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے لیکن بد قسمتی سے عابد دھرایا جائے تو نامہ خاموش رہے گی اور قبر میں روانہ ہو جائے گی اس پر نامہ نے بھوری نگاہوں کے ساتھ عابد کی طرف دیکھتے ہوئے بلاتل کہہ دیا۔

”اور اگر میں پکڑی جاؤں تو پھر... تم خاموشی سے شپ میں سوار ہو کر سا پھر کن روانہ ہو جانا۔“

نامہ کی اس بات پر عابد نے اختیار ایک گہری سانس لے کر دیا۔ ”تم جتنا چاہو... یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔“

”تو پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا عابد کہ میں تمہیں خطرے میں چھوڑ کر خود...“

”پلیز! نامہ... سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر محبت بھری رسائی سے بولا۔ ”تمہاری بات اور ہے... اب بحث کا وقت نہیں رہا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں، ویش اس!“

چینگ ہوتی رہی... عابد کا نمبر لگا سافر مشین میں اس کا مختصر بیگ چیک کیا گیا اور پھر اسے آگے جانے کی اجازت مل گئی، آگے انگلڈر تھا۔ باقی عمل وہاں سے گزرنے لگا۔ نامہ کی باری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ عابد اسے دیکھنے کے لیے دروازے کے ایک طرف ساڑھیں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے باقی ماندہ عمل کی چینگ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ سو قسم کے اندیشاںک وسوسے سر اٹھا رہے تھے، بالآخر عابد کی دھڑکی نظروں نے نامہ کو چینگ کاؤنٹر پر آتے دیکھا۔

(جاری ہے)

پہنچائے گا جس وقت کو سٹرڈ کوہ کارگو شپ کے عملے کو لے کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو رہی ہوگی۔

رات ساڑھے بارہ اور ایک بجنے کے درمیان عابد دھڑکی ایک شینے ٹرکی میں سوار ہو کے کپنی کے دفتر روانہ ہو گیا۔ ٹرکی نے اپنی آج کی دوڑ میں عابد اور نامہ کی جھین بڈی ہوئی تصویروں کے ایسٹائیٹ کارڈز بھی تیار کروا لیے تھے... عابد خلاصوں (ملارح) کے شے سے متعلق تھا جبکہ نامہ ”ڈائمنڈ کار“ کے شے میں تھی۔

مقررہ وقت میں یہ دونوں عملے کی کوٹر میں الگ الگ سیٹوں پر سوار ہو کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بندرگاہ پہنچنے کے بعد... متعلقہ کپنی کے آفس روم میں جا کر ان دونوں نے دیگر متعلقہ عملے کو لوگوں کی طرح Muster roll پر اپنے اپنے سائن کیے۔ مخصوص

وردیاں چڑھائیں اور کسٹم چینگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

عابد کی عقلی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ساتھ ہی گامے یہ گامے وہ نامہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ٹرکی نے سختی سے اس بات کی تاکید دونوں کو کر رکھی تھی

کہ ان کے بشروں سے گھبراہٹ یا ڈر و خوف کا شائبہ تک نہیں جھلکانا چاہیے۔ ورنہ وہ چینگ کرنے والوں کی نظروں

میں پکڑی جائے گی۔ اس کی بات کو اس نے یاد رکھا۔ اس کی نظروں میں ٹھٹھک جائیں گے اور انکو اڑی ہو جائے گی۔ یہ

اسرائیلی ایجنٹ پہ ظاہر عام لوگوں کی طرح چینگ کے مرحلے سے بہ خیر و عافیت گزر چکے کے بعد بھی ان کے شپ میں

سوار ہونے تک ان پر خفیہ نظریں رکھیں گے لہذا شپ روانہ ہونے تک کسی قسم کی جلد بازی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت تو عابد دھڑکی کو بھی معلوم تھی کہ عام حالات میں مسافر بردار شپ کے مقابلے میں کارگو شپ کے عملے کی

اتنی سخت چینگ نہیں ہوتی مگر اب حالات اور تھے، بندرگاہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس بار کارگو شپ کی بھی سختی سے چینگ

ہورہی تھی مگر اس وقت عابد کے اور... ٹرکی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جن پر اسرائیلی کسٹم یا انٹیلیجنس کوڈرا

بھی شبہ ہو رہا تھا وہ ان کے چہروں پر اموینا اسپرے بھی کر کے جانچ رہے تھے کہ کسی نے اپنا اصل چہرہ ریڈی میڈ

میک اپ کے پیچھے چھپا رکھا ہو تو وہ ظاہر ہو جائے۔

اس وقت چینگ کے دوران یہی ہو رہا تھا تاہم عابد کو ٹرکی کی ایک عقل مند پر اطمینان بھی تھا کہ اس پر یا نامہ پر کسی کوشش نہیں ہوگا کیونکہ عملے کا ریکارڈ فوٹو سمیت دو گھنٹے پہلے کسٹم کاؤنٹر پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

سے سب مجھ پر توجہ اور دھیان بھی دیتے تھے جس کی وجہ سے میں اکثر بیمار ہو جاتی تھی۔ ادھر کسی کو چھپک آئی ادھر میں نے بھی چھپکنا شروع کر دیا۔ موسیٰ بخار کے دن آئے تو سب سے پہلے میرے منہ میں تھریا میٹر آیا۔ آشوب چشم شروع ہوا تو سب سے پہلے میری آنکھوں میں لالی اتری۔ بڑی چالچی میرے لیے پختانی کا ایک محاورہ استعمال کرتی تھیں..... جس کے معنی کچھ یوں تھے..... جس گڑ کی بہت ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً ذرا خراب ہی ملتا ہے۔

میرے ابو ایک ملٹی پٹنل ہسپتال میں آفیسر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ اچھی گزربھر ہو رہی تھی۔ میرے دو چچا بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لاہور کی ایک جانب کشادہ رہائشی آبادی میں یہ دو منزلہ مکان تھا۔ یہ تیس چالیس سال پہلے ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ دادا تو اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، وادی حیات تھیں اور ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑے چچا کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے ماشا اللہ تین بچے تھے۔ چھوٹے چچا جو بڑے چچا سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے، حال ہی میں شادی شدہ ہوئے تھے۔ چھوٹی چچی کا نام سارہ تھا۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر رہی تھیں۔ کافی اسمارٹ اور دلکش تھیں۔ مجھے ان کے لیے گھنے بال سب سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی۔

چھوٹی چچی سارہ بڑے اچھے طور اطوار کی مالک تھیں۔ ہر ایک کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رہتی تھیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا لیکن چھوٹی چچی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے اسے ”چھوٹا“ کہا ہے لیکن میرے لیے شاید یہ چھوٹا نہیں تھا۔ چھوٹی چچی کو اکثر الاربی رہتی تھی۔ ناک سرخ رہتی، کبھی کبھی آنکھوں سے پانی بھی نکلتا اور وہ ہاتھ میں رومال یا ٹشو پیپر پکڑے نظر آتیں۔ سردی شروع ہوتی تو انہیں کئی دفعہ چھینکیں مارتے بھی دیکھا۔

امی، ابو اور خاص طور سے امی کو وہم کی حد تک میری صحت کی فکر لاحق رہتی تھی۔ امی نے ایک دن بڑی خاشاخی سے مجھے کہہ دیا کہ میں چچی سارہ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ ایسے معاملوں میں، میں خود بھی بہت حساس ہو چکی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چچی سارہ سے قدرے دور رہنے لگی۔ خاص طور سے جن دنوں ان کی ناک سرخ نظر آتی یا آنکھیں سوچی سوچی ہوتیں..... یا وہ دیے ہی پڑ مرود دکھائی دے رہی ہوتیں۔ چچی سارہ دادا کے ایک دوست کی

پوتی تھیں۔ یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ چچی سارہ کی الاربی کو بھی اسلام آباد کے موسم سے ہی تھکی کیا جاتا تھا۔ وہاں ہوا میں غالباً کسی طرح کا ”پولن“ تھا جو شہر کے اکثر مکینوں کو اس مصیبت میں مبتلا کر رکھتا تھا۔

جو کچھ بھی تھا لیکن چچی سارہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کسی وقت میں اسکول سے ملنے والا ہوم ورک لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے ہوم ورک کراتیں کہ میں حیران رہ جاتی۔ بھران کی دلچسپ باتیں، ان کا پیار بھرا انداز اور ان کے گزربھر لیے رسمی بال جو حرکت کرتے ہوئے بار بار ان کے دو دھیان چہرے پر آ جاتے تھے اور جنہیں وہ اپنی خوب صورت آنکھوں سے پیچھے ہٹاتی تھیں لیکن اس قسم کے موفقیہ کم ہی آتے تھے۔ خاص طور سے جب امی گھر میں موجود ہوتیں، میں اس طرح کارنگ ہرگز نہیں لیتی تھی۔ امی اور چچی سارہ کے درمیان دلچسپ اور پختانی کا رشید تھا اور اس رشتے میں اکثر شکایتیں اور تکیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم اس معاملے میں بھی چچی سارہ کا جھکاؤ اکثر مفاہمت اور صلہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔ چچا، چچی کے آپس کے تعلقات بھی شیک ہی تھے۔ دونوں مہینے میں ایک بار لاہور سے اسلام آباد جاتے اور واپسی پر ہم سب چول کے لیے لاہور ہی پہنچ جاتے۔ چھوٹے چچا کے دو درمیان وغیرہ لاتے۔ مجھے یقین ہے میرے اور چچی کے درمیان خوب جتنی اگر ہمارے درمیان یہ الاربی والا معاملہ نہ آ جاتا۔

اب اتنے برسوں کے بعد میں سوچتی ہوں۔ چنانچہ کیوں ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ برائے نام مسائل کو بڑے بڑے دوسوں اور دایموں کا روپ دے دیتے ہیں۔ چچی سارہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو گزربھرا ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے دھیرے بھڑتا رہا۔ میں ان سے کبھی بھی رہنے لگی۔ دلی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھتی اور نہ ہی ان کے کمرے میں جاتی۔ بچپن کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک دن چچی سارہ ہم آنکھوں اور سرخی مائل ناک کے ساتھ کمرے سے نکلیں اور چھت پر چلی گئیں۔ بڑے چچا نے بڑی چچی نیلے سے کہا۔ ”لگتا ہے، سارہ کو پھر الاربی کا ایک ہوا ہے۔“

بڑی چچی نیلے سے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔ ”کوئی الاربی ورچی نہیں ہے، میں ڈرامے کرتی ہے..... کچن سے دور ہنا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔“

اس بارے میں بڑے چچا اور بڑی چچی میں کچھ اور

باتیں بھی ہوتی ہوں گی لیکن میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ بس چچی نیلے کا ایک اڑتا اڑتا سا طرہ یہ جملہ میری سماعت سے ضرور گزرا۔ ”یہ الاربی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔“ یقیناً یہ جملہ چچی سارہ کے لیے ہی تھا، میں ہی دن تک ابھن میں جھارہی، پھر یہ بات خود بخود ذہن سے نکل گئی۔

ایک دن چچی سارہ اچھے موڈ میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ بھی نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتویں کلاس کے پیر تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چچی چھت پر بیٹھی دوپ سینک رہی تھیں۔ میں اپنی میتھ کی بک لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے دو چار سوالوں کے صل میں مدد ملی پھر انگلش گرامر کے دو تین سوال ان سے پوچھے۔ چچی محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ مجھے پڑھاتی رہیں پھر ایک دم کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔ ”نادو! کیا بات ہے۔ تم دور دور رہتی ہو مجھ سے۔ پچھلے ہفتے میرے سر میں اتنا درد رہا، تم نے حال تک نہیں پوچھا؟“

میں کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی لیکن پھر چچا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے چچی کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چچی چچی بتاؤں، آپ برا تو نہیں مائیں گی؟“

”نہیں، بالکل نہیں مائیں گی۔“ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کو پتا ہے، مجھے بڑی جلدی نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ امی میرے لیے ہر وقت ڈری ہوئی رہتی ہیں۔ آپ کو اکثر الاربی رہتی ہے۔ اس لیے میں ڈرا دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یقین کر بس امی کے بعد پورے گھر میں مجھے سب سے زیادہ آپ اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھی رہوں، آپ سے باتیں کرتی رہوں۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور میرے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔ ”تو پھر بیٹھی رہا کرو، باتیں کرتی رہا کرو۔ تمہیں کاشی دیتی ہوں کہ میری الاربی تمہیں نہیں لگے گی۔ بیماری کے جراثیموں سے چار کے جراثیم زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے جراثیموں کو مار دیتے ہیں۔“

میں مسکرا دی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا یا شفقت سے میرا ہاتھ مارا اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے الاربی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

اسی دوران میں امی اوپر آئی تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ چھوٹی چچی نے مجھے گلے سے لگا رکھا ہے۔ ان کے

کترانیں

☆ روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے لیکن اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔

☆ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔

☆ دل کو توڑنے کے لیے ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔

☆ محبت میں گزارنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا دوست کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی کا الیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل الیہ یہ ہے کہ ہم جیتا بہت دیر بعد دیکھتے ہیں۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان مجازوں سے نہیں بھڑوں سے ٹوکتا رہتا ہے۔

☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کچھڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ ہر اوقات وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے داغ کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی پیش کو بھی روک لیتا ہے۔

☆ خالی پیٹ، خالی جیب اور جھوٹا دوست انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو بڑے سے بڑا استاد بھی نہیں سکھا سکتا۔

☆ اپنا فائدہ سوچتے بناسب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ بھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشی بھردور رہ جاتی ہے۔

☆ ہر ملہ۔ رمضان خونی کر پڑوی اورنگی ناؤن، ہر کراچی

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جزائی یونانی اور کمزوری اور اعصابی اس ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (جسٹ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کتنا پکار کرتی تھی۔ میں کئی دن کتنے کی سی کیفیت میں رہی۔ میرے اندر جیسے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوئی بھی کچھ کا ایک عرصے تک ایک بے نام خوف کی وجہ سے میں کیوں ان سے دور دور رہی۔ پھر کبھی بھی ایک بھولا ہوا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا۔ یہ فقرہ ایک مرتبہ بڑی چچی نیلمہ نے ایک زہریلی سرکشی کی صورت میں بڑے چچا سے کہا تھا۔ وہ بولی تھیں۔ ”اے الارجی ورتی نہیں ہے۔ بس ڈر اے کرتی ہے۔“ پھر شاید بڑی چچی نے یہ بھی کہا تھا۔ ”الارجی سے زیادہ خطرناک بیماریا ہے اسے۔“

الارجی سے زیادہ خطرناک؟ کیا چچی سارہ کسی اور خطرناک بیماری میں بھی مبتلا تھیں؟ کوئی ایسی تکلیف جسے ان کے میکے والوں نے چھپایا تھا اور پھر وہ بھی چھپاتی رہی تھیں۔ وہ کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہ سوال میرے لیے ایک پہلی بن کر رہ گیا تھا۔

چچی سارہ کی موت کے غم نے کم و بیش تین ماہ تک مجھے گھیرے رکھا۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بڑے بڑے سنگین صدمے دھیرے دھیرے اپنی شدت کھوٹنے لگتے ہیں۔ گردش روز و شب..... ہر وقت رستے دھول کو خشک کرنے لگتی ہے۔ میں بھی بڑھائی کی مصروفیت میں اس قدر مگن ہوئی کہ کوئی خاص بات یاد نہ رہی۔ میں نے اپنی امتیازی کمروں سے پاس لیا اور پھر بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یاسر کے ساتھ بھی تعلقات معمول پر تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملنے تھے اور جب نہیں ملتے تھے، تب بھی ایک دوسرے کے خیالوں میں گم رہتے تھے۔ سر دیوی کی طویل راتیں، گرمیوں کی حسین شاہیں، ساون کی خوب صورت چھڑیاں اور بہار کی چمکیلی خوشبودار آوازیں، ہماری محبت کی گواہ تھیں۔ ہر پانچواں موسم گم کا بھی تو ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ یہ موسم خزاں میں ہی آئے۔ یہ موسم کسی بھی موسم میں انسان کو دبوچ سکتا ہے۔ مجھے اور یاسر کو اس موسم نے سر دیوی کی نہایت خشک شاہوں میں دبوچا۔ یاسر کی والدہ پر فاق کا حملہ ہوا اور ان کا ایک بازو اور ٹانگہ بے کار ہو گیا۔ انہیں اسپتال میں داخل کر لیا گیا اور علاج پر آمندھا دھندلے خرچ ہونے لگا۔ یاسر کا سائنڈ لاسٹ سمسٹر بھی بی بی اے میں رہ گیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر ان لوگوں کو اپنی ایک دکان اونٹنے پونے پتہ پناہ پڑی۔ یاسر کی بڑی بہن کی شادی کی تیاری تھی، وہ تیاری بھی دہلیان میں ہی ایک گئی۔ لڑکے والوں کو تاریخ دی جا چکی تھی۔ یاسر نے جیسے جیسے بہن کی ڈولی تو رخصت کر دی لیکن اس کے لیے اسے اپنی دوسری دکان بھی فروخت کرنا

ایسی باتیں ہم ہمیں مذاق میں کیا کرتے تھے۔ میں اب اتنی نازک مزاج بھی نہیں رہی تھی جتنی بچپن میں تھی۔ نزلہ زکام بھی اب کافی دھنسنے کے بعد اثر انداز ہوتا تھا بلکہ اس حوالے سے میں تقریباً نارمل ہی ہو چکی تھی۔ عمومی صحت بھی اب پہلے سے کافی اچھی رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم دونوں کا تعلق ”محبت“ میں بدلی گیا۔ امی کی اجازت سے میں بھی کھار یاسر کی بانیگ پر بھی کالج سے واپس آ جاتی۔ یاسر کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت خیال رکھنے والا اور ہر درد انسان تھا۔ امی، میری اور اس کی انیسیت سے آگاہ ہو چکی تھیں اور شاید ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار بھی تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یاسر پہلے اپنے ہیروں پر کھڑا ہو۔ یاسر کے والد فوت ہو چکے تھے اور یہ لوگ ابھی تک اندرون شہر سات آٹھ مرلے کے گھر میں رہتے تھے۔ یاسر سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی ابھی شادیاں ہونا باقی تھیں۔ یاسر اور اس کے گھر والوں کی گزشتہ تین دکانوں کے کرایے وغیرہ سے ہو رہی تھی۔ میرے ابو اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھے لیکن اتنی لپک انہوں نے اپنے اندر ضرور رکھی تھی کہ اگر یاسر کو اپنی جاب مل گئی اور اس نے اپنی مالی حالت بہتر کر لی تو وہ اس بارے میں فوراً کریں گے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک روز میں کالج سے گھر لوٹی تو مجھے ایک دروغ سنا۔ یہ سنا کہ یاسر ایک ایسی خوب بھلی بارے میں تھی جس کو میں نے کچھ عرصے سے تقریباً فراموش کر رکھا تھا۔ مجھے گھر والوں کی زبانی پتا چلا کہ چچی سارہ اپنے گھر کے پاس ہی ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہو گئی ہیں اور انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ہم لوگ بھگم بھگم شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اس اسپتال میں پہنچے۔ وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پر تھیں۔ ان کے سر پر اور بڑھ کی ہڈی میں شدید چوڑیں آئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ امید سے بھی تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ گھر کی قریبی مارکیٹ سے سبزی لینے کے لیے پیدل ہی نکلی تھیں۔ ایک نقلی سڑک سے آنے والی تیز رفتار اسکوٹر وین نے انہیں ٹکرائی اور وہ دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئیں۔ وہ بڑی دلچراش شام تھی۔ سورج کے ساتھ ہی چچی سارہ کی زندگی کا سورج بھی ڈوب گیا۔ وہ آپریشن ٹیبل سے زندہ نہیں نکل پا گئیں۔ وہ مصوم بچوں اور غمزدہ خاندان کو چھوڑ کر وہ قبرستان کی گہری تاریکیوں میں جا گئیں۔

ان کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سے

چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ کھڑ گیا۔ پہلے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ مجھے داغنے ہوئے بولیں۔ ”دو چار دن ہو گئے ہیں نا ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے۔ اب پھر بیمار ہو کر بیٹھ جانا۔ اوپر سے امتحان سر پر ہے۔“ کل بھی ہوا جو اکی انشا اللہ۔ وہ پاؤں چٹختی ہوئی پیچھے اتر گئیں۔ چچی کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی امی اور چچی کی لڑائی کے خیال سے سہم گئی اور جلدی سے کتا میں سمیٹ کر پیچھا اتر آئی۔

اس واقعے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا مزید کم ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابو اور دونوں چچاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ایک ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چچا نے لاہور ہی میں ایک علیحدہ گھر لے لیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس بھی کھار فون پر بات ہو جاتی یا پھر فلی کے کسی فکشن میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی مجھ پر پڑھائی کا بوجھ بتدریج بڑھ گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان قریب آتے جا رہے تھے اور ابودن رات مجھے محنت کر رہے تھے۔ ابونہ ہوتے تو بڑے بھائی جان مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور میں رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی۔ گھر والے مجھے ڈاکٹر سے ملاتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ ڈاکٹر سے مل کر کچھ بن جاؤں تو پھر الارجی دودھ وغیرہ کی قیادت میں اسپتال میں کر دیں لیکن انسان کی درخواست تو پوری نہیں ہوتی۔ بس تین چار نمبروں کے فرق سے مجھے پری میڈیکل میں داخلہ مل سکا۔ دوسرا آپشن بی بی اے کا تھا۔ مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں اسکالر شپ پر داخلہ مل گیا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اسٹیڈی شروع کر دی۔ میرا ہر نتیجہ بہترین رہا۔ کلاس میں اول پوزیشن جیسے میرے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی کالج میں میرا ایک فرسٹ کزن یاسر بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ ”بی بی اے“ کے ففٹھ سمسٹر میں تھا۔ ہم دونوں خالہ زاد تھے۔ میں تو عمری ہی میں یاسر سے دانٹنگی محسوس کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کے بعد یاسر سے زیادہ ملنا جلنا ہوا تو یہ دانٹنگی، انیسیت اور پھر کلاؤں میں بدلنا شروع ہو گئی۔ یاسر میرے مجھے ”جی ٹی ٹی“ چھیڑتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ”تم چھوٹی موٹی کا پھول ہو۔ یہ پھول تازگی چھیننے والی ہر چیز کا اثر فوراً قبول کر لیتا ہے۔“

میں مسکرا کر کہتی۔ ”تو تم تازگی چھیننے والی چیز نہ بننا۔“

”دل پر کسی کا بس تو نہیں ہوتا۔ کیا پتا، جو وعدہ میں آج کروں، کل اس پر قائم نہ رہ سکوں۔“

پڑی۔ والدہ کی بیماری نے مسلسل اخراجات کا راستہ کھول رکھا تھا۔ آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک روز گھر میں میرے ابو اور امی کے درمیان تند و تیز باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کی بازگشت میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ مجھے پتا چلا کہ ابو نے امی کو سختی سے کہہ دیا ہے کہ یا سر ہمارے گھر میں زیادہ آمد و رفت نہ رکھے۔

میں آنسوؤں کے ٹھونٹ بھر کر رہ گئی۔ حالات مسلسل ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جا رہے تھے۔ انہی دنوں پتا چلا کہ یا سر نے فی الحال اپنی پڑھائی کو مؤخر کر دیا ہے اور اپنی آخری دکان کو اپنے استعمال میں لے آیا ہے۔ اس نے وہاں کمپیوٹر پارٹو ویٹر کی فروخت کا کام کر لیا تھا۔ انہی دنوں میرے ابو اور یا سر کے ایک تالیف کے درمیان لین دین کے تنازعے پر سخت تشویش باتیں بھی ہوئیں۔ اس واقعے کے بعد میرے اور یا سر کے رشتے کی امید تقریباً ختم ہو گئی۔ ابو میرے ہونے والے شوہر کو کسی ایسے سرکاری یا نیم سرکاری عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یا سر اور اس کے گھر والوں سے خوش نہیں تھے۔

قریباً ایک سال تک یہی دھوپ چھاؤں والی صورت حال چلتی رہی۔ پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ جو بھی میرا بی بی آفس میں ملازمت تھا، ابو اور امی نے اسے بھی گھر میں لے کر آکر لڑکے کا کام تو فقی عہدہ۔ اچھی ملازمت تھی۔ وہ مراعات تھیں۔ ترقی کے امکانات بھی روشن تھے۔ ان تمام تر ”روشن امکانات“ کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ سننے میں ہر وقت جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرتا رہتا تھا لیکن یہ آبشار دل میں سلگتے ہوئے انگاروں کو کھٹکا نہیں کرتا تھا، مزید بھڑکا رہا تھا۔ انہویوں کی امید انسان کے دل میں ہمیشہ رہتی ہے۔ میں بھی اپنے دل میں یہ امید پالتی تھی کہ پانچ چھ ماہ ابھی باقی ہیں۔ ان پانچ چھ ماہ میں ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور میں اپنی محبت کے اس دردناک انجام سے بچ جاؤں گی۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ جذلوں کی موت اور سمجھوتوں میں لپٹی ہوئی ایک نئی زندگی کی شروعات۔ توفیق سے میری شادی ہو گئی اور میں دلہن بن کر لاہور سے ملتان چلی گئی۔

دعہ اتنی جلدی نہیں بھرتے۔ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے غم میں اس وقت کا انتظار کرنے لگی۔ میری تین تہذیبیں تھیں، ایک دیور بھی تھا۔ میں خود کو سارا دن ان لوگوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔ توفیق

آتے تو زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی۔ اور خود کو توفیق کی گرم جوشی میں کمر کرنے کی کوشش کرتی۔ ان کی ہانہوں کی حرارت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ میں سب کچھ بھول جاتا چاہتی تھی لیکن جتنی شدت سے بھول جاتا چاہتی، اتنی ہی شدت سے وہ یاد بھی آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں۔ شادی سے چند روز پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا تھا لیکن خدا حافظ کہہ دینے اور الوداع کر دینے سے تو کوئی دور نہیں چلا جاتا۔ جیسے شہر بے بے، بے بے ہیں، اسی طرح یادوں کے گھر بھی خالی ہوتے ہوتے خالی ہوتے ہیں۔

برسات کی ایک اداس شام تھی۔ اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگی ہوئی تھی۔ اچانک توفیق کی کار کا بارن سنا دیا۔ میں بوجھتی رہ گئی۔ وہ دووہائی گھنٹے پہلے ہی دفتر سے وہاں آ گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین دفعہ مجھے روتے ہوئے پکڑ چکے تھے۔ میں نے امی ابوی کا دکا بھانہ بنایا تھا اور انہوں نے مجھے سختی کے ساتھ، رونے دھونے سے منع کیا تھا۔ آج پھر یہی صورت حال بن رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ قریب ہی ایک باسکٹ میں پیاز پڑے تھے۔ چھری بھی تھی۔ میں نے باسکٹ اپنی طرف کھینچ کر امی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ باسکٹ مصروف ہوئی۔ یہ تدبیر کارگر رہی۔ کچھ دیر بعد جب توفیق کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں میرے رونے کا بالکل علم نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہی بولے۔ ”بھئی! پیاز کا کتنے وقت اسے پانی میں بھگوئے جا میں تو بطن کم ہو جاتا ہے۔“

کتنی مشکل صورت حال کا یہ کتنا آسان حل نکلا تھا۔ مجھے کہیں پڑھا ہوا ایک دل گذار مضمون یاد آ گیا۔ مضمون کا عنوان تھا لڑکیاں پیاز کیوں کاٹتی ہیں۔ بہر حال میں نے آنسوؤں اور پیاز کے اس معنی خیز تعلق کو اپنے دل سے باندھ لیا۔

اگلے تین ماہ میں کم از کم دو دفعہ ایسا ہوا کہ اس پیازی وجہ سے ہی میں توفیق کے سامنے اپنے ”تھک باز“ دکھ کو چھپانے میں کامیاب رہی۔ عام طور پر میں توفیق کے آنے سے کافی پہلے ہی اپنے آپ کو سنجال لیتی تھی اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر فریض ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں مجھے پہلی دفعہ ”رونے دھونے“ کا اصل مفہوم سمجھ بھی گیا تھا۔ رونے کے ساتھ دھونا شاید اسی لیے لازم ملزوم ٹھہرتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کو کچھ قرار آتا جا رہا تھا۔ یادیں تو اپنی جگہ موجود تھیں لیکن شاید اب بتدریج وہ گہرائی میں جاری ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے سچ یا دلوں کا

گہرائی میں جانا ضروری ہوتا ہے۔ شاید اسی طرح قدرت حیات کے سرچشموں کے لیے نئے راستے پیدا کرتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یا سر نے بھی اب خود کو آہستہ آہستہ سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ایک روز ایک بار پھر میری طرح پھنس گئی۔ اس روز لاہور سے بڑے بھائی جان کا فون آیا تھا۔ ان کی زبانی پتا چلا تھا کہ یا سر کی شادی ہو گئی ہے۔ اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب وہ خاندان کے ہی ایک کھاتے بیٹے گھرانے کی لڑکی سے شادی پر رضامند ہو گیا تھا۔ لڑکی شکل و صورت کے لحاظ سے ہرگز اس کی ہم پلہ نہیں تھی۔ عمر میں بھی شاید ایک آدھ سال اس سے بڑی ہی تھی۔ اس رشتے کی بات چیت اور تیاری کئی دنوں سے ہو رہی تھی۔ آخر کل سب کچھ انجام پا گیا تھا۔

اس دن میں ایک بار پھر دیرینک روٹی رسی اور اس وان ایک بار پھر غیر متوقع طور پر توفیق گھر آ گئے تھے۔ کسی طرح ایک کی وجہ سے وہ آفس جاتی نہیں سکے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس حالت میں ان کے سامنے کی تو بہت بڑی طرح ڈانٹ کھاؤں گی بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خدا نخواستہ۔ وہ کسی خشک میں مبتلا ہو جاتے۔ میں اپنی درم و دو آنکھوں کے اندر توفیق کی طرف لپکتی نظر کرتی رہی۔ پھر کی۔ یہ دو چیزیں۔ یہ دو غیر اہم چیزیں اس صورت حال میں میرا فواد سہارا تھیں۔ لیکن میں کچھ کر میں پکڑا کر رہ گئی۔ یہ ایک سنگین اتفاق تھا کہ مجھے کہیں پیاز نظر نہیں آئی۔ میں نے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے، ملازم کو آواز دیں۔ اسی دوران میں توفیق کا سن روم میں آچکے تھے۔ ”نادو۔۔۔۔۔ نادو۔۔۔۔۔“ انہوں نے مجھے پکارا۔

پیرا دل سننے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ میں جیسے، ایک چوڑھی اور رگڑے ہاتھوں پکڑی جانے والی تھی۔ وہ اب کچن کی طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے نشوونما پکڑا اور افراتفری میں اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ وہ اندر آ گئے، مجھے غور سے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے ناو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پاپ۔۔۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔۔۔ الہی۔۔۔۔۔ شش شاید۔۔۔۔۔“

الہی ہو گئی ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”اوہ۔ ایک تو تم لڑکیوں کو کھڑے دکھانے کا شوق ہوتا ہے۔ رات کو کبھی کبھی تم کو سویر پھین کر نکلو۔“ انہوں نے کہا اور کمرے کی طرف چلے گئے۔

میرے کانوں میں اپنے ہی الفاظ گونج رہے تھے

اور دل و دماغ میں زلزلہ پیدا کر رہے تھے۔۔۔۔۔ الہی۔۔۔۔۔ شاید الہی ہو گئی ہے۔

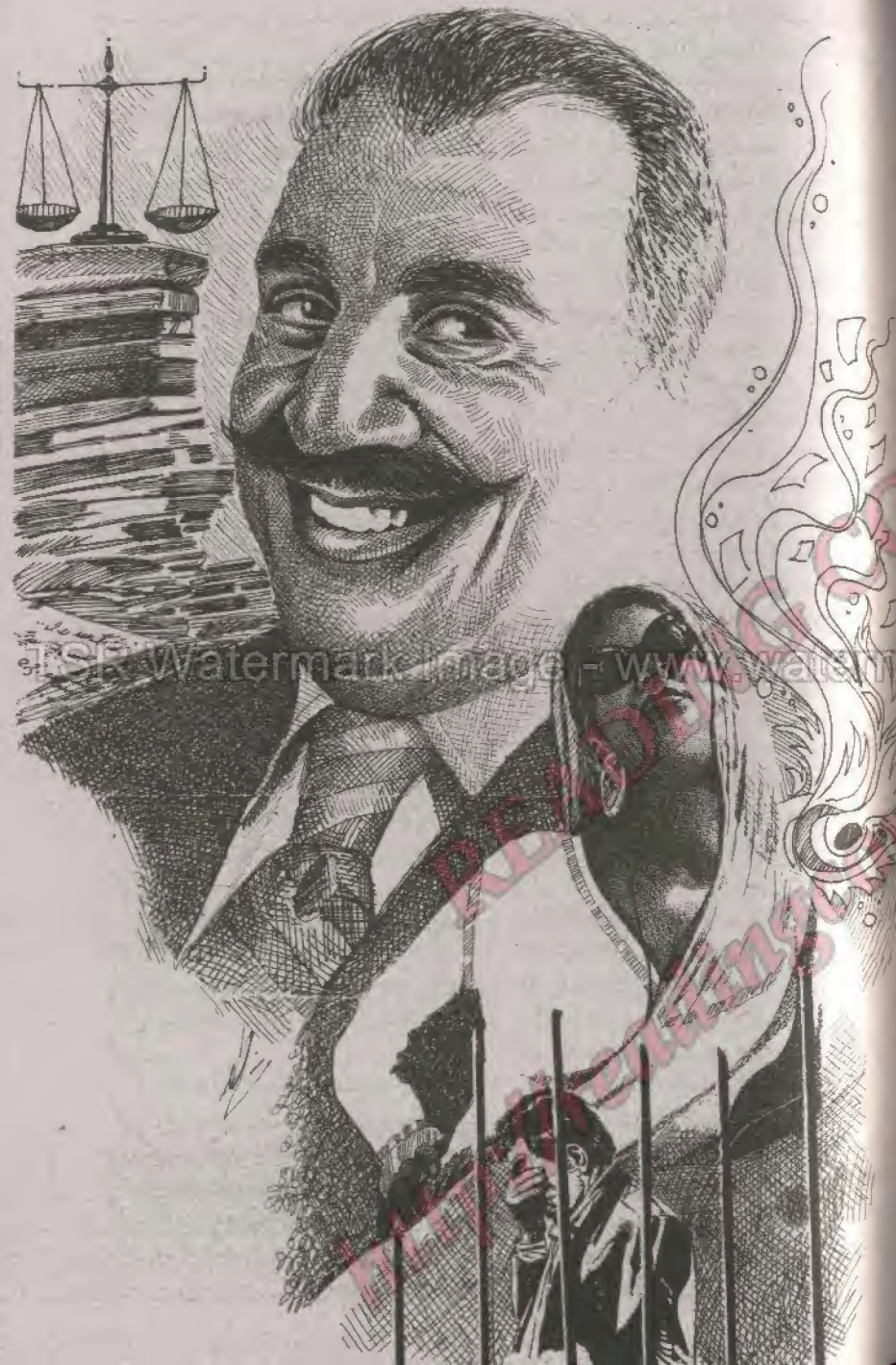
ان چار پانچ الفاظ نے میرے سامنے سے جیسے ایک دیوار پر دھامکا دیا۔ مجھے اچانک ہی اپنے ایک دیرینہ سوال کا جواب مل گیا تھا۔

چچی سارہ کو بھی تو الہی تھی۔ گھر میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں الہی نہیں ہے۔ بڑی چچی نبیل کا وہ فقرہ ابھی تک میری ساعت میں محفوظ تھا۔ ”اے الہی ورجی کچھ نہیں، بس ڈراے کرتی ہے۔“ اور انہوں نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ اے الہی سے فزادہ خطرناک بیماری کی کچھ اچھی طرح

آ رہی تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ آپ ہر دفعہ اپنے آنسو۔۔۔۔۔ پیاز کے پیچھے چھپا لیں یا پھر آنکھوں میں دھواں یا نکادہ فقرہ پڑنے کا بھانڈ کر لیں۔ آپ کو اپنے آنسوؤں کی پردہ داری کا ”مستقل انتظام“ چاہیے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور بھی کبھی کسی کے ذہن رسا میں اس طرح کا ”انتظام“ بھی آ جاتا ہے۔ چچی سارہ کے ذہن میں بھی ایسا ہی جدا انتظام آیا تھا۔

اب سب کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب توفیق دفتر گئے ہوئے تھے اور باقی گھر والے بھی اپنی اپنی مصروفیات میں گم تھے، میں کمرے کے دروازے تک پہنچی رہی۔ چچی سارہ کی ایک تصویر میرے سامنے تھی۔ وہ کسی شاعر کی خوب صورت غزل لکھی تھیں۔ پتا نہیں کون شاعر تھا؟ لیکن غزل تو میرے سامنے تھی۔ لیے بال کندھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ خوب صورت آنکھوں میں کسی خاموش محبت کی جوت تھی۔۔۔۔۔ آہ عورت کی مجبوریاں۔

میں نے تحویت کے عالم میں تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور نمناک لپٹے میں کہا۔ ”چچی۔۔۔۔۔ آج میں جان گئی ہوں۔ آپ کو الہی نہیں تھی۔ آپ کو محبت تھی۔ کوئی نہ کوئی یا سر آپ کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آپ نے بھی سنبھری سپنے دیکھے تھے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے چچی۔ بندہ ننوں کے ساتھ مہر کا دامن تھامے رکھنا اور اپنے اندر نوئی کرب کو چہرے پر نہ آنے دینا مجھے آپ سے ہی تعلیم ہوا ہے۔ میں بھی آپ ہی کے نقش قدم پر چلوں گی۔ اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے ماضی کے سایوں سے حتی الامکان دور رکھوں گی۔ اگر کبھی بھار دل پر غم کے بادل چھائے بھی تو مجھے رونا نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ بس الہی ہوگی۔“



کنہ مشق

سیرۃ المحمدیگ

”م سے مثبت اور ”م سے منفی... عجب منطقی ہے انسان کی ہمیشہ ملال میں مبتلا رہتا ہے اور مانتا نہیں کہ اس نے کچھ غلط بھی کر دیا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے عقل مندی کا مظاہرہ کچھ مندی عقل سے کر ڈالا... مثبت رویہ چھوڑا اور منافقت کا رستہ اختیار کیا پھر نتیجہ تو یہی نکلتا تھا جو نکلا... لیکن بیگ صاحب کی تدبیروں نے بالآخر مجرم کو گھیرے میں لے ہی لیا۔

موسم سرما کی ایک خشک اور اداس شام میں اپنے آفس میں بیٹھا حسب معمول کلائنٹس کو ڈیل کر رہا تھا کہ ایک پریشان حال عورت اپنا دکھڑا روئے میرے پاس آگئی۔ میں نے سلیکی نامی اس عورت کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ اس روز میرے آفس میں کلائنٹس کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ایک جاتا تو دوسرا آجاتا تھا۔ وزینگ لابی میں بھی وہ رونق نہیں تھی جو وہاں کا خاصہ تھی۔ نصف درجن سے زیادہ افراد ہر وقت اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ اس مندی میں کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ دے بھی بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ کلائنٹس کی عدم موجودگی کے باعث اچھی خاصی بوریت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جسے سلیکی کو انتظار کی کوفت نہیں اٹھانا پڑی تھی اور فوراً سے چیمبر میں پہنچ گئی تھی۔ سلیکی کی عمر پچاس سے تھوڑی تھی۔ وہ مناسب بدن کی مالک ایک عام سی شکل و صورت والی عورت تھی۔ اپنے طبع

اور پہتاوے سے وہ غریب نظر آتی تھی۔ میرا یہ اندازہ بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بیٹھ چکی تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں.....“ وہ اضطرابی لہجے میں بولی۔

”وہ تو آپ کی حالت ہی سے نظر آ رہا ہے۔“ میں نے نظریے کے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ اپنی پریشانی کی وضاحت کریں تاکہ میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”وجیدہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے دہکی لہجے میں بتایا۔

”یہ وجیدہ کون ہے؟“ میں نے کاغذ قلم سنبھالنے

ہوئے سوال کیا۔ ”اور پولیس نے وحیدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”وحیدہ میری اکلوتی بیٹی کا نام ہے وکیل صاحب۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”پولیس نے اسے بیگ صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔“

”بیگ صاحب کون ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، کون تھے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری بیٹی وحیدہ سے ان کا کیا تعلق تھا۔۔۔۔۔؟“

”جناب! ہم تو غریب اور مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔“ وہ ہمراہی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ ”میں اور میری بیٹی وحیدہ پانچ فرسوں کے عقبی حصے میں واقع گوشہ نما ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے ہم اپنی روزی کماتے ہیں۔ وحیدہ بیگ صاحب کے گھر میں بھانورتن اور صفائی و صلائی کا کام کرتی ہے۔“

لحائی توقف کر کے اس نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اشتقاق بیگ صاحب کا بنگلہ نارنجہ ناظم آباد میں واقع ہے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ ”قتل کی واردات کب پیش آئی ہے؟“

”کل دن میں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آج جنوری کی بیس تاریخ کو صبح نو بجے روزانہ

میں جنوری کا واقعہ تھا۔ اس کا ایک واضح مطلب یہ بھی تھا کہ آج صبح پولیس نے ملزمہ کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔ جب یہی سوال میں نے سسلی سے کیا تو اس نے میرے انداز سے کی تصدیق کر دی۔ میں نے پوچھا۔

”آپ کی بیٹی وحیدہ کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟“

”کل دن میں تقریباً دو بجے جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”مم دونوں اپنے گھر میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں کہ پولیس ہمارے دروازے پر کھڑی گئی۔۔۔۔۔ پھر وہ لوگ وحیدہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

واقعات کی تفصیل میں سسلی نے بتایا کہ وہ خود تین گھروں میں اور اس کی بیٹی وحیدہ دو گھروں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ وہ دونوں روزانہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی تھیں اور دوپہر ایک ڈیڑھ بجے تک ان کی واپسی ہوتی تھی۔ بنگلوں والے پیسے اچھے دیتے تھے لہذا وہ انہی پانچ بنگلوں تک محدود تھیں اور آدھے دن کی سخت محنت کے بعد

باقی کا آدھا دن آرام کرتی تھیں۔ مزاجاً دونوں ماں بیٹیاں سادہ اور قناعت پسند تھیں اس لیے زیادہ کے لالچ میں نہیں آتی تھیں۔ سسلی ایک بیوہ عورت تھی۔

وحیدہ کے پاس دو بنگلوں کا کام تھا اور یہ دونوں بنگلے نارنجہ ناظم آباد کے علاقے میں واقع تھے۔ پہلے وہ نو بجے سے گیارہ بجے تک متوال اشتیاق بیگ کے گھر کا کام کرتی تھی۔ اس کے بعد گیارہ سے ایک بجے دوپہر تک فیاض علی کے بنگلے کا کام کرتی تھی۔ یہ دونوں بنگلے قریب قریب تھے وقوعہ کے روز بھی وہ متوال کے گھر کا کام ختم کر کے بنگلے پر گئی تھی اور پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول اپنے گھر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں سسلی بھی گھر پہنچ گئی۔ پھر وہ دن کے کھانے میں مصروف تھیں کہ پولیس نے وہاں آکر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

میں مزید چندہر میں محنت تک سسلی سے مختلف زاویوں سے سوال کرتا رہا۔ میں نے سسلی کے بیان کے مختلف اہم پوائنٹس نوٹ کرنے کے بعد تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے سسلی صاحب! آپ کل اسی وقت میرے پاس آجائیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ وحیدہ کی رہائی کے سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ آج کچھ نہیں کریں گے۔۔۔۔۔“ وہ قانونی اور عدالتی معاملات سے بالکل ناواقف نظر

آتی تھی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”سسلی جی! ابھی اس لیے کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بیٹی عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہے۔ میرے انداز سے کے مطابق پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے لیے کم از کم سات روز کا ریمانڈ تو ضرور لیا ہوگا۔ جب وہ لوگ جلالان کے ساتھ وحیدہ کو حوالہ عدالت کریں گے تو اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔ اس دوران میں، میں وحیدہ سے ملاقات کر کے اس واقعے کے حوالے سے معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔“

لحائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لے کر سسلی سے پوچھا۔ ”وحیدہ کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟“

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے اس کی پریشانی کے پیش نظر تسلی اور دلا سے دیے۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر بولی۔ ”کیا میری بیٹی سات دن تک پولیس والوں کے قبضے ہی میں رہے گی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ قانونی مجبوری ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جب پولیس کسی ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کرتی ہے تو پھر وہ تفتیش کی تکمیل تک اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے کی مجاز ہوتی ہے۔“

وہ اپنی بیٹی کے لیے بے حد فکر مند تھی، حذبذب انداز میں مستفسر ہوئی۔ ”وکیل صاحب! میری وحیدہ رہا تو ہو جائے گی نا۔۔۔۔۔؟“

”انشاء اللہ!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مگر وہ بے گناہ ہے تو پھر اس کا ایک ماں بھی بیگ نہیں ہوگا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔“

”یہ تو مجھے یقین ہے کہ وحیدہ نے قتل نہیں کیا۔“ وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ”میری بیٹی کو خواہواہ اس کیس میں پسنانے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”عدالت سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی لگائی جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ میں آج ہی کسی وقت تھانے جا کر وحیدہ سے ملاقات کر لوں گا۔“

وہ مجھے دعا بھیج دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ اسی رات آس بے اٹھنے کے بعد میں متعلقہ تھانے

پہنچ گیا۔ تھانے میں عدالتی ریمانڈ پر آئے ہوئے بندے کے ملاقات کے لیے اس کی کسٹڈی میں موجودا نام اس کا کام کو سنبھالنے کے مجھے ہزاروں گرا آتے تھے۔ اس روز وحیدہ سے ملاقات میں مجھے پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔

جب میں حوالات پہنچا تو وحیدہ چپ چاپ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی، مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ بدکنے والے انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ ”وحیدہ! کسکی ہو؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اچھن آئینہ تذبذب دکھائی دیا جیسے خاموش نگاہ سے پوچھ رہی ہو۔۔۔۔۔ میں کون ہوں، ان کا حال احوال کیوں پوچھ رہا ہوں۔

”وحیدہ!“ میں نے اس کی مشکل آسان کرنے کے لیے کہا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ میں ایک وکیل ہوں اور تمہیں اس معصیت سے نجات دلانے آیا ہوں۔“

تمہاری ماں نے میری خدمات حاصل کی ہیں اس لیے۔۔۔۔۔“ میں نے رک رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا پھر مردانہ انداز میں کہا۔ ”میں تم سے جو بھی پوچھوں اس کا بالکل سچا اور کھرا

جواب دیتا۔“ ”جی اچھا۔۔۔۔۔!“ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔

وحیدہ کی عمر پچیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ دہلی کی بستی اور درمیانے قد کاٹھ کی مالک ایک قبول صورت عورت تھی۔ موجودہ حالات نے اس بے چاری، دکھوں کی ماری کو فکر مند کر رکھا تھا۔ میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ ”پولیس والوں نے اقبال جرم کر دانے کے لیے تمہارے ساتھ زور زبردستی تو نہیں کی۔۔۔۔۔؟“

”کوشش تو ان کی یہی ہے کہ میں بیگ صاحب کو قتل کرنے کا اقرار کر لوں۔“ وہ سادگی سے بولی پھر چمکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے۔۔۔۔۔؟“

میں اس کے سوال کی تہ میں پہنچ گیا اور زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے اور میرا متوال اشتیاق بیگ کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھوں اور چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں دھیمے انداز میں وحیدہ سے وقوعہ کے روز پیش آنے

والے واقعات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اسے جہاں تک معلوم تھا وہ مجھے بتا دیا۔ میں نے اس کے متوال اشتیاق بیگ کی فیملی اور دیگر معاملات کے بارے میں بھی سوالات کیے اور اس نے مجھے تسلی بخش جوابات دیے۔ آدھے گھنٹے کی ایک تحقیقاتی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وحیدہ کا اس قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس بے چاری کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں محبت لیا گیا تھا۔

میں نے اس ملاقات کے اختتام پر وکالت تانے، درخواست ضمانت اور دیگر اہم کاغذات پر وحیدہ کے انگریزے لکوائے کیونکہ وہ جتنی آن پڑھے لکھا شخصہ وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر اس بات کا یقین دلایا کہ میں اپنی کوششوں سے اسے باعزت رہا کروا لوں گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں

میں نے اسے پولیس کی تفتیشی مہربانیوں سے بچنے کے لیے چند پتے کی باتیں بھی بتائیں پھر وہاں سے واپس آ گیا۔

اگلے روز وحیدہ کی ماں سسلی حسب وعدہ مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی بیٹی کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے میری فیس پوچھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔

اس کے چہرے اور آنکھوں میں تذبذب نمودار ہوا،
 ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”وسیل صاحب! آپ کی فیس
 بہت زیادہ نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”بعض لوگوں کو میری فیس بہت زیادہ محسوس ہوتی
 ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن
 بہت سے دیکھوں گی تو مجھے سے دگنی تک فیس ہیں۔۔۔۔۔“
 ”مجھے دوسرے دیکھوں گا تو پتا نہیں چلتا۔“ وہ
 سادگی سے بولی۔ ”میں تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ
 بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم بہت غریب
 لوگ ہیں۔“
 ”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے اسی سے
 پوچھ لیا۔
 ”آپ یا تو اپنی فیس میں کچھ رعایت کریں
 اور یا۔۔۔۔۔!“

وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر تذبذب انداز میں مجھے تنکے
 لگی تو میں نے پوچھ لیا۔ ”اور یا۔۔۔۔۔ کیا؟“
 ”یا یہ کہ۔۔۔۔۔!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
 ”آدمی فیس ابھی لے لیں، آدمی وحیدہ کی رہائی کے بعد۔“
 ”میں اس قسم کے معاملات نہیں کیا کرتا۔“ میں نے
 صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”الو، فیس میں
 رعایت دانی بات قابل عمل ہے۔“
 ”ٹھیک ہے چنانچہ! یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“ وہ
 احسان بھری نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو بھی زیادہ
 سے زیادہ کم کر سکتے ہیں، وہ کر دیں۔“

میں سال میں ایک آدھ چربی کیس بھی پکڑ لیا کرتا
 تھا جس میں، میں ایک پیسا بھی نہیں کما تا تھا۔ اس عمل سے
 میں اپنے پیسے کا صدقہ نکال رہا تھا لیکن یہ سال کا آغاز تھا
 لہذا میں سالی کے پہلے ہی مہینے میں اس قسم کا کوئی کام نہیں
 کرنا چاہتا تھا اور سلی کو بالکل مایوس کر دینا بھی مجھے اچھا نہیں
 لگ رہا تھا چنانچہ میں نے درمیانی راہ کا انتخاب اور استعمال
 کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے کے استعمال سے مجھے کوئی
 نقصان نہیں تھا البتہ سلی کو اس سے حسبِ مشافکہ ضرورت پہنچ
 سکتا تھا۔

”آپ کی خاطر میں اپنی فیس میں پچاس فیصد کی کر سکتا
 ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر میں فیس
 ایڈوانس ہی میں لوں گا۔ ادھار کی کوئی ضمانت نہیں۔“
 وہ قدرے آنکھن زدہ انداز میں بولی۔ ”وسیل
 صاحب! یہ فیصد، وعدہ کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

آپ سیدھی سیدھی رعایتی فیس بتائیں۔۔۔۔۔؟“
 ”پچاس فیصد کا مطلب ہے، آدمی!“ میں نے
 وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو اپنی جو فیس
 بتائی ہے اس کو آدھا کر سکتا ہوں۔ بس، اس سے زیادہ
 رعایت ممکن نہیں۔“
 ”جناب۔۔۔۔۔!“ وہ خوشی اور حیرت کے طے پلے
 تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”آدمی فیس کا مطلب تو اتنی رقم
 ہے جو میں آپ کو ایڈوانس ادا کر سکتی ہوں۔ جیسا کہ میں کہ
 چکی ہوں، آدمی فیس آپ ابھی لے لیں۔۔۔۔۔ ہیں؟“
 ”جی ہاں، اس کا بالکل بھی مطلب ہے۔“ میں نے
 زریں مسکراتے ہوئے صراحت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی
 آنکھوں میں مسرت کے جگنو جگنو اٹھے۔ اس نے مجھے
 ڈھیروں دعا میں دیں اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد
 رخصت ہو گئی۔

”دعا“ بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی
 خرید و فروخت ممکن نہیں۔ اسے ایک مقام سے دوسرے
 مقام تک پہنچانے کے لیے تو کرایہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی
 اس پر مختلف گت چسپان کرنے کی صورت پیش آتی ہے۔ یہ
 ایک ”خیر“ کا جذبہ ہے جو ایک انسان، دوسرے انسان کے
 لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ دوسروں کی دعا میں اپنے
 چاہیے۔ پتا نہیں، کب کب اس دعا کو لوگ بجا
 دعاؤں کی قبولیت کا اختیار جس ذات پاک کے پاس ہے
 ہماری شرگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور بے شک آدمی
 شے پر قادر ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو ملزمہ وحیدہ اور
 متقول اشتیاق بیگ کے بارے میں مختصر آیتا چلوں جس
 سے کیس کے پس منظر پر بھی روشنی پڑے گی اور آگے چل کر
 اس کیس کی سماعت کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن
 شکار بھی نہیں ہوگا۔ ایک بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ
 ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن
 واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے یہاں بیان کر رہا
 ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بعض باتیں آپ سے چھ
 بھی لی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں
 مناسب سنی خیز مقامات پر کیا جائے گا تاکہ آپ کی تعزیر
 کے لحاظ کو دو بالا کیا جاسکے۔

☆☆☆

جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے، ملزمہ وحیدہ اور اس کی
 سلی کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقے سے تھا۔ وہ کوئی

کسبہ منسوق

گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کر کے اپنا گزارہ کرتی
 تھیں۔ وحیدہ کے باپ عبدالغفور کا بہت پہلے انتقال ہو گیا
 تھا۔ وہ ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ ان ماں بیٹی کی
 رہائش بفرزوں کے عقیقی علاقے میں واقع ایک گھوٹے نمائستی
 میں تھی۔
 سلی کے پاس تین گھروں کا کام تھا جبکہ ملزمہ وحیدہ
 صرف دو گھروں میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کیا کرتی
 تھی جن میں ایک گھر تو متقول اشتیاق بیگ کا تھا اور دوسرا
 فیاض بیگ کا۔ پہلے وہ متقول کے گھر کا کام نہاتی تھی۔ اس
 کے بعد فیاض بیگ کے بیٹے کا رخ کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز بھی
 اس نے اپنا معمول جاری رکھتے ہوئے یہی کیا تھا لیکن جب
 وہ گھر جانے کے بعد اپنے گھر پہنچی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد
 پولیس نے اسے اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار
 کر لیا تھا۔

متقول کی فیملی نہایت ہی مختصر تھی۔ یعنی صرف دو افراد
 متقول اشتیاق بیگ اور اس کی بیوی نرمس۔ یہ لوگ تازہ
 ہجر تھاہ میں واقع دوسو مگر کے ایک پتھلے میں رہتے تھے۔
 متقول ایک صنعت کار تھا۔ شہر کے انڈسٹریل ایریا میں اس
 کی لیڈر ٹیکسٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جہاں سے
 وہ دن ملک اور رات ملک مال بجاتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا
 جہاں سے ملک انداز میں مل رہا تھا کہ اچانک دل نے اس کے
 ساتھ دھوکا کر دیا۔ ایک رات اسے ہارٹ ایک ہوا اور وہ
 بڑا بھوکہ کر رہ گیا۔ دل کے دورے سے اس کی جان تو بچ گئی
 مگر ڈاکٹر نے کم از کم چھ ماہ تک بیڈریسٹ بتا دیا تھا اور
 اس کی اس ”بیڈریسٹ“ کے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے
 کی طبی القلب شخص نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ
 بے چارہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔

نرمس، متقول کی دوسری بیوی تھی۔ متقول کی پہلی
 بیوی رخسانہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی
 بیوی سے متقول کی ایک اولاد عادل نامی ایک بیٹا تھا جو
 اپنے ماموں کے پاس رہتا تھا۔ متقول کی دوسری شادی نے
 اب بیٹے کے درمیان خاصی شدید اور سنگین اختلافی لہذا قائم
 رکھ دی تھی لہذا وہ باپ کو چھوڑ کر اپنے ماموں کے گھر میں
 جاتا تھا۔ ویسے بھی متقول کا ساری زندگی اپنی سسرال یعنی
 عادل کی تحیال کے ساتھ جھگڑا رہا تھا اور رخسانہ کے انتقال
 کے بعد تو یہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ عادل کا رجحان
 شادی سے اپنی تحیال کی جانب تھا لہذا متقول کی دوسری
 شادی کے بعد گھر میں کچھ اس قسم کے تنازعات اٹھے کہ

عادل اپنا سامان سمیٹ کر ماموں عثمان کے گھر میں آ گیا۔
 جب تک وہ متقول کے گھر میں تھا (متقول کی دوسری شادی
 کے بعد) اس کا بیچ شام کسی نہ کسی بات پر اپنی سوچلی ماں
 نرمس کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ
 ان اختلافات کے سلسلے میں متقول اس کے بجائے اپنی بیوی
 نرمس کا ساتھ دیتا ہے تو اس کا دل بھگ کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ
 رجس بڑھتی گئی اور بالآخر سال بھر پہلے وہ اپنے ماموں کے
 پاس آ گیا تھا۔ اس کا ماموں عثمان ٹیکسٹائل انڈسٹری میں
 انجینئر تھا۔ اس کی رہائش مکش اشتیاق میں تھی۔ عثمان کی اپنے
 بہنوئی متقول اشتیاق بیگ سے بھی نہیں بنی تھی۔

متقول کا بھلا دو بیڈروم، ایک ٹی وی لاؤنج، ایک
 ڈرائنگ روم اور سرسبز لان پر مشتمل تھا۔ یہ ایک ہوادار اور
 سکون بخش رہائش گاہ تھی۔ ملزمہ وحیدہ روزانہ نو بجے صبح کام
 کے لیے وہاں پہنچتی اور گیارہ بجے تک وہاں رہتی تھی۔ اس
 دوران میں متقول کی بیوی نرمس بھی گھر میں موجود ہوتی
 تھی۔ اگر اسے کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو وہ انہی
 اوقات میں نکلا کرتی تھی اور وحیدہ کا کام ختم ہونے سے پہلے
 واپس آ جایا کرتی تھی کیونکہ اسے اپنے بیمار شوہر متقول
 اشتیاق بیگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔

ملزمہ وحیدہ کے والدین نے روزانہ صبح معمول
 کام کرنے متقول کے پتھلے پر پہنچتی تھی۔ لگ بھگ ساڑھے نو
 بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون سیٹ ٹی وی لاؤنج میں
 ایک اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ نرمس نے فون اٹھایا اور پھر عمرہ
 کے پاس مین میں چلی آئی۔ وحیدہ اس وقت چن میں برتن
 دھو رہی تھی۔

”متقول وحیدہ!“ اس نے ملزمہ کو مخاطب کرتے ہوئے
 کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ تم بیگ
 صاحب کا خیال رکھنا۔“
 ”ٹھیک ہے باجی۔“ ملزمہ نے تائیدی انداز میں کہا
 پھر پوچھا۔ ”آپ کب تک واپس آ جائیں گی؟“

”تمہاری چھٹی کے ٹائم سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔“
 وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”تمہارے صاحب کی ایک دوا
 لانا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی گولی لکھی ہے جو بہت کم
 اسٹورز پر ملتی ہے۔ ابھی ایک میڈیکل اسٹور والے ہی کا
 فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ابھی وہ فیکٹریس موجود ہیں۔ میں
 نے سوچا، ابھی لے آؤں۔ کیا پتا، پھر میں نے سلی۔“ لگاتی
 توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے
 ہوئے کہا۔

”تمہارے صاحب نے ناشتا کر لیا ہے اور میں نے انہیں صبح والی دوا بھی کھلا دی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہے ہیں۔ ان کی دواؤں میں ایک سکون کی گولی بھی ہے۔ وہ تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہیں گے۔ مجھے یقین ہے، میری دواؤں تک وہ پونجی بے خبر سوتے رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے باجی! آپ نے فکر ہو کر جاگیں۔“

وحیدہ نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”اگر صاحب جی جاگ بھی گئے تو میں سنبھال لوں گی۔“

اس کے بعد زمرس بیچنے سے روانہ ہو گئی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ زمرس، وحیدہ کو گھر میں چھوڑ کر باہر نکلے۔ اسے کچھ دیر وہ ایسا کرتی رہتی تھی لہذا وہ کے روز وحیدہ نے زمرس کے باہر جانے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور حسب معمول اپنے کام میں مگن رہی۔

وحیدہ کا خیال تھا کہ اس کی باجی زمرس دس بجے تک واپس آجائے گی لیکن جب وقت دس سے آگے بڑھنے لگا اور زمرس کی شکل نظر نہ آئی تو وحیدہ کو تشویش ہونے لگی۔ جوں جوں اس کی چھٹی کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کی فکر مندگی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار متوال کے بیڈروم میں بھی جھانک کر دیکھا۔ مقتول اشتیاق بیگ گہری نیند میں مبتلا تھا۔

دس کے بعد، سوادس اور پھر ساڑھے دس بج گئے۔ وحیدہ سوچنے لگی، پتا نہیں باجی کہاں رہ گئی ہیں؟ کون سے میڈیکل اسٹور سے وہ صاحب کی دوائی لپٹے چلی گئی ہیں؟

وحیدہ مقتول کے گھر کا کام ختم کرنے کے بعد فیاض فتح کے بیچنے پر جاتی تھی جہاں اسے گیارہ سے ایک بجے تک کام کرنا ہوتا تھا۔ فیاض فتح کا بنگلا، مقتول کے بیچنے سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اگر اسے وہاں پہنچنے میں بھی دیر ہو جاتی تو... فتح صاحب کی بیوی بہت شور مچاتی تھی۔ وہ اسکی غصہ و عورت تھی کہ فتح صاحب بھی عالم طیش میں اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وحیدہ، ایندے کے غصے کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی اور دل میں یہ دعا بھی کر رہی تھی کہ گیارہ سے پہلے پہلے زمرس واپس لوٹ آئے تاکہ اسے ایندے کے غصہ و غضب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سبز ایندے بڑی دھماکہ مچانے کی عورت تھی۔

کم دیش پونے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی تو وحیدہ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی باجی زمرس تھی۔ ”ہاں وحیدہ! اس نے پوچھا۔“ سب ٹھیک ہے نا...؟“

”جی، سب ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے بتایا۔

”میں نے سارا کام ختم کر لیا ہے اور صاحب جی ابھی تک رہے ہیں۔“ لچانی توقف کر کے اس نے پوچھ لیا۔ ”باجی! آپ کب تک آئیں گی؟“

”بس، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچنے ہی ہوں۔“ زمرس نے جواب دیا۔ اور اگر مجھے ایک دو منٹ نیچے ہو جائیں تو تم چل جانا۔“

”بیک صاحب کو اکیلے چھوڑ کر...؟“ وحیدہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔“ زمرس نے

غصے سے ہونے انداز میں کہا۔ ”اور تمہارے صاحب تو ابھی بھی آرام سے سو رہے ہیں۔ تم جن گیت کو بھیر کر اپنے کمرے پر چلی جانا۔ تم تھوڑی دیر میں سچ رہی ہوں۔ یہ میں نے بھی کہہ رہی ہوں کہ جب تمہیں دوسرے گھر پہنچنے میں ہو جاتی ہے تو فتح صاحب کی بیوی تم پر چڑھتی چلائی ہے۔“

وحیدہ نے زمرس کو مسرت کے غصے کے بہت سے نئے ستارے کھینچے۔ زمرس نے جب اس کی دھتھی ہوئی رنگ بگنی دیکھی تو وہ ہنسنے سے روک کر لپٹے لپٹے ہو گئی۔

”جی باجی!... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں گیارہ بجے تک آپ کے آنے کا انتظار کروں گی۔“

”اگر آپ کو کچھ اور کام ہے تو اسے جلد سے کر لیں۔“

”ٹھیک ہے...؟“ یہ کہتے ہوئے زمرس نے ٹیبل فونک رابطہ منقطع کر دیا۔

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ اس نے احتیاطاً گیارہ بجائے زمرس کی واپسی کا انتظار کیا تھا اور پھر باجی کی حسب ہدایت بیچنے کے بیرونی گیت کو بند کر کے دوسرے بیچنے پر کام کرنے چلی گئی تھی۔ گیت کو اس نے باہر سے کڑی لگا دی تھی تاکہ وغیرہ کے دباؤ کی وجہ سے وہ خود بخود کل نہ جائے۔

وحیدہ نے وقوعہ کے روز حسب معمول فتح صاحب کے گھر کا کام ختم کیا پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کی ماں لکھی اس سے پہلے گھر پہنچی تھی اور کھانا تیار کر رہی تھی۔ وہ دونوں جب دوپہر کا کھانا کھانے پر مصروف تھیں تو ایک سب انسپکٹر دوکانیکیل کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا پھر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے بارے میں گرفتار کر لیا گیا۔

وحیدہ نے جب مقتول کے گھر کو چھوڑا تو اشتیاق بیگ زندہ سلامت، گہری نیند میں سو رہا تھا۔ وہ اس کے کمرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وحیدہ کو جو کچھ بھی معلوم

اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے بتا دیا تھا۔ باقی کی معلومات مجھے خود حاصل کرنا تھیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے اپنے تمام گھوڑے میدان میں ڈال دیے تھے اور مجھے اپنی محنت سے اور خدا کے شکر سے قوی امید تھی کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ میں نے جب تھانے جا کر حالات میں بند وحیدہ سے ملاقات کی تھی تو اسے بعض ایسے گمبھی بتائے تھے جن کا بروقت استعمال کر کے وہ خود کو پولیس کی معروف ”مہربانیوں“ سے محفوظ رکھ سکتی تھی اور اس نے یہ عین میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ خاصی عقل مند ثابت ہوئی تھی۔

عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں نے وحیدہ کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور مقدمہ کی درخواست ضمانت دائر کر دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جج اپنی کرسی پر آکر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی موٹیل کے حق میں بولنا شروع کیا۔ ”جناب عالی! مقدمہ وحیدہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی ہے۔ اس کی گہری سزاؤں کے تحت اس پر جاری قتل کی وارنٹ کے ساتھ ہی کیا جا رہا ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میری موٹیل کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر کیے جائیں۔“

”یور آرز!“ وکیل اشتیاق نے ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ”ملازمہ ایسی معصوم، بے گناہ اور بے جا رہی بھی نہیں جیسا میرے فاضل دوست بیان کرتے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے لہذا اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔“

”سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے...؟“ میں نے وکیل اشتیاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسی کے الفاظ دہرائے پھر کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کس سنگین جرم کی بات کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”آپ کوئی پتا، کون سا سنگین جرم...؟“

”چند لمحات کے لیے فرض کریں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں...“ میں نے اپنے لہجے کی تنیدگی کو برقرار رکھتے

ہوئے کہا۔ ”آپ بتا دیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”میں ایسی کوئی مہربانی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”اور دوسری بات یہ کہ عدالتی معاملات میں ”فرض کرنے“ سے کام نہیں چلتا۔ جب آپ کو یہی نہیں پتا کہ عدالت میں کس کیس کی سماعت ہو رہی ہے تو پھر آپ اپنی موٹیل کی وکالت کیسے کریں گے؟“

”آپ میرا کام مجھ پر چھوڑ دیں میرے محترم!“ میں سلگنے والے انداز میں کہا۔ ”صرف اتنا بتا دیں کہ میری موٹیل نے کون سے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

میرے سوالات نے ابتدائی میں وکیل اشتیاق کو ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برہمی سے بولا۔ ”میں ”اشتیاق بیگ مرڈر کیس“ کا ذکر کر رہا ہوں جس کی اس وقت عدالت میں کارروائی ہو رہی ہے۔“

”اوہ...!“ میں نے چونک کر اداکاری کی پھر گہری تنیدگی سے پوچھا۔ ”تو آپ کا خیال ہے، اشتیاق بیگ کو میری موٹیل وحیدہ نے قتل کیا ہے؟“

”تو اور کیا...!“ وہ بے ساختہ بولا۔ ”اسی لیے تو وہ عدالت میں حاضر ہے۔“

”عدالت میں تو آپ اور میں بھی حاضر ہیں میرے فاضل دوست...“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔ ”تو کیا یہ کھانا کھانے کے کام سے بھی اشتیاق بیگ کے قتل میں حصہ لیا ہے؟“

”آپ خواہ مخواہ بات کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں!“ وہ آٹھائیس آئینہ انداز میں بولا۔

”بالکل نہیں...!“ میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اچھے ہوئے معاملے کو سدھار کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میرے تعاون کی ضرورت ہے... کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”آپ نے میری موٹیل کے حوالے سے کہا ہے کہ... اس لڑکی نے جو سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“ میں نے نہایت ہی تنیدگی سے کہا۔ ”اور ابھی آپ نے اضافہ کیا ہے کہ اسی لیے وہ اشتیاق بیگ کے قاتل کی حیثیت سے اس وقت عدالت میں حاضر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری موٹیل کے جرم کے بارے میں بہت پر یقین ہیں؟“

”جی ہاں...“ وہ خاصی کراری آواز میں بولا۔

”میں پر یقین ہوں۔“

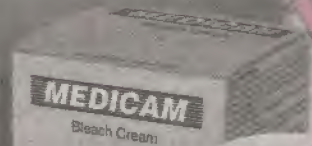
اس نے میرے بچھائے ہوئے جال میں پہلا قدم

MEDICAM

Bleach Cream

Whiteness in 14 days

*No Side Effects



کے بہر نظر آپ پر!

ضمانت نامکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ مجھے عدالت اس فیصلے پر کوئی اچھا ہوا تھا اور نہ ہی مایوسی۔ میں مطمئن کہ میں نے اپنے حصے کا کام نہایت ہی خوبی سے کر دیا۔ کس کی کاقاعدہ ساعت پر مجھے اپنے جوہر دکھانا تھے۔ آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو پوسٹ مار رپورٹ اور پولیس کے چالان، یعنی استغاثہ کے بارے میں مختصر آبناتا چلوں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت میں جنوری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آٹھ گھنٹے ایک تیز دھار گوشت کاٹنے والی چھری تھیں جس کی مدد سے مقتول کی شہرگ کاٹ کر موت گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ خطرناک چھری سے مقتول کی گردن پر اتار بڑا کٹ لگا یا گیا تھا کہ اس کے ذمہ بچنے والے امکان صفر کے برابر ہو کر رہ گئے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی میڈیکل انجینئر کی رپورٹ بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ بہ وقت قتل مقتول کسی خواب آور دوا کے زیر اثر تھا اور حالت بے ہوشی یا حالت نیند میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مقتول کے جسم میں کسی بھی دوا یا دھرم موجود تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ یہ وہی دوا تھی جس نے ناشتے کے بعد اپنے شوہر مقتول اشتیاق بیگ کو کھلائی تھی۔

استغاثہ نے میری ٹوکمل کے خلاف خامسا مشہور کس تیار کیا تھا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے علاوہ بھی اس پر سرکاری الزامات ڈالے گئے تھے۔ نمبر ایک دس ہزار نقدی نمبر دو لاکھ چھ جلیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری۔ یہ دونوں چیزیں مقتول کی بیوی جس کی الماری سے غائب ہوئی تھیں۔ جس کا دعویٰ تھا کہ جب وہ وقوعہ کے روز گھر سے نکلی تو یہ نقدی اور زیورات اس کی الماری میں موجود تھیں لیکن جب دن میں وہ واپس آئی تو اس کی الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور یہ دونوں اشیاء اپنی جگہ موجود نہیں تھیں۔ اس نے اپنی الماری کو کونا کونا چھان مارا مگر اسے کہیں بھی نقدی یا زیورات دکھائی نہ دیے۔ الماری کے کھلے ہوئے پٹ دیکھ کر اسے جس گورنر کا احساس ہوا تھا، وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

قصہ مختصر، میری ٹوکمل وحیدہ کو نقدی و طلائی زیورات چرانے اور اپنے صاحب اشتیاق بیگ کو قتل کر کے الزام میں گرفتار کر کے حوالہ عدالت کر دیا گیا تھا۔

رکھ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کے یقین سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے میری ٹوکمل کو خود اپنی آنکھوں سے یہ جرم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ”پھر کسی بات ہے میرے فاضل دوست؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں وہی تو جانتا چاہتا ہوں۔“

”مہم۔۔۔۔۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ میں نے طرہ وحیدہ کو یہ قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا اس واقعے کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔“

”کوئی اور یعنی شاید یہ اس واردات کا؟“

”کوئی نہیں۔“ اس نے نفی میں گروں ہلا دی۔

”تو پھر۔۔۔۔۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو میری ٹوکمل کے بارے میں زبان کو زحمت دیتے وقت محتاط الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت میں، اس پر عائد جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اس کی حیثیت ایک ملزم ایسی ہے لہذا یہ کہہ دینا کہ۔۔۔۔۔ وہ ایک مجرم ہے، اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔۔۔۔۔ سراسر میری وضاحت نے وہی استغاثہ کو قدرے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ وہ کھسیا ہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن بیچ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میری ٹوکمل گھر میں کام کرنے والی ایک بے چاری لڑکی ہے۔ میں آگے چل کر ثابت کر دوں گا کہ قتل کی اس واردات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں لہذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی ضمانت کو منظور کیا جائے۔“

وکیل استغاثہ ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ”جناب عالی! واقعاتی شہادتیں سراسر طرہ کے خلاف جاتی ہیں۔ خاص طور پر آٹھ گھنٹے پر طرہ کے جو فکٹر پرنس طے ہیں، انہیں کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

مزید پندرہ بیس منٹ تک وحیدہ کی ضمانت کے حق میں اور ضمانت کے خلاف دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر عدالت نے میری ٹوکمل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے وحیدہ کو جیوڈیشل رہائش پر جیل بھیج دیا۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ قتل کے طرہ کی

اس پیشی پر کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج کرسی انصاف پر براجمان ہوا تو عدالت میں سنا سنا چھا گیا۔ جج نے کارروائی شروع کرتے ہوئے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحبت جرم سے انکار کر دیا۔ یہ بات پہلے بھی کسی بار بتائی جا چکی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں دے گئے ملزم کے بیان یعنی اقبال جرم کو عدالت میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ پولیس والوں کے تفتیشی ہتھکنڈوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض اوقات ملزم اقرار جرم کر لیتا ہے اور عدالت میں جا کر اس سے منحرف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ چونکہ عدالت کے علم میں بھی ہوتا ہے اسی لیے وہ پولیس کی جوہل میں ملزم کے کسی بھی بیان کو تنبیہ کی نہیں لیتا۔

اس کے بعد ملزم کا حلفہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ ملزم وحیدہ نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی نچے تلے الفاظ میں مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے کل پانچ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیانات میں کوئی خاص بات ہوگی۔ اس سے پہلے استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے جج سے درخواست کی۔ ”جناب عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“ جج نے فوراً مجھے اجازت دے دی۔ ”پر مشین گرافٹ!“

تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ کی سی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ موجودہ کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) کا نام صفدر علی تھا۔ ریک کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔ صفدر علی پست قامت اور بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے گال بھوے ہوئے تھے، آنکھوں سے شرارت چلتی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی جاگتا تھا کہ وہ بڑے سارے کا کوئی شریر بچہ ہے۔

جج کے حکم پر آئی او صفدر علی وینس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آئی او صاحب!..... آپ خاصے صاف ستھرے نظر آرہے ہیں۔“

وہ میرے ریمارکس پر چونک کر مجھے سمجھنے لگا۔ قدرے ناگوار لہجے میں متعجب ہوا۔ ”کیا مطلب ہے؟“

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا یونیفارم خاصا خوب نظر آ رہا ہے، آپ کا شیوہ بنا ہوا ہے، بالائی بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے ہیں اور جوئے بھی چمک رہے ہیں۔ اگر خاصے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی تعریف اور وہ بھی ایک دلیل مخالف کی رو سے سے سن کر خوش ہو گیا تاہم اپنی خوشی کو دباتے ہوئے اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ نے بیجا فرمایا کہ میں ایک خوش ذوق پولیس آفیسر ہوں لیکن ان باتوں کا زیر نظر نہیں سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں آئی او صاحب!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”بس، میں نے ایسے ہی فکر کر رہا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ عموماً صبح و شام جن پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے انہیں اپنے حلیے یا یونیفارم سے کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ کم از کم تھانہ انچارج سے ریک سے نیچے تو اس بات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں جاتا۔ انسان کا اس صورت میں اس کی وجہ سے وہ حلقہ حلقہ نہایت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔“

”بس جناب!.....“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”اپنی اپنی بھکی بات ہے۔“

”کیا خوب صورت بات کی ہے آپ نے؟“ میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”صفدر صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“ ”ایک لمحے کے توقف سے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”واقعے سے میری مراد“ اشتیاق بیگ مرڈر کیس“ ہے۔“

”آپ وضاحت نہ بھی کرتے تو میں سمجھ گیا تھا۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس واقعے کی اطلاع مقتول کی بیوی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس نے میں جنوری کے دوپہر تھانے فون کرتے دی تھی۔“

”دوپہر..... کتنے بجے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”پولیس کے روزنامے کے مطابق یہ اطلاع دوپہر ۱ بجے کرپٹا ٹیکس منٹ پر دی گئی تھی یعنی پونے ایک بجے“ ”اور آپ جانے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ایک..... سوا ایک بجے کے درمیان۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری معلومات کے مطابق ملزم وحیدہ کو لگ بھگ دو بجے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! میری معلومات غلط تو نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ ملزم کی گرفتاری کا وقت وہی ہے جو آپ نے بتایا ہے۔“

”ملزم کی گرفتاری یقیناً مقتول کی بیوہ نرگس کی نشاندہی پر کی گئی ہوگی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جی ہاں!“ اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”نرگس صاحبہ نے میری پوچھ گچھ کے نتیجے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ ملزم کو گھر میں چھوڑ کر کسی ضروری کام سے باہر گئی تھی۔

واپسی میں اسے دیر ہو گئی۔ جب وہ گھر آئی تو ملزم وحیدہ اپنی ملزم گھر میں موجود نہیں تھی اور نرگس کے شوہر کو بڑی.... بدردی سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور دوسرے کمرے کی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔ مذکورہ الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات بھی غائب تھے۔ نرگس کو

وقت تھا کہ وہ ملزم کو باہر لے کر آئی اور اسے گھر سے نکال کر لے گئی۔ نرگس کے ایما پر ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر کے شامل تفتیش کر لیا۔“

”بہت خوب!“ میں نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی کارکردگی واقعی لا جواب تھی۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے لگے لگے جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کی تعریف میں سنجیدہ ہوں یا مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور سوالات کے سلسلے کو دہرا کر دے ہوئے کہا۔

”آپ نے بتایا ہے کہ جب نرگس واپس آئی تو ملزم وحیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کیا ملزم کو اس وقت گھر میں موجود ہونا چاہیے تھا؟“

”جی ہاں!.....“ وہ اصرار کی انداز میں بولا۔ ”مقتول کی بیوی نرگس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر دل کا مریض تھا اور اس نے ملزم کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی، وہ گھر میں موجود رہے۔“

”مقتول کی بیوہ نرگس نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز دس پینتالیس پر اپنے گھر فون کر کے ملزم سے کیا کہا تھا؟“ میں نے حیلے لہجے میں کہا۔

”جی ہاں!..... سب بتایا تھا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”نرگس نے ٹھیک پونے گیارہ بجے اپنے گھر فون کیا تھا۔ فون ملزم نے اٹھ لیا تھا۔ نرگس نے ملزم کو تاکید کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، ملزم گھر سے نہیں جائے گی چاہے اسے دوسرے گھر سے کام کی چھٹی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”لیکن ملزم کا بیان اس کے برعکس ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پونے گیارہ بجے جب مقتول کی بیوہ نرگس نے ملزم کو فون کیا تو ملزم نے پوچھا تھا، باجی! آپ کب تک واپس آئیں گی۔ مجھے گیارہ بجے شیخ صاحب کے گھر کام کرنے جانا ہے؟“ اس پر نرگس نے جواب دیا تھا، میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔ تم میری واپسی کا انتظار نہیں کرنا اور گیارہ بجے بیرونی گیٹ بند کر کے شیخ صاحب کے گھر چلی جانا ورنہ تمہارے دیر سے جانے پر شیخ کی بد مزاج بیوی تم پر خوبخواہ چیخے چلائے گی۔ ان دونوں بیانات میں اتنا زیادہ تضاد ہے کہ.....“ میں نے لحاظی تو فت کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”کہ..... دونوں میں سے کوئی ایک بیان ہی درست ہو سکتا ہے۔“

”ملزم وحیدہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔“ آئی او جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہی فتویٰ میں اس کیس کی مدعی اور مقتول کی بیوہ نرگس کے لیے بھی جاری کر سکتا ہوں۔“

”آپ کا فتویٰ درست نہیں مانا جائے گا وکیل صاحب!“ انکوائری آفیسر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کیونکہ مقتول دل کا مریض تھا۔ نرگس اس کی طرف سے ایسا غیر محتاط اقدام اٹھایا نہیں سکتی۔ وہ ملزم کو اس وقت تک گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی جب تک کہ وہ خود مقتول کے پاس واپس نہ جاتی۔ یہ تو ایک سامنے کی حقیقت ہے جو معمولی سی عقل رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔“

آئی او نے آخری جملے میں مجھ پر چوٹ کی تھی۔ میں نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور مقتول انداز میں پوچھا۔

”آپ کی معلومات کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول کی بیوہ نرگس کتنے بجے گھر واپس آئی تھی؟“

”سائڑھے بارہ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بارہ پینتالیس پر اس نے تھانے فون کر کے،

کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”کون سی اہم بات؟“
میں نے آئی او کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے رنج
کی جانب دیکھا۔ اس کی دلچسپی ہرگز رتے لئے کے ساتھ
بڑھ رہی تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور آئی او کے
سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میری منگیل اور اس کیس کی مڑم کا دعویٰ ہے کہ
دعویٰ سے چند روز قبل وہ چھری چکن سے غائب ہو گئی تھی۔
جب اس نے مذکورہ چھری کے بارے میں اپنی باجی یعنی
مقتول کی بیوہ نرگس سے استفسار کیا تو اس نے چھری کے
حوالے سے اپنی لایمی ظاہر کر دی تھی۔“

”مجھے آؤ قتل کے ماضی کے بارے میں کچھ پتا
نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”نہ ہی مجھے یہ پتہ
چلتے ہیں کہ کوئی دلچسپی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آؤ
قتل پر مڑم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور وہ
اپنی ماکن کی حکم عدلیہ کی کر کے اس کے قہر آنے سے پہلے ہی
مقتول کے گھر سے نکل گئی تھی۔“

”آئی او صاحب! میں نے اس کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا آپ
پوری دیانت داری کے ساتھ مجھے ایک بات بتائیں گے؟“
”میں تو ایک منکر ہوں۔ میں نے اپنے منکر ہونے کا اعتراف
کے روز جو کچھ ہی کہا ہے اس میں دیانت داری کو ایک
لہجے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا۔“ وہ قدر کے ناراضی سے
بولا۔ ”پوچھیں، آپ کو مجھ سے کون سی بات پوچھنا ہے۔ جو
میری نظر میں سچ ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔“

”یہ جو معاشرے کے نیچے طبقے سے تعلق رکھنے
والے لوگ ہوتے ہیں مثلاً مزدور، کھیتی، جفاکش اور سخت کام
کرنے والے یا گھروں میں کام کرنے والی نوکریاں
وغیرہ۔۔۔۔۔ میں نے گہری تنبیہ کی ہے کہ۔“ آپ کے خیال
میں ان کی کھوپڑی میں داغ نہیں ہوتا؟“

”میں سمجھتا ہوں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ
انجمن زدہ نظر سے مجھے نکتے لگا۔ ”اپنی بات کی وضاحت
کریں گے؟“

”میرا مطلب ہے، کیا یہ لوگ آپ کی نظر میں عقل
سے پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے اپنے لہجے کی تنبیہ کی کو
برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان میں اور ایک گلدے میں کوئی
فرق نظر نہیں آتا آپ کو؟“

”میں نے اپنے ہاتھ میں موجود قلم سے سامنے پھیلے
ہوئے کاغذات پر چند سطریں لکھیں اور دوبارہ ہماری

مقتول کی لاش کو دیکھ کر کیا اندازہ قائم کیا تھا؟“
”جیسا آپ فرما رہے ہیں، میں نے بالکل ویسا ہی
دیکھا تھا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
”مقتول کی لاش اور ہسٹری کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا تھا
کہ موت کے منہ میں جاتے وقت مقتول نے زیادہ الجھل کو
نہیں چاہی ہوگی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، آپ نے جائے وقوعہ سے بڑی
آسانی کے ساتھ آؤ قتل بھی برآمد کر لیا تھا؟“ میں نے
قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”آؤ قتل کی تلاش میں مجھے زیادہ تنگ و دو تنگ کرنا پڑی تھی۔
وہ خطرناک گوشت کاٹنے والی چھری مقتول کے بید کے نیچے
ہی پڑی مل گئی تھی۔“

”آپ نے آؤ قتل پر سے فنگر پرنس بھی اٹھائے
تھے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ پرنس
مڑم کے فنگر پرنس سے میچ بھی کر گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں
کہہ رہا آئی او صاحب؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“
وہ بے آواز بلند بولا۔ ”مجھے تو یہ بات اور بھی یقینی ہوئی کہ
مڑم کی لاش پر مڑم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔
معاذے میں موت نہ ہوئی تو آؤ قتل پر اس کی انگلیوں کے
نشانات کیوں پائے جاتے۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔“

”ایک نہیں، اس کیس میں تو بہت سی باتیں غور طلب
ہیں آئی او صاحب!“ میں نے منہ پر ہونے انداز میں
کہا۔ ”جن پر ہم باری باری غور بھی کریں گے لیکن آؤ قتل پر
مڑم کے فنگر پرنس کی موجودگی ہرگز یہ ثابت نہیں کرتی کہ
اسی نے مقتول اشتیاق بیگ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“
”جی کیا مطلب؟“ وہ چونک کر مجھے نکتے لگا۔ ”یہ
آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے
میں کہا۔ ”میری منگیل کے مطابق وہ خطرناک چھری جو اس
کیس میں آؤ قتل کی حیثیت کی حامل ہے اس کا تعلق مقتول
کے گھر کے چکن سے ہے۔ مڑم کو نوکریاں ہوتی ہیں۔
جی ہاں اس چھری کے دستے پر مڑم کی انگلیوں کے نشانات کا
پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس چھری کے حوالے سے
مڑم نے مجھے ایک نہایت ہی اہم بات بھی بتائی ہے۔۔۔۔۔“
میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مختصر انداز میں آئی او

”مضمر صاحب! وقوعہ کے روز جب آپ دو پہر ایک اور سوا
ایک کے درمیان جائے واردات پر پہنچے تو وہاں مقتول کی
بیوہ نرگس کے علاوہ اور کون موجود تھا؟“

”مقتول کی فیکٹری کی شیفر فریڈ غوری بھی جائے وقوعہ
پر موجود تھا۔“ اس نے جواب دیا۔
”کیا فریڈ غوری کو بھی مقتول کی بیوہ نے فون کر کے
دہاں بلایا تھا؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔
”آپ نے اس سلسلے میں مقتول کی بیوہ نرگس سے
پوچھا نہیں تھا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ایک انکوائری آفیسر
کی حیثیت سے آپ کو فریڈ غوری کی جائے وقوعہ پر موجودگی
کا سب پتا ہونا چاہیے تھا؟“

”میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ وہ
رکھائی سے بولا۔ ”آپ نرگس سے خود پوچھ لیجئے گا۔۔۔۔۔“
”میں مقتول کی بیوہ سے ضرور یہ سوال کروں گا۔“
میں نے گہری تنبیہ کی ہے کہ۔“ کیونکہ میں اس معاملے کو
بہت اہم سمجھتا ہوں۔“
”جیسی آپ کی مرضی!“ اس نے بے پروائی سے
کندے اچکا دیے۔

”میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔“
پوچھا۔ ”آئی او صاحب! جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو
آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا؟“

”مقتول بیگ اپنے کمرے میں بیڈ پر سر رہا تھا۔“
اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی گردن کی ہوئی
تھی۔ خون کے بہاؤ نے اس کا لباس اور بیڈ کا ایک بڑا حصہ
سرخ کر دیا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اسے
زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جب مقتول کو
موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر
تھا۔ اس کے معدے کے کیماوی تجزیے سے بھی یہی ثابت
ہوا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ مقتول کی بیوہ نے
ناشتے کے وقت اسے جو سکون بخش دوا کھلائی تھی یہ اس کے
اثرات ہوں۔ ان اثرات کی روشنی میں دراصل میں یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔ میں سانس ہموار کرنے کے لیے لمبے سہر
گور کا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جب کسی نفس آور شے کے زیر اثر کسی شخص کی ش
رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو سمرنے
والے کو زیادہ تر پنے چڑکنے کا موقع نہیں ملتا۔ آپ نے

اپنے شوہر کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔“
میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی گھر
پہنچنے کے ٹھیک چندر منٹ بعد۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس صاحبہ بڑے
مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔“ میں نے حیرت سے
آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔ ”ورنہ ان کی جگہ اگر کوئی اور
خاتون ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ سب
سے پہلے ارد گرد کے لوگوں کو اکٹھا کرتی۔ پولیس کو اطلاع
دینے کا خیال تو بہت بعد میں آتا۔۔۔۔۔“

میری منگیل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نرگس کی اجازت
پر ہی گیارہ بج کر پانچ منٹ پر پہنچے تھے۔ نکلے ہی کیونکہ نرگس
نکلے کے قریب ہی نہیں موجودگی لیکن آئی او سے ہونے
والے سوال و جواب سے جو صورت حال سامنے آ رہی تھی
اس سے ظاہر ہوتا تھا، نرگس کے ذہن میں کچھ اور ہی پک رہا
تھا۔ جب وہ گواہی دینے دینس باکس میں پہنچی تو میں اسے
اپنے انداز میں گھس سکتا تھا۔ فی الحال تو آئی او سے نمٹنا تھا جو
استفسار کا سب سے اہم گواہ ہونے کے ساتھ ہی استفسار کا
واپس بھی تھا۔ میں نے مختصری جرح کے لیے اسے سچ سے

کاٹا تھا۔ میں نے کچھ اور بھی پوچھا۔ ”آئی او صاحب! کیا آپ کو
زیادہ ہی دراز ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن چونکہ میری کرید کے
نتیجے میں نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے لہذا سچ بڑی توجہ
اور دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسی دوران
میں وقفے وقفے سے اس کا قلم بھی حرکت میں آ جاتا تھا اور وہ
اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگتا تھا۔

”یہ تو جناب۔۔۔۔۔ اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کی بات
ہے۔“ انکوائری آفیسر نے میرے اعتراض کے جواب میں
کہا۔ ”بعض لوگ کسی مصیبت کا سن کر ہی ہاتھ پاؤں ڈال
دیتے ہیں اور بعض پر قیامت بھی نوٹ پڑے تو وہ کسی چٹان
کے مانند ایسا دھڑکتے ہیں۔“

”پھر تو مقتول کی بیوہ کو ”آؤ قتل لڑی“ کی شیلڈ ملنا
چاہیے۔“ میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہی فولادی
اعصاب کی مالک ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔“

اس نے میرے طنز کا جواب طنزیہ سے دیا۔ ”اگر
آپ کا کوئی بورڈ اس قسم کے انعامات کا انعقاد کرتا ہے تو
آپ بہ خوش مسز بیگ کو یہ شیلڈ پیش کر سکتے ہیں۔“
میں نے زیر لب مسکرائے پر انکشاف کیا اور سوالات
کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انکوائری آفیسر سے پوچھا۔

جانب متوجہ ہو گیا۔

آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں تو ایسا نہیں سمجھتا جناب! جب اللہ نے ان کے سر کے اوپر کھوپڑی بنائی ہے تو یقیناً اس کے اندر دماغ بھی رکھا ہے اور یہ بھی معاشرے کے دوسرے یعنی بالائی طبقوں کے مانند سوچے اور سمجھتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں تو ان کا دماغ کچھ زیادہ ہی چل رہا ہے۔“

”دماغ کے استعمال اور سمجھ بوجھ کے حوالے سے ملزم وحیدہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”وہی خیال ہے جس کا میں آپ کے پہلے سوال کے جواب میں اظہار کر چکا ہوں۔“ وہ خامے اطمینان کے ساتھ بولا۔

”یعنی ملزم بھی ایک سمجھ دار اور باشعور انسان ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اسے“ ”الوکی بھی“ کہنا درست نہیں ہوگا؟“

”یہی الفاظ کا استعمال تو کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن اس سے ملزم کے جرم کی سنگینی کم یا ختم نہیں ہو جاتی۔“

”ٹھیک ہے، ہم جرم اور اس کی سنگینی کی طرف آجائے ہیں۔“ میں نے سمجھنا شروع کیا۔ ”میں نے تو متوکل پر اشتیاق بیگ کوئل کرنے کا الزام ہے اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ کوئی ذفر یا الوکی بھی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے (استغاثہ کے مطابق) اشتیاق بیگ کوئل کرنے کے بعد آڈیو کو اسی کے بیڈ کے نیچے چھپک دیا۔ آپ کو وہ خطرناک تیز دھار چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے سے کیسی ملی؟“

”جی ہاں..... وہیں سے ملی تھی۔“ آئی او نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

”وہ اگر چاہتی تو اس چھری کو کسی جگہ بھی چھپا سکتی تھی جہاں سے آسانی سے ڈھونڈ لیا جاسکتی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وہ آڈیو کو گھر سے باہر کسی کچرا دان میں بھی چھپک سکتی تھی۔ اس نے اپنے سنگین جرم کے سب سے بڑے ثبوت کو مقتول کے بیڈ کے نیچے کیوں ڈال دیا تھا یہ تو وہی بات ہوئی کہ..... آہل، مجھے مارا۔“

”آپ کا سوال یقیناً بہت اہم ہے۔“ وہ تائیدی

انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں، ملزم نے بولکھا ہٹ اور پریشان بین آڈیو کو بیڈ کے نیچے چھپک دیا ہوگا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس پر وحشت اور دہشت سی طاری ہوئی ہوگی اور وہ چھری کو وہیں چھوڑ کر جلد از جلد بھاگنے سے فرار ہو گئی ہوگی۔“

”وحشت زدہ یا دہشت زدہ یا بولکھا یا ہوا پریشان شخص پہلی فرصت میں کسی پُر سکون جگہ پر بیٹھ کر اپنے حواس کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خامے زہر لے انداز میں کہا۔ ”جبکہ ملزم کا ریکارڈ اس کے برعکس گواہی دیتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ”آپ کے مطابق.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”ملزم اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس قدر بولکھا گئی تھی اور دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ پریشان اور وحشت میں آڈیو کو مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی چھپک کر گھر سے فرار ہو گئی تھی جبکہ واقعات کے مطابق وہ اپنے مقررہ وقت پر فیاض شیخ کے گھر پہنچی تھی اور پورے دو گھنٹے اس نے شیخ صاحب کے گھر میں معمول کے مطابق پُر سکون انداز میں کام کیا تھا۔ اس امر کی گواہی فیاض شیخ کی بیٹی

ایبہ دے کر دیتی ہے۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر معزز عدالت کا حکم ہوگا تو میں اپنی متوکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے فیاض شیخ آئینہ تیکر عدالت تک لانے کا فرض پورا کر سکتا ہوں۔“ میں ایک فصرہ در اور سخت گیر عورت ہے۔ وہ دو عام حالات میں ملزم کے کام میں سے کافی عیب نکالتی رہتی تھیں، کجا یہ کہ بولکھا ہٹ آئینہ انداز میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ خاموش کیسے رہ سکتی تھیں۔ ایک عورت جس نے پانچ منٹ پہلے کسی شخص کا گلا کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو وہ میرے دسکون کے ساتھ پورے دو گھنٹے کسی گھر میں اپنے معمول کے کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ تو انسانی فطرت اور نفسیات ہی کے خلاف ہے آئی او صاحب.....“

تفتیشی افسر صفدر علی میرے اس بھرپور منطقی ایک پر بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے وکیل استغاثہ کی یاد آ گئی۔ میں اس قسم کے دعوں دھار جملے وکیل استغاثہ پر کرتا تھا لیکن ابھی تک اس کیس میں وکیل استغاثہ کی باندی نہیں آئی تھی۔ جس طرح آئی او سے جرح کے جواب میں اس کیس اور اس کیس کے معاملات پر تدریجاً پرت پرت نکلتے چے جا رہے تھے اور کیس تیزی سے اپنے اختتام کی طرف بڑھ

رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وکیل استغاثہ کو بہت کم ”وجہت“ اٹھانا پڑے گی۔

”آئی او صاحب!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”میری متوکل پر اشتیاق بیگ کوئل کرنے کے علاوہ بھی دو الزامات ہیں۔ نمبر ایک، دس ہزار نقدی کی چوری۔ نمبر دو، چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری۔“ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ نے جب ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تو خانہ اور جامہ تلاشی میں ملی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ یہ رقم اور طلائی زیورات برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟“ ”نہیں جناب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہم نے ملزم کے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن مال مسروقہ اور نقدی نہیں سے برآمد نہیں ہو سکی۔“

”ریمائنڈ کی مدت کے دوران میں آپ نے ملزم کی زبان کھلوانے کے لیے کڑی تفتیش بھی کی تھی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”دس ہزار نقدی اور طلائی زیورات کے بارے میں کچھ بتا چلا آپ کو؟“

”جی ہاں، ایک بار تفتیش میں گردن ہلا دی۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس کے چہرے پر وہ پھیل والی تازگی اور بے گناہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاصا تھکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ میں وقفے وقفے سے جج کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب بھی میں آئی او کے سامنے کوئی خاص نکتہ اٹھاتا تو آئی او اس کا جواب دیتا تو جج اپنے پاس کچھ نوٹ کر لیتا تھا یعنی وہ اہم پوائنٹس اپنے پاس جمع کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری جرح خاصی سودمند ثابت ہو رہی تھی۔“

”آئی او صاحب!“ میں دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کے خیال میں، دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات مقتول اشتیاق بیگ کے نیچے کے نیچے رکھے ہوئے تھے؟“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ برہمی سے بولا۔ ”نقدی اور زیورات جہلا کون نیچے کے نیچے رکھتا ہے.....؟“

”آپ کی تفتیش اور استغاثہ کی رپورٹ سے تو یہی لگتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی۔

”کیا مطلب.....؟“

”بھئی..... میری متوکل نے استغاثہ کے مطابق

کہہ مشق

اشتیاق بیگ کی گردن پر چھری پھیری، نیچے کے نیچے سے دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات نکالے اور چلتی بنی.....“ میں نے طنز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”استغاثہ کی رپورٹ میں یہ کہاں لکھا ہے کہ دس ہزار کی نقدی اور طلائی زیورات مقتول کے نیچے کے نیچے رکھے تھے؟“

”آپ کیس میں پوز.....!“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کے لیے نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ”وکیل صفائی حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔“

جج نے گہری سنجیدگی سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت ہے۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور وکیل صفائی آدھے یون گھٹنے سے آئی او صاحب کو پکڑے کھڑے ہیں۔ کام کی کوئی بات نہیں ہو رہی اور محض..... عدالت کا یقینی وقت برباد کیا جا رہا ہے اور آپ تو انہوں نے حد ہی کر دی ہے.....“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں وکیل استغاثہ کے اعتراض کا جواب دوں۔“

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

”جناب عالی! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک انکوائری آفیسر صفدر پر جرح کے دوران میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا لہذا عدالت کے یقینی وقت کے برباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وکیل استغاثہ کے اعتراض کو ایک سیکنڈ کے لیے درست بھی مان لیا جائے تو پھر سرا آپ نے اس جرح کے دوران میں زیر سماعت کیس کے حوالے سے اپنے پاس جو اہم پوائنٹس نوٹ کیے ہیں انہیں بھی بیکار اور فضول سمجھتے ہوئے کاٹ دینا ہی مناسب ہوگا اور..... مجھے یقین ہے سر، آپ ایسا نہیں کریں گے۔“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے وکیل استغاثہ اور تفتیشی افسر سمیت حاضرین عدالت پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر دوبارہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ اب میرے انداز میں ایک خاص قسم کا

جذبائی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔
 ”جناب عالی! اگر میں نے پچھلے تیس چالیس منٹ تک عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی غرض سے جھگ ماری ہے تو میں اپنے اس فعل پر انتہائی شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔۔۔۔۔ دشمن آل یور آئے۔“
 ”اب آپ کیا فرماتے ہیں وکیل صاحب؟“ بیج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔
 ”میں کیا ہوں جناب عالی! وہ بلا سوچے سمجھے بول گیا۔“ جب میرے فاضل دوست نے خود ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔“
 بیج نے قدرے ناگوار سی سے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کے فاضل دوست اور اس کیس کے ڈیفنس کونسلر مسٹر بیگ نے اپنی کی غلطی کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان کے اٹھائے ہوئے نکتے عدالت کی نظر میں بے معنی اور لغو ہیں تو وہ اپنی جرح کو موقوف کرنے پر تیار ہیں۔۔۔۔۔“
 وکیل استغاثہ خاموش اور الجھن زدہ انداز میں بیج کو دیکھتا چلا گیا۔ بیج نے مزید کہا۔ اس کا مخاطب صد فیصد وکیل استغاثہ تھا۔
 ”اگر آپ کی بات کو درست مان کر عدالت وکیل صفائی کو مزید سوالات سے روک دے تو پھر آپ کو ان تمام امور کی وضاحت کرنا ہوگی، چاہے یہ نکات بے معنی ہیں یا یا معنی؟“
 ”یور آئے! وکیل صفائی کے اس سوال کو معزز عدالت کس خانے میں فٹ کرے گی جو انہوں نے سب سے آخر میں تفتیشی افسر سے پوچھا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے شاکی لہجے میں کہا۔
 ”یعنی مقتول کے نکلے اور نقدی وزیورات والا سوال؟“
 ”ہیں یور آئے۔“ وہ قدرے جوشیلے لہجے میں بولا۔ ”معزز عدالت بخوبی اندازہ لگا سکتی ہے کہ رز ساعت کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں ایسے چمکانے سوال کی کیا تک ہتی ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”ایسے چمکانے سوال کی کیا تک ہتی ہے۔“ بیج نے زیر لب دہرایا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
 ”بیگ صاحب! وکیل استغاثہ کے اس سوال کا جواب آپ کو دینا ہے۔“
 ”ضرور جناب۔۔۔۔۔“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے

کہا۔ ”اگر معزز عدالت مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائے تو میں اپنے فاضل دوست کے اعتراضات کا بڑا مدلل اور شافی جواب دینے کے لیے بے قرار ہوں۔“
 بیج نے سمجھنا انداز میں کہا۔ ”مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ۔“
 میں بڑے چاؤ کے ساتھ اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر صفدر علی کی طرف توجہ ہو گیا۔ ”آئی او صاحب!“ میں نے غصے سے بولے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”تو آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ چوری ہوئے والے چالیس ہزار کے طلائی زیورات اور دس ہزار نقدی مقتول کے بچے کے پیچھے نہیں رکھے تھے؟“
 ”جی ہاں نہیں!“ وہ بوری طبیعت سے بولا۔
 ”پھر ان دونوں چیزوں کو کہاں سے چھایا گیا؟“
 ”الماری کے اندر سے۔“
 ”کون سی الماری؟“ میرے سوالات میں تیزی آئی۔
 ”مقتول کی بیوہ نرس کی الماری میں سے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”میں نے پوچھا۔“ کیا مذکورہ الماری بھی مقتول کے بیڈروم میں رکھی ہوئی تھی؟“
 ”نہیں۔“ اس نے بڑی شہ جوش میں کہا۔ ”بلکہ وہ دو سال قبل چوری کے بعد بیڈروم میں لٹک گئی تھی جس الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات چھائے گئے وہ نرس کے بیڈروم میں رکھی تھی۔“
 ”آپ نے یقیناً اس بیڈروم اور خصوصی طور پر اس الماری کا بھی معائنہ کیا ہوگا جہاں سے زیورات اور نقدی چھائی گئی تھی؟“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو میرا فرض تھا۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔
 ”آپ کا اس سے زیادہ بڑا ایک اور فرض بھی تھا۔“
 ”میں نے اسے طے یہ انداز سے ٹھہرا۔“ کیا آپ نے وہ فرض بھی پورا کیا تھا؟“
 ”کون سا فرض؟“ وہ پریشانی سے مجھے دیکھنے لگا۔
 ”مذکورہ الماری سے فنگر پرنٹس اٹھانا۔“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور ان فنگر پرنٹس کا ملزمہ کے فنگر پرنٹس سے موازنہ نہ کرنا۔۔۔۔۔“
 ”کیا ہم نے کیا تھا۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔
 ”لیکن افسوس کہ اس الماری پر سے ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے تھے۔“ میں نے بد دستور اس کے

چہرے پر نگاہ جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی اوصاحب۔۔۔۔۔؟“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ ٹھٹکتے خوردہ انداز میں بولا۔ ”اس الماری کے کسی حصے پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔“
 ”یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آلٹوکل پر سے تو ملزمہ کے فنگر پرنٹس مل جاتے ہیں مگر الماری کے کسی حصے خصوصاً اس کے ونڈل پر فنگر پرنٹس موجود نہیں ہیں؟“
 ”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ وہ جاہلانہ انداز میں بولا۔ ”ہو سکتا ہے، ملزمہ نے پہلے نقدی اور زیورات چھائے ہوں اور الماری پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے ہوں، پھر مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گئی ہو جس کے سبب آلٹوکل پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کا اسے ہوش نہ رہا ہو اور وہ پھری کو وہیں بیڈ کے پیچھے چھپ چکے ہو سکتے ہیں۔“
 ”ہوئے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے آئی اوصاحب!“ میں نے سستے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ عقل سے باہر ہے۔ خیر۔۔۔۔۔“ میں نے تھوڑی دیر تک کرکاک آسودہ سانس لی پھر خاموشی خنجر کی سے پوچھا۔
 ”آئی اوصاحب! ملزمہ کی عدالت کے دوران میں لگ بھگ ایک ہفتہ آپ کی کھڑی میں رہی ہے۔ آپ نے اسے اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سواتے جاگتے اور مختلف اشیاء کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔۔۔۔۔؟“
 ”جی ہاں، بار بار دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔
 ”آپ نے اسے کس ہاتھ کا پایا کیا تھا؟“
 ”میں سمجھتا نہیں۔۔۔۔۔“ اس کی الجھن دو چند ہو گئی۔
 ”مطلب یہ کہ ملزمہ کس ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے؟“ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔
 ”دائیں ہاتھ سے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”جیسا کہ نمونہ لوگ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ رائٹ ہینڈر!“
 ”آئیں ذرا، مقتول کے بیڈروم میں چلتے ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔
 ”جی۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں آئی اوصاحب!“ میں نے لک آئیز انداز میں کہا۔ ”ہم عدالتی کارروائی کو ادھورا چھوڑ کر مقتول کے بیڈروم یعنی جانے وقوعہ پر نہیں جا رہے بلکہ

اس کمرے کا ذکر کر رہے ہیں۔“
 وہ ایک پوچھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔
 ”آئی اوصاحب!“ میں نے دھیمے انداز میں اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ ”آپ نے جانے وقوعہ کا نقشہ تیار کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی بڑی توجہ اور غور سے جائزہ لیا ہوگا؟“
 اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ”میں نے بھی اپنے ذرا رخ کی مدد سے اس بیڈروم کا ایک نقشہ بنایا ہے۔ میں کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ تصدیق کیجیے گا کہ میں غلط ہوں یا صحیح۔۔۔۔۔؟“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔
 ”وہ بارہ ضرب بارہ فٹ کا ایک کشادہ بیڈروم ہے؟“
 ”درست۔۔۔۔۔“
 ”کمرے میں داخل ہونے کا راستہ مغربی دیوار سے ہے؟“
 ”جی ہاں، ایسا ہی ہے۔“
 ”کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ مقتول کا بیڈ اس طرح بچھا ہوا ہے کہ بیڈ کا سر بائیں طرف دیوار کو بچ کر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یعنی مشرقی اور جنوبی دیوار کے اتصال سے وجود پانے والے کونے پر بیڈ کا قبضہ ہے۔“
 ”بالکل درست ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”میں سوالات کرتے ہوئے آپ کے بیڈروم کے کونے کونے سے اپنے جال میں پھانسنے کی سعی میں مصروف تھا اور آئی او بے خبری میں میری کھینچی ہوئی لکیر پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔
 ”بیڈ اپنے سائز میں چھٹ لبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے۔“ میں نے کہا۔
 اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ۔۔۔۔۔“ میں نے اپنے ”کام“ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سرہانے کی طرف اُسے مشرقی دیوار پانچ فٹ اور سائڈ سے جنوبی دیوار چھ فٹ بیڈ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے؟“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ بیڈ اور دیواروں کی یہی صورت حال ہے۔“
 ”مقتول کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے حوالے کیا گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اور بد قسمیت وہ بیڈ پر سویا ہوا تھا یعنی اس کا سر مشرقی دیوار کی جانب اور پاؤں مغربی دیوار کی سمت تھے۔ اگرچہ اس رخ پر سونا ڈھیری پر اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن یہاں پر شریعت کی بات نہیں ہو رہی۔ آپ صرف اتنا بتائیں کہ میں نے مقتول کے لیٹنے کے حوالے

سے جو تعلیمات بتائی ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں؟“
 ”آپ نے بالکل درست نقشہ کھینچا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مقتول اسی پوزیشن میں اپنے بیڈ پر سر دے پایا گیا تھا۔“
 ”پھر تو آپ اس بات سے بھی اتفاق کریں گے کہ قاتل نے جنوبی اور مشرقی سمت سے مقتول پر حملہ نہیں کیا تھا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”بالکل اتفاق کروں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”جن دوستوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اوسر سے تو بیڈ دیواروں کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔“
 ”اور مغربی جانب سے بھی اس نوعیت کا قاتلانہ حملہ ممکن نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔؟“

مقتول کی گردن چھری کے مہلک وار سے، کہاں سے کہاں تک متاثر ہوئی تھی؟“
 ”دیکھیں جناب۔۔۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گردن کے ساتھ مصروف کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”وہ خوف ناک کٹ۔۔۔۔۔ اس نے انکشت شہادت کو اپنے دائیں کان کی لو کے نیچے، چہرے کی ہڈی کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے شروع ہوا تھا اور۔۔۔۔۔ پھر وہ اسی انگلی کو بائیں کندھے پر، گردن کی جڑ کے قریب لے گیا اور ایک جگہ ٹھہراتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تک گیا تھا۔۔۔۔۔“
 ”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”یہ تو خاصا لمبا چوڑا اور خطرناک کٹ تھا اور۔۔۔۔۔ شررگ بے چاری اس کٹ کے سینٹر میں آئی ہے۔ اسے تو کٹنا ہی تھا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلا نا ممکن تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شانی جانب سے حملہ کیا ہوگا جس طرح سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔“
 ”اللہ آپ کا بھلا کرے آئی اوصاحب!“ میں نے بڑی رسلان سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“
 ”وہ بھی نظر سے گئے تھے کہ قاتل نے سیدھا سیدھا حملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تک سوچوں میں نہیں رہنے دیا۔“
 ”آئی اوصاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے مقتول کی کئی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو بہت ضروری تھا۔“
 ”کٹ کا اینٹیل تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”جی بالکل یاد ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”میں اس حوالے سے اپنے مختلف ذرائع استعمال کر کے بڑی تفصیلی اور مصدقہ معلومات حاصل کر چکا تھا گو یا مقتول کی کئی ہوئی گردن کا ہر زاویہ اور ہر منظر میرے تصور کی نگاہ میں محفوظ تھا اور یہی اس کیس کا وہ اہم رخ تھا جس سے ماہرانہ انداز میں کھیلنے ہوئے مجھے اپنی مٹوکل اور اس کیس کی طرز مہ کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔“
 ”بالکل یاد ہے۔۔۔۔۔ میں نے پُر سوچ انداز میں آئی اوصاحب کے الفاظ دہرائے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ ذرا اس کٹ کی وضاحت کر دیں جس سے واضح ہو جائے کہ

”آئی اوصاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالنے سے پہلے ہی آپ کی گردن کا کٹ دیکھ لیا۔“
 ”کندھے سے شروع ہو کر بائیں کان کے نیچے تک چلا گیا تھا جبکہ آپ کا لگایا ہوا کٹ بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں کان تک گیا ہے۔ یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہو گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
 ”آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ تذبذب پھرے انداز میں بھی عورت کی تصویر کو اور بھی اپنے ہاتھوں کو گھم رہا تھا۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔
 ”مثلاً میرا ہاتھ مجھ نہیں پڑ رہا۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”اسی لیے کٹ کا زاویہ بدل گیا ہے۔“
 ”ہاتھ مجھ نہیں پڑ رہا تو ہاتھ کو بدل کر دیکھیں۔“ میں نے اسے فپ دی۔
 ”اس نے میکا کی انداز میں چھری کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا۔ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے عورت کی گردن کاٹنے والا ٹکل دہرایا تو ہو بہو ویسا کٹ لگا جیسے مقتول کی گردن پر پایا گیا تھا۔“

آئی اوصاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالنے سے پہلے ہی آپ کی گردن کا کٹ دیکھ لیا۔“
 ”کندھے سے شروع ہو کر بائیں کان کے نیچے تک چلا گیا تھا جبکہ آپ کا لگایا ہوا کٹ بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں کان تک گیا ہے۔ یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہو گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
 ”آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ تذبذب پھرے انداز میں بھی عورت کی تصویر کو اور بھی اپنے ہاتھوں کو گھم رہا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلا نا ممکن تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شانی جانب سے حملہ کیا ہوگا جس طرح سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔“
 ”اللہ آپ کا بھلا کرے آئی اوصاحب!“ میں نے بڑی رسلان سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“
 ”وہ بھی نظر سے گئے تھے کہ قاتل نے سیدھا سیدھا حملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تک سوچوں میں نہیں رہنے دیا۔“
 ”آئی اوصاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے مقتول کی کئی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو بہت ضروری تھا۔“
 ”کٹ کا اینٹیل تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”جی بالکل یاد ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”میں اس حوالے سے اپنے مختلف ذرائع استعمال کر کے بڑی تفصیلی اور مصدقہ معلومات حاصل کر چکا تھا گو یا مقتول کی کئی ہوئی گردن کا ہر زاویہ اور ہر منظر میرے تصور کی نگاہ میں محفوظ تھا اور یہی اس کیس کا وہ اہم رخ تھا جس سے ماہرانہ انداز میں کھیلنے ہوئے مجھے اپنی مٹوکل اور اس کیس کی طرز مہ کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔“
 ”بالکل یاد ہے۔۔۔۔۔ میں نے پُر سوچ انداز میں آئی اوصاحب کے الفاظ دہرائے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ ذرا اس کٹ کی وضاحت کر دیں جس سے واضح ہو جائے کہ

”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلا نا ممکن تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شانی جانب سے حملہ کیا ہوگا جس طرح سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔“
 ”اللہ آپ کا بھلا کرے آئی اوصاحب!“ میں نے بڑی رسلان سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“
 ”وہ بھی نظر سے گئے تھے کہ قاتل نے سیدھا سیدھا حملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تک سوچوں میں نہیں رہنے دیا۔“
 ”آئی اوصاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے مقتول کی کئی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟“

کہنے مشق

”کچھ آیا کچھ میں جناب کی۔۔۔۔۔؟“
 ”جی کچھ میں آیا کہ۔۔۔۔۔“ وہ بیجاں آمیز سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”قاتل نے اگلے ہاتھ سے چھری کا استعمال کرتے ہوئے اشتیاق بیگ کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“
 ”یعنی قاتل لیفٹ ہنڈ ہے۔“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی بالکل!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”آپ تھوڑی دیر پہلے اس امر کی بھی تصدیق کر چکے ہیں کہ اس کیس کی طرز اور میری مٹوکل وحیدہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے یعنی وہ رائٹ ہنڈ ہے۔۔۔۔۔ جی ہاں؟“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔
 ”اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔“

☆ ☆ ☆
 گزشتہ پیشی پر میں نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپٹر صفدر علی پر خاصی طویل اور معنی خیز جرح کی تھی جس سے کافی ثبوت اور مفید نتائج برآمد ہوئے تھے۔ میں اپنی کارروائی کے لیے اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے ایک نہایت ہی اہم کتبہ عدالت کے حکم میں لانے میں کامیاب رہا تھا کہ اشتیاق بیگ کو جس بھی شخص نے قتل کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا یعنی وہ لیفٹ ہنڈ تھا جبکہ آئی اوصاحب نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میری مٹوکل اور اس کیس کی طرز وحیدہ رائٹ ہنڈ تھی۔

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں صرف ایک کا بیان قاتل ذکر اور اہمیت کا حامل ہے۔ میں یہاں پر اسی گواہ کا احوال بیان کر رہا ہوں گا۔
 مقتول کے بچنے کے عین سامنے جو بگلا واقع تھا اس کے چوکیدار نے وقوعہ کے روز طرز کو اپنے بچنے سے نکلنے دیکھا تھا یعنی مقتول کے بچنے سے۔ مذکورہ چوکیدار نمازم کا نام افضل خان تھا۔ افضل خان کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانہ قد کا مالک اور عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ افضل خان نے جج بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔
 ”افضل خان! تم نے وقوعہ کے روز جس عورت کو مقتول کے بچنے سے نکلنے دیکھا تھا کیا وہ یہی ہے؟“ بات

کے اعتقاد پر وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیڈڈ باکس میں کھڑی میری ٹوکلی کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
 ”جی جی..... بالکل سچی تھی۔“ گواہ نے جواب دیا۔
 ”ڈراموںج کر بتاؤ، یہ کتنے بچے کا واقعہ ہے؟“ وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔
 ”سڑھے دس بچے کا۔“ گواہ نے بڑے اعتماد سے بتایا۔
 مجھے یہ سمجھ لینے میں کوئی دقت..... محسوس نہیں ہوئی کہ گواہ ایک رٹا ہوا بیان دے رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت دس اور بارہ بچے کے درمیان واقع ہوئی تھی گواہ کے سڑھے دس بچے والے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ملزم اپنے مالک کو قتل کرنے کے بعد جھگڑے سے لنگی تھی۔
 ”تم نے ملزم کے انداز میں کوئی خاص بات نوٹ کی؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتی اور بولا۔ ”اس نے باہر آ کر گیت کو بند کیا اور کھڑی بھی لگا دی۔“
 ”یعنی گیت کو باہر سے کھڑی لگا دی؟“ وکیل استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے افضل خان کی طرف دیکھا۔
 ”جی بالکل..... باہر سے کھڑی لگا دی۔“ گواہ نے بڑے وقار سے جواب دیا۔
 ”جی جی.....“ گواہ نے حیرت ہوئی تھی۔
 ”کیا تم نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ گیت کو باہر سے کھڑی کیوں لگا کر جا رہی ہے؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”میرے دل میں تو آیا تھا کہ اس سے پوچھوں لیکن اس نے اتنا سوچ ہی نہیں دیا.....“
 ”موقع نہیں دیا..... کیا مطلب؟“ وکیل استغاثہ نے سنسنی خیز انداز میں استفسار کیا۔
 ”جناب! اس اللہ کی بندی نے جلدی سے گیت بند کر کے باہر سے کھڑی لگا لی اور اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا اور کوئی سوال کرتا، یہ آٹا فانا میری نگاہ سے غائب ہو گئی۔“
 ”نگاہ سے غائب ہو گئی.....“ وکیل استغاثہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزم نے کوئی جادوئی عمل کیا تھا؟“
 ”نہن..... نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔“

”جی جی.....“ گواہ نے جواب دیا۔
 ”کیا تم نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ گیت کو باہر سے کھڑی کیوں لگا کر جا رہی ہے؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”میرے دل میں تو آیا تھا کہ اس سے پوچھوں لیکن اس نے اتنا سوچ ہی نہیں دیا.....“
 ”موقع نہیں دیا..... کیا مطلب؟“ وکیل استغاثہ نے سنسنی خیز انداز میں استفسار کیا۔
 ”جناب! اس اللہ کی بندی نے جلدی سے گیت بند کر کے باہر سے کھڑی لگا لی اور اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا اور کوئی سوال کرتا، یہ آٹا فانا میری نگاہ سے غائب ہو گئی۔“
 ”نگاہ سے غائب ہو گئی.....“ وکیل استغاثہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزم نے کوئی جادوئی عمل کیا تھا؟“
 ”نہن..... نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔“

میرے سوال کے جواب میں وہ تر ت بولا۔ ”میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا.....“
 ”پھر تم نے کیا بتایا تھا؟“ میں نے بہت مصہمیت سے پوچھا۔
 ”میں نے تو کہا تھا کہ اس وقت سڑھے دس بچے تھے۔“
 ”فکس سڑھے دس؟“ میں نے غصے لہجے میں پوچھا۔
 ”جی بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”کیا تم وقت کا درست اندازہ لگانے کے ماہر ہو یا تم نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا جو اتنے دقوت سے بتا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اوکے..... تمہاری گھڑی کا وقت تو درست ہے نا؟“
 ”اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھا دیے۔ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔
 ”جناب عالی! یہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کا مقتول کے ٹیلی فون کا کال ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ کے مطابق مذکورہ نمبر پر دن کے پہلے صبح میں، پہلے سڑھے نو بجے اور پھر پندرہ بجے کال آئی تھی۔ ان دونوں کالز کی تاریخ بیس جنوری کی صبح ہے۔ لیکن میں ایک حیرت پھر مختصر ذکر کروں گا.....“
 ”مخالی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھا دیا۔
 ”سڑھے نو بجے کسی کا فون آتا ہے۔ مقتول کی بیوہ زمرس فون اینڈ کرتی ہے اور ملزم کو بتاتی ہے کہ کسی میڈیکل انسور والے کا فون ہے۔ اس کے بعد زمرس جھگڑے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ پھر دس بیسٹائیس یعنی پونے گیارہ بجے ایئر پور ملزم، زمرس کی کال ریسو کرتی ہے اور زمرس اسے بتاتی ہے کہ وہ دس پندرہ بجے وہاں آ جائے گی۔ اگر وہ مزید چند منٹ لیٹ ہو جائے تو ملزم اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے چلی جائے۔ ملزم نے اپنی مالکن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گیارہ بج کر پانچ بجے پر بنگلہ چھوڑا اور گیت کو باہر سے کھڑی لگا کر فیاض شیخ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی لیکن.....“
 ”میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر استغاثہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن..... افضل خان کا دعویٰ ہے کہ اس نے ملزم کو ٹھیک سڑھے دس بجے جھگڑے سے گھبرائے ہوئے انداز میں لنگے، گیت کو باہر سے کھڑی لگاتے اور وہاں سے فرار ہوتے

انچارج

میاں، بیوی چوری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔
 خاوند۔ ”جو شخص چوری کرتا ہے وہ بعد میں ضرور پچھتا تا ہے۔“
 بیوی رومانگ موڈ میں بولی۔ ”اور آپ نے جو شادی سے پہلے میری نیندیں چرائی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 خاوند۔ ”کواس کر تو رہا ہوں، وہ بعد میں ضرور پچھتا تا ہے۔“
 مرسلہ۔ قاضی عرفان احمد عاجز، چو آیدین شاہ

دیکھا تھا جبکہ حالات و واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ افضل خان کے بتائے ہوئے وقت پر ملزم مقتول کے جھگڑے کے اندر موجود تھی اور کم از کم پونے گیارہ بجے تک وہ جھگڑے میں موجود تھی۔ کیونکہ ایک ایک گیارہ بجے تک وہ ملزم فون پر بات کر رہی تھی۔
 جج نے گھور نظر سے افضل خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔ کیا تمہیں پتا ہے، اس دروغ گوئی پر تمہارے خلاف تعزیری کارروائی بھی ہو سکتی ہے؟“
 ”مجھے معاف کر دیں جناب۔“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”ہوسکتا ہے، اس دن میری گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ اگر مجھے پتا ہو تا کہ سڑھے دس بجے ملزم جھگڑے کے اندر موجود تھی اور پونے گیارہ بجے اس کی زمرس سے فون پر بات بھی ہوئی تھی تو میں ایسا بیان نہ دیتا۔“
 ”بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔“ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”افضل خان!“ میں اپنے کام سے لگ گیا۔ ”تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم نے تمہیں بات کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا ورنہ تم اس سے بہت کچھ کہنے والے تھے۔“
 ”جی، میں نے یہی کہا ہے۔“ وہ قدرے سنہیلے ہوئے بولا۔ ”میں اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا سبب جانتا چاہتا تھا۔“

”تم جسے میری غلط فہمی کہہ رہے ہو، وہ ایک سفاک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے نصف درجن گواہ بھی ہیں جن میں تمہاری گلی کے کونے پر واقع جنرل اسٹور کا مالک ظہیر الدین اور اس کے برابر میں موجود پان فروش شاکر بھی شامل ہے۔۔۔۔۔ آئی جی۔۔۔۔۔ یا پہلی ہی جلی کی؟“

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر نکلے گا۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھا۔

”بیگ صاحب! یہ غلط فہمی والا کیا معاملہ ہے؟“

”جناب عالی!“ میں نے کھسکا کر گلا صاف کیا پھر بڑی کراری آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”استغاثہ کا محرز گواہ افضل خان کافی عرصے سے ملزم پر نگاہ کر کے ہوئے تھا اور میری معلومات کے مطابق یہ کوئی اچھی نگاہ نہیں تھی۔ میری معلومات کی تصدیق کے لیے جنرل اسٹور کے مالک ظہیر الدین اور پان فروش شاکر کو عدالت میں بلایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں افراد اس شرمناک واقعے کے معنی شاہد ہیں جب نصف درجن افراد نے افضل خان کی درگت بنائی تھی اور وہ بھی بیچ چور ہے۔۔۔۔۔“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے وقف کیا پھر اپنی بات کو دراز کرتے ہوئے مزید کہا۔

”جیسا کہ میں نے بتایا، گواہ ملزم پر کافی عرصے سے بری نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا، یہ ملزم سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک بار تو اس نے گواہ کو بہت مہنگی پرستی۔ جب گلی کے کونے پر گواہ نے ملزم کو زبردستی روکنے کی کوشش کی۔ ملزم نے اس کے منہ پر زنائے دار ٹانجے رسید کیا تو اس پاس موجود افراد ان کی جانب متوجہ ہو گئے پھر اس سرعام بدتمیزی پر ”عوام“ نے افضل خان کی خوب خاطر تواضع کر ڈالی تھی اور اب۔۔۔۔۔“ میں نے کھائی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

”اور اب۔۔۔۔۔ یعنی وقوعہ کے روز جب افضل خان نے دیکھا کہ ملزم کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو یہ اپنی اس دن والی بے عزتی کا ملزم سے بدلہ لینے کے لیے اس نوعیت کا بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وقوعہ کے روز ملزم کچھ اس قدر ٹھہرائے ہوئے انداز میں مقتول کے پتھلے سے رخصت ہوئی تھی جیسے وہ اشتیاق بیگ کو قتل کر کے فرار ہو رہی ہو۔“

میں خاموش ہوا تو عدالت کے کمرے میں موجود افراد کی سرگوشیاں ایک مخصوص نوعیت کی جھنڈا ہٹ کی صورت میں ابھرنے لگیں۔ لوگوں کی اکثریت ناپسندیدہ

نظروں سے استغاثہ کے گواہ افضل خان کو دیکھ رہی تھی چہ میگوئیاں بھی کر رہی تھی۔

جج نے ”آرڈر۔۔۔۔۔ آرڈر“ کی صدا بلند کر کے عدالت کے کمرے کے مخصوص سکون کو قائم کیا اور خاصے سخت الفاظ میں گواہ افضل خان کو زبردستی۔ اس کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”بیگ صاحب! آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟“

”نہیں جناب عالی!“ میں نے نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”استغاثہ کے محرز گواہ کی بدتمیزی اور دروغ گوئی عدالت کے ریکارڈ پر آچکی ہے۔ مجھے افضل خان سے مزید کچھ نہیں پوچھنا البتہ۔۔۔۔۔ عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”یہی درخواست؟“ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

”فیاض شیخ کی بیوی امینہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ میں نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”میں نے امینہ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اس کی گواہی ہو جائے تو میری مؤکل کی بے گناہی مزید ثابت ہو جائے گی۔ میں محرز عدالت کی اجازت سے امینہ کو پیش کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ جج نے اجازت میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

امینہ، فیاض شیخ کی بیوی بہت موٹی اور غصہ ور عورت تھی۔ فیاض شیخ بھی اس کے سامنے بھیجا بلایا نظر آتا تھا۔ ملزم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی تھی اور اسے ڈانٹ ڈھپٹ کیا کرتی تھی۔ میرے شاریات کے مطابق امینہ کی گواہی میری مؤکل کے لیے کافی سودمند ثابت ہونے والی تھی۔

امینہ نے جج بولنے کا حلق اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر دیا تو میں مختصری جرح کے لیے وٹس باکس کے قریب چلا گیا۔

”امینہ جی!“ میں نے انگلی سے اکیوڈ باکس میں موجود اس کیس کی ملزمہ وحیدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟“

”جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ پہلے یہ میرے گھر میں کام کر چکی ہے۔“

”پھر اس نے آپ کے گھر کا کام کیوں چھوڑ دیا؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے مشق

”اس نے کام چھوڑا نہیں بلکہ یہ قتل کے کیس میں گرفتار ہو گئی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے یہ میرے گھر میں کام کرنے نہیں آسکی۔“

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس بے چاری نے اپنے مالک اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ تو اللہ کو پتا ہوگا پھر آپ جیسے قانون دانوں کو۔“ وہ قدرے بیزار سی بولی۔ ”میں کیا جانوں!“

”اوکے۔۔۔۔۔“ میں نے مصلحت آمیز انداز میں گردن ہلائی۔

”آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ ملزمہ کس کردار کی مالک ہے؟“

”میں آپ کا سوال سمجھ نہیں پاتی۔“ اس نے ابھین زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، یہ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں کیسی ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں چوری چکامری کی عادت تو نہیں ہے؟“

”جی بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے اور خدا کو حساب دینا ہے اس لیے میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اس عورت نے میرے گھر سے بھی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی۔ یہ اپنے کام سے کام لے کر اپنے مالک کا کام چھوڑا۔“

”اس کے باوجود بھی اسے آپ کی ڈانٹ ڈھپٹ سننا پڑتی ہے۔“ میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ڈانٹ ڈھپٹ بہت ضروری ہے۔ اس سے انسان کا دماغ درست رہتا ہے۔“

”میری معلومات کے مطابق، ملزمہ روزانہ دوپہر گیارہ بجے بسے ایک بجے تک آپ کے گھر کام کرنے آیا کرتی تھی۔“ میں نے اصل نکتے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”کیا وقوعہ کے روز بھی یہ اپنے وقت پر ہی آئی تھی؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ عموماً گیارہ بج کر پانچ منٹ پر آ جاتا کرتی تھی لیکن اس روز یہ تقریباً پانچ بجے منٹ لیت آئی تھی لہذا میں نے اسے چھٹی بجی لیت ہی دی تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تو وقوعہ کے روز آپ نے اسے دیر سے چھوڑا تھا؟“

”زیادہ دیر سے نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ

پانچ بجے منٹ لیت آئی تھی۔ میں نے اسے دس منٹ لیت چھوڑا۔ یہ ایک بج کر دس منٹ پر میرے گھر سے نکلی تھی۔“

”امینہ جی! ایک نہایت ہی اہم سوال کر رہا ہوں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے گا۔“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ بہت تن کوئی ہوگی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وقوعہ کے روز یعنی میں جنوری کو ملزمہ نے دوپہر گیارہ دس سے ایک دس تک آپ کے گھر میں کام کیا۔ کیا

آپ نے اس کے انداز میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی؟“

”کس قسم کی تبدیلی؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”مثلاً کسی نوعیت کی بے چینی، اضطراب، پریشانی،

بوکھلاہٹ یا گھبراہٹ۔۔۔۔۔؟“

”نہیں، میں نے اس میں ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔“ اس نے پُر ذوق انداز میں کہا۔ ”اس نے معمول کے مطابق کام کیا اور پہلی گئی۔“

”محرز عدالت کے سامنے حقیقت بیانی کا بہت شکر ہے۔“ میں نے امینہ بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب رخ پھیر کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

اس نے کچھ عرصے بعد اسے قلم بٹوے کے ساتھ اپنے چادر روز بعدی تاریخ دے کر عدالت پر رخصت کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل۔۔۔۔۔!“

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹس باکس میں اس کیس کی سب سے اہم گواہ یعنی مدعی زمرگس کھڑی تھی۔ گزشتہ تین جنوری کو زمرگس کے شوہر اشتیاق بیگ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا لیکن زمرگس کے بناؤ سنگار اور پہناہم سے لگتا نہیں تھا کہ وہ بیوہ ہو۔

وکیل استغاثہ اپنا ”کام“ مکمل کر چکا تو میں جرح کے لیے زمرگس والے کمرے کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ بجا کر ہمدردی میرے لہجے میں کہا۔

”زمرگس صاحب! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ کچھ عرصہ قبل آپ کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ میں آپ کے دکھ درد

میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ کارروائی بھی ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

”جب یہ کیس عدالت میں لگا ہوا ہے تو پھر یہ سب تو ہونا ہے۔ آپ اپنا کام شروع کریں۔“

☆

☆

”زمکس صاحب! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کی صبح آپ کو اچانک گھر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ ایک فون آیا تھا اور.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ضررے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جی، یہ درست ہے۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور والے کا فون تھا۔ ڈاکٹر نے میرے گھر کو جو ادویات لکھ کر دی تھیں ان میں ایک گولی اکثر مارکیٹ سے شارٹ رہتی تھی اور اسے تلاش کرنے میں مجھے کافی دشواری ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس میڈیکل اسٹور والے سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی اس کے اسٹور پر یہ گولی آئے تو وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔“

”تو یہ ٹیلی فونک اطلاع اسی سلسلے میں تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے اپنی فائلوں کے پاس رکھی ایک کتاب کو اٹھا کر زمکس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ فیض احمد فیض صاحب کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟“

میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں۔“

”نہیں..... میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان نے ہر کتاب پڑھ رکھی ہو۔“ میں نے مذکورہ کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اگر میری معلومات غلط نہیں ہیں تو آپ کی رہائش ٹارگھ ناظم آباد کے علاقے میں ہے۔ آپ دو سو گز کے ایک عالی شان بنگلے میں رہتی ہیں جو وہ بیڈروم ایک ڈرائنگ روم، ایک ٹی وی لائونج اور خوب صورت لان پر مشتمل ہے۔“

”آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔“ وہ میرے پھیلے ہوئے چال میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔ ”یوں محسوس ہوتا ہے آپ نے میرے بنگلے کا ذکر کر رکھا ہو۔“

”ابھی تک تو نہیں کیا.....“ میں نے متنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ پیشی سے پہلے یہ نیک کام بھی کرنا پڑے گا۔ اپنی ہاؤس.....“ میں نے بحالی

توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”جس شخص نے وقوعہ کے روز آپ کو کسی مخصوص ٹیلیٹ کے بارے میں فون کیا تھا، اس کا اسٹور بھی تاریخہ ناظم آباد ہی میں ہے۔“

”جی!“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”ناظم آباد ناظم آباد کوئی کاف خاصا وسیع و عریض علاقہ ہے۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے گھر کے نزدیک ہی ہے یا کچھ فاصلے پر؟“

”نہ زیادہ دور نہ زیادہ نزدیک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ ہو گا۔“

”دس سے پندرہ منٹ.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پیدل یا کار میں؟“

”جی پیدل..... مطلب واکنگ ڈسٹنس ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوکے..... مگر آپ تو وقوعہ کے روز اپنی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھیں؟“

”جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایک دو کام اور بھی تھے اور گاڑی ضروری تھی۔“

”وقوعہ کے روز آپ نے پہلے وہ اہم دو کام حاصل کی تھے یا پہلے وہ دوسرے ایک دو کام نمٹائے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ظاہر ہے، میں نے پہلے وہ دو کام حاصل کی تھے۔“ اس نے بڑی رसान سے جواب دیا۔ ”دوسرے کام تو کسی وقت بھی کیے جاسکتے تھے۔“

”زمکس صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا پسند کریں گی جس نے وقوعہ کے روز فون کر کے آپ کو اس دوا کی دستیابی کی اطلاع دی تھی۔“

”کیوں.....“ وہ بد کے ہوئے انداز میں بولی۔ ”اس کے نام کی کیا ضرورت ہے؟“

”آئیڈینٹیشن پورا کرنے،“ وکیل استغاثہ نے احتیاجی لہجے میں کہا۔ ”ڈیفینس استغاثہ کی معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اٹ اٹناٹ فیر“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میری صورت ایسی خوف ناک ہے، نہ میں نے ہاتھ میں آئینے اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک کوئی جارحانہ

دھمکی آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پھر معزز گواہ کس چیز سے ہراساں ہو رہی ہیں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔“

جج نے زمکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لی لی! آپ کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا ہو گا جس نے وقوعہ کے روز آپ کو فون کیا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے اسے عدالت میں طلب کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔“

”جی..... فرحان! وہ جلدی سے بولی۔ ”اس کا نام فرحان ہے۔“

”بیک صاحب! پلیز پروسیڈ“ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”زمکس صاحب! میری معلومات اور محکمہ ٹیلی فون کے ریکارڈ کے مطابق جج ساڑھے نو بجے آپ کے گھر کے فون پر کسی کی کال آئی تھی۔ آپ نے بتایا کہ اس میڈیکل اسٹور والے فرحان نے بیس جنوری یعنی وقوعہ کے روز ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ کو اس مخصوص ٹیلیٹ کے بارے میں فون کر کے اطلاع دی تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں! بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی لہجے میں بولی۔

”آپ اپنی گاڑی لے کر بنگلے سے نکلیں۔ سب سے پہلے آپ نے وہ ٹیلیٹس حاصل کیں پھر اپنے دوسرے کام نمٹانے چلی گئیں۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟“

”جی..... جی۔“ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے بنگلے سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے بقول دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ..... گاڑی میں تو اور بھی کم وقت لگا ہو گا.....؟“

”جی..... میں پانچ چھ منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ نو بج کر چالیس منٹ پر آپ نے وہ میڈیکل اسٹور حاصل کر لی تھی؟“ میں نے ٹپوٹے والے انداز میں سوال کیا۔

”جی، بالکل.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”زمکس صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

”بیس جنوری کو کراچی میں سن رائزر (طلوع آفتاب) صبح سات بج کر سترہ منٹ پر تھا اور سن سیٹ (غروب آفتاب) شام چھ بج کر چھ منٹ پر تھا۔“

”نکر..... میں کیا کروں.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں.....؟“

”اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کرنا ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”کون سا اہم سوال؟“ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔

”بیس جنوری کی صبح کراچی کے مشرقی افق پر صبح سات بج کر سترہ منٹ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک دو گھنٹے تیرہ منٹ بعد یعنی ساڑھے نو بجے فرحان صاحب آپ کو فون کر کے ٹیلیٹ لے جانے کے لیے کہتے ہیں اور آپ نے ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے نو بج کر چالیس منٹ پر وہ دو حاصل کر لی تھی یعنی نو بجے سے بھی پہلے.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر استغاثہ کی گواہ سے استفسار کیا۔

”زمکس صاحب! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کراچی کی ہسٹری میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیکل اسٹور گیارہ بجے یا اس سے بھی کچھ بعد کھلتے ہیں یا کیا فرحان صاحب کا میڈیکل اسٹور کراچی کی حدود سے باہر ہے یا وہ بیس جنوری کو علی الصبح اپنا اسٹور کھول کر کراچی کی ہسٹری میں اپنا نام ذرا مختلف انداز میں لکھوانے کے متنی تھے.....؟“

”وہ..... وہ جی.....“ وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

”وہ جی اور یہ جی سے کام نہیں چلے گا۔“ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ”آپ جو بھی جواب دیں گی اس کی تصدیق کے لیے فرحان صاحب کو عدالت میں بلایا جائے گا۔“

وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ دراصل فرحان کا اسٹور اس وقت بند تھا۔ اس نے اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا۔“

اس کی آنکھیں اور چہرہ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے وہ میڈیکل اسٹور فرحان کے میڈیکل اسٹور سے نہیں بلکہ اس کے گھر سے جاکر حاصل کی تھی؟“

”جی..... جی.....“ وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”یہ امر جیسی عقل سے باور ہے؟“ میں نے سخت الفاظ میں کہا۔ ”خیر..... فرحان کو تو عدالت میں طلب کرنا ناگزیر ہو ہی چکا ہے کیونکہ ٹھوڑی دیر پہلے آپ بتا چکی ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ نے وہ میڈیکل فرحان کے میڈیکل اسٹور سے حاصل کی تھی۔ اب تو مجھے آپ کی اس بات پر بھی یقین نہیں رہا کہ یہ کتاب.....“

میں دانستہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر فیض صاحب کے شعری مجموعے کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر وہ کتاب فرس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”اچھی طرح سوچ کر بتائیں، یہ کتاب آپ نے پڑھ رکھی ہے یا نہیں؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے بولی۔

”اوکے“ میں نے ایک بار پھر وہ کتاب اس سے واپس لے کر چوٹی میز پر رکھ دی پھر استفسار کی سب سے اہم گواہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”فرس صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے دس بج کر پینتیس منٹ پر یعنی پونے گیارہ بجے..... اپنے بیٹے پر فون کر کے مزمہ سے کہا تھا کہ آپ گھر کے قریب ہی کہیں موجود ہیں اور دس پندرہ منٹ بعد آپ پہنچ رہی ہیں؟“

میں نے اس کا جواب دیا۔ ”جواب دیا۔“

”اور مزمہ سے آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے چھٹی کر کے چل جائے اور.....“

”نہیں!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میری واپسی تک بیٹھے بر ہی رکے۔ میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مزمہ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی ظاہر ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”پونے گیارہ بجے آپ اپنے بیٹے سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھیں۔“ میں نے جیسے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ لیکن آپ کی واپسی ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے یہ پونے دو گھنٹے کہاں گزارے تھے؟“

”جب میں نے مزمہ کو فون کیا اس وقت میں واقعی گھر سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ایک جگہ پر تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن پھر اچانک مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں مطمئن بھی کہ میں نے مزمہ کو گھر پر رکھنے کے

لے کہہ دیا ہے۔“

”اوہ..... اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کے اس اچانک یاد آ جانے والے ضروری کام کی تفصیلات بھی طلب کرنی چاہئیں گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میری مٹوکل اور اس کیس کی مزمہ وجہ کے بیان کے مطابق آلٹول یعنی گوشت کاٹنے والی وہ تیز دھار چھری جس سے آپ کے شوہر کو زخم کیا گیا، چند روز پہلے وہ چھری چکن میں سے غائب ہو گئی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ وہ ناپسندیدہ نظر سے مزمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“

”اوکے..... جھوٹ اور جھگڑا کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ عدالت لگی ہوئی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس عدالت میں مزمہ پر دو کیس چل رہے ہیں۔ نمبروں، اس نے آپ کے شوہر اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہے۔ نمبر نو، اس نے آپ کی الماری میں سے دس ہزار نقدی اور لاکھ بیک چائیس ہزار کے زیورات چرائے ہیں کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”میں آپ کے بیٹے کے دو میڈیکل وزٹ کی تاریخ پڑھ کر

بیان کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں نہیں غلطی پر ہوا تو

فرس صاحب! وہ آپ کے بیٹے کے دو میڈیکل وزٹ کی تاریخ پڑھ کر

پر سے فیصلہ کر لیں گا۔ شعری مجموعہ اٹھایا پھر اسے فرس کی

طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب تک میں اپنی بات مکمل کرتا ہوں اس کتاب کو آپ پکڑے رکھیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اب

آپ سے وہ سوال نہیں کروں گا جو پہلے دوبارہ کر چکا ہوں۔“

لحائی تذبذب کے بعد اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے گہری تنجیدگی سے بولنا شروع کیا۔

”دونوں بیٹرومز بیٹھے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ہیں۔ دونوں کا سائز بھی ایک جیسا ہی ہے یعنی بارہ بائی بارہ

فٹ اور دونوں کے داخلی دروازے مغربی سمت میں ہیں۔“

”بالکل درست! اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مقتول کا بیڈ اور وہ الماری جس میں سے نقدی اور زیورات چرائے گئے، یہ دونوں چیزیں دو مختلف بیٹرومز میں ہیں۔ مقتول کا بیڈ اپنے کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ

اور آپ کی الماری آپ کے بیڈروم کی شمالی دیوار کے ساتھ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

حیرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ نے میرے گھر کا سروے کر رکھا ہو۔“

”مٹوکل کو اس نوعیت کی سازی معلومات رکھنا پڑتی ہیں۔“ میں نے گہری تنجیدگی سے کہا۔ ”اور میرے خیال کے مطابق، مقتول اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر آپ کے بیڈروم کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا تھا؟“

”سوال ہی پائیدل ہوتا۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

”استفسار کے مطابق مزمہ نے پہلے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے۔ اس کے بعد آپ کے شوہر کو قتل کر کے بیٹھے سے روانہ ہو گئی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا کہتی ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ دونوں کام مزمہ نے میرے سامنے ٹھوڑی کیے ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے، وہی درست ہے۔“

”استفسار کی رپورٹ کے مطابق پہلے مزمہ نے نقدی اور زیورات چرائے پھر خود کو دیکھ لے جانے کے خوف سے

اس نے آپ کے شوہر کو قتل کر دیا لیکن آپ اس امر کی تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ کا شوہر اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے

دوسرے بیڈروم میں رہی آپ کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا لہذا

بغرض خیال، اگر مزمہ نے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے تھے تو اس نے آپ کے شوہر کے کمرے میں

آئی نہیں سکتا اور پھر.....“ لٹائی توقف کر کے میں نے فرس

کے چہرے پر ابھرنے والے پریشانی کے تاثرات کا جائزہ

لیا اور کہا۔

”اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ آپ کے شوہر کی موت نیند کے دوران میں ہوئی ہے یعنی اگر مزمہ

نے جوہری کی بھی تھی تو آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر اسے دیکھ

نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ناشتے والی دوا کے قتل بے ہوشی کی

حالت میں تھا۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اشتیاق کی ایک دوا ایسی ہے جس سے نیند آتی ہے۔“

”گو یا استفسار کا بیان درست نہیں۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر مزمہ نے نقدی اور زیورات چرائے لیے تھے تو اسے آپ کے شوہر کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؟“

”مگر اس چھری پر مزمہ کی انگلیوں کے نشانات ملے

گنا۔“ وہ ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”آپ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟“

”جیسے دوسری اتنی بڑی حقیقت کو استفسار نے نظر انداز کر دیا ہے۔“ میں نے سناٹا تو ہونے لگے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... مم..... میرا مطلب

ہے..... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ آپ کی الماری پر

مزمہ کے فنگر پرنس نہیں پائے گئے لیکن استفسار کو یقین ہے

کہ نقدی اور زیورات اسی نے چرائے ہیں۔ دوسری جانب

چھری پر مزمہ کے فنگر پرنس پائے گئے ہیں اور مجھے یقین

ہے کہ یہ قتل میری مٹوکل نے نہیں کیا۔“

”ہتا نہیں آپ کس قسم کی ابھی ہوئی باتیں کر رہے

ہیں۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔“

”مب سمجھ میں آجائے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا

کہ آج عدالت میری مٹوکل کو بے گناہ مان کر رہا کر دے

گی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور

زیر لب مسکراتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ”لاکھ، یہ کتاب

مجھے دے دیں۔ اس کا کام ختم ہو چکا۔“

”ال سبک جیسے برا بھلا کچھ نہیں کہنا سکتا۔“

شعری مجموعے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے

پوچھا۔ ”اس کتاب کا کیا کام تھا جو پورا ہو گیا اور عدالت کس

بتا پر مزمہ کو بری کر دے گی؟“

”فرس صاحب! میں آپ کے دونوں سوالوں کا

جواب دوں گا۔“ میں نے یہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا

جواب بعد میں۔ آپ کو میری اس بے ترتیبی پر کوئی

اعتراض تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“ وہ ساٹ آواز میں بولی۔

میں نے لکھا تھا کہ گلا صاف کیا پھر کہا۔ ”عدالت آج

میری مٹوکل کو اس لیے بری کرے گی کہ وہ دوا میں ہاتھ سے

کام کرنے کی عادی یعنی رائٹ ہینڈ ہے جبکہ آپ کے شوہر

کا قاتل بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی یعنی لیفٹ ہینڈ

ہے اور..... اس امر کی تصدیق ایک پچھل تیشی پر اس کیس

کے انکوائری آفیسر نے بھی کی ہے۔“

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر

منظر پر نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں اس کے کہ وہ مکمل استفسار ہمارے بیچ کو پڑتا،

نہیں ہیں جو یہ ظاہر نظر آرہے ہیں بلکہ ملزم کو پھانسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اسی شک کی بنیاد پر چوری کے باقی گیارہ ارکان سے دس روز تک الجھتا رہا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو وہ قائل ہو رہے تھے اور نہ ہی مجھے قائل کر سکے تھے۔ وہ اپنی سر توڑ کوشش کے باوجود مجھے میرے موقف سے ہٹانے میں ناکام رہے تھے۔ بعد ازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ میرا شک اپنی جگہ درست ہے۔ قتل کے پس پردہ وہی واقعات تھے جن کا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ ملزم خارج نہیں جاتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کوئی قتل بھی ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ مقدمے کے دوران یہ بات سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ وہ احمق عدالت کو یہی بیان دینا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا وکیل ہو رہا ہے، بے حد محتاط اور زیرک واقع ہوا تھا۔ وکیل استعاذ کا نام رکھتا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار وکیل تھا اور اس کیس کے پرچے اڑانے پر ہلا ہوا تھا۔ شکا کو جیسے جگہ نہ خیر میں ہر سال ایک دو بڑے اور سستی خیر مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے استاذ چسپ اور سستی خیر تھا کہ عمر سے شک اس کی بنا پر عدالت سامنے آ رہی تھی۔

میں شروع ہی سے اس مقدمے میں دلچسپی لیتا رہا اور حتیٰ کہ میرے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ کاش مجھے اس مقدمے میں چوری کا ایک رکن بتایا جائے اور..... ایک روز خلاف توقع عدالت سے میرا بلاوا آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس وقت تک اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا جب تک باقی ارکان مجھ سے نجات نہیں حاصل کر لیتے۔ بہر حال یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ساہا سال کے بعد مجھے ایک ایسے کیس میں چوری کے رکن کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا جس نے مجھے سمجھ کر دیا تھا۔

جلوہ افروز تھے۔ یہ لوگ اس جھوٹے مقدمے کا بڑی... بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر مجھے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں بھی دوسروں کی طرح شدت سے چوری کے رکن کے فرائض انجام دینے کا خواہش مند تھا۔ مجھ سے کئی سوالات کیے گئے جن کا میں نے تسلی بخش جواب دیا۔ تب مجھے اس فرض کی اداسگی کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے ان کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا کہ میں نے اس مقدمے کی بابت بہت تھوڑا پڑھا ہے اور کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتا اور یہ کہ میں سزائے موت کے خلاف نہیں ہوں۔ میں نے ساری عمر لگا کر تین جھوٹ نہیں بولے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد لوگ ایک ایک اور بڑے جھوٹے کو پکڑ لائے اور اس طرح ہم بارہ ہو گئے۔ بارہ معصوم جھوٹے۔

اگلے روز سے اس کیس کی جزئیات سامنے آنے لگیں۔ میں نے لگا ہی سمجھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور مجھ پر یہ عقیدہ کھلا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی گیارہ معصوم خیر اعلیٰ دماغ سمجھا نہیں دیکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکاری وکیل اور شاہد وکیل صفائی بھی یہی چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا لیکن میں پہلے ہی اس کیس کی تفصیل سے واقف تھا اور سب سمجھ جاتا تھا۔ مقدمے کا سب سے اہم سرکاری گواہ قتل پولیس مین دینی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام اور خوش طبع شخص تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ایک رات تقریباً دو بجے اس نے ملزم جارج کو ریلوے پر دست کھڑا پایا تھا۔ اس سے کچھ قافلے پر ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور ملزم ہکا بکا اپنے ریلوے کو گھور رہا تھا۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا کہ اس نے اس شخص کو کیوں قتل کیا تو ملزم نے اعتراف جرم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے ہاتھ میں موجود ریلوے کا کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر رہا۔

دینی کے بیان کے مطابق ملزم جارج نشتے میں دھت تھا۔ اس نے موقع واردات سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب دینی نے اس سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے تو وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مقتول کی جلد ہی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کا نام ہو دارڈ تھا۔ وہ ایک رنڈا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن میں اور دوسری سینے میں۔ اس کی لاش اسی وقت مجھے دیکھنے کے ادارے کو بھیج دی گئی اور ملزم جارج کو پولیس اسٹیشن کی ایک کٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں وہ ساری رات گھوڑے سے بچ کر سوتا

رہا اور دن چڑھے بیدار ہونے کے بعد اس نے جرم کی صحت سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد ازاں اس پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا تھا۔

ملزم جارج کا کہنا تھا کہ مقتول ہو دارڈ اس کے لیے قتل کی اجنبی تھا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ نشتے میں دھت ہونے کے باوجود اس کے پاس ہو دارڈ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ اس کے پاس اس وقت یا زندگی میں کبھی ریلوے تھا۔ اس کی تصدیق اس کے دوستوں نے بھی کی جو سب کے سب معزز شہری تھے۔ چارچہ ذات خود ایک معزز شہری تھا اور سچ پوچھیے تو بہت سی حقیقتوں میں ایک یہ حقیقت بھی اس کے خلاف جانی تھی۔ وہ خوش حال تھا، اچھے لباس زیب تن کرتا تھا اور اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اس قسم کا کوئی آدمی اگر کسی سنگین جرم میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس کے کارنامے کو بری طرح اچھلا جاتا ہے اور عام شہری تو درگزر، سچ اور چوری بھی اس سے بدلتے ہو جاتے ہیں۔ جب اس نے عدالت کو اس رات کا واقعہ سنایا تو اس کا وکیل ہو رہا تھا۔ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل سچی اور سب سے جان ہے۔

ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ جب اس نے فارسی آواز سن کر اس کا رگڑا اپنے سر کی جانب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نشتے میں دھت تھا اور خود اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ولیم اسٹریٹ پر کیا کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریلوے کیوں موجود تھا۔ یقیناً کسی نے اسے ریلوے پر دیا ہوگا۔ بہر حال وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ اس نے ہو دارڈ کو قتل نہیں کیا تھا۔

وہ ایک خوب رو آدمی تھا۔ اس کی بیوی ایک نوجوان اور دلکش خاتون تھی لیکن اس واقعے نے اس کی ساری دلکشی چھین لی تھی اور اس کی حالت کسی زندہ لاش سے مختلف نظر نہیں آتی تھی۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ اپنے وکیل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ عدالت کے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ سرکاری وکیل ریٹک لمی تاک اور چوہے جیسی آنکھوں کا مالک دیکھتا شخص تھا۔ اس نے ملزم جارج کے بیان کی دھجیاں اڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جارج اپنے بیان پر کئی سے ڈارہا تھی کہ ایک بے حد اہم گواہ کو توڑنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ گواہ ایک عورت تھی۔ اس کا نام مسز بیٹرن تھا۔ وہ عدالت کی جانب سے پیش کی گئی تھی لیکن ریٹک جیسے شاطر

وکیل کی جرح کے آگے ٹھہر نہ سکی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی کی گواہ ہے۔ اس کا بیان خاصا واضح تھا تاہم اس گواہ پر محنت کی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بیان کے مطابق وہ اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھی، اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا تمہارا شوہر ملزم کا دوست ہے؟“ ریٹک نے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا پھر دوبارہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے دو آدمیوں کو اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گولیوں کے چلنے سے ڈرا پہلے کا ڈر ہے۔ اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے سنا تھا۔ ان میں سے ایک خوب زور زور سے اپنا بازو دھرا رہا تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی اور ان دونوں میں کوئی بھی ملزم جارج نہیں تھا۔ دونوں اس کے مقابلے میں خوب خچم خچم تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ ان میں سے ایک شخص مقتول ہو دارڈ تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ رات اندھیری تھی لیکن چونکہ اسٹریٹ اس کے گھر کے قریب ہی واقع ہے اس لیے اس نے انہیں واضح طور پر دیکھا تھا اور ان کی آواز میں بھی سنی تھی۔ ان میں سے کسی کی بھی آواز جارج کے جیسی تھی تھی اور جب ریٹک نے اپنے بعد ازاں کے دو گواہوں کے اور مسز بیٹرن کے بیان کے پرچے اڑا دیے۔ اس نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ مسز بیٹرن اونچا سنی ہیں حالانکہ وکیل صفائی ہو رہا تھا۔ اس کے جواب کے دوران وہ شیک تھی۔ دراصل وہ بلند آواز میں سوال و جواب کرتا رہا تھا لہذا کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ مسز بیٹرن اونچا سنی ہیں اور پھر وہ جانتی تھی کہ ہو رہا کون سا سوال کرنے والا ہے لیکن ریٹک نے اتنی سفاکی سے جرح کی کہ اس کی سنی گم ہو گئی۔ ریٹک نے قہقراہٹ بولنا شروع کر دیا لہذا مسز بیٹرن کو اس کے ہر سوال پر اپنا ہاتھ کان تک لے جا کر پوچھنا پڑا۔ ”کیا..... کیسے؟“

ریٹک نے سب سے پہلے اسے یہ اقرار کرنے پر مجبور کر دیا کہ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وکیل صفائی ہو رہا تھا اس نے اس سے قبل بڑی صفائی سے اس سے یہ سوال کرنے سے خود کو روک دیا تھا لیکن ریٹک اس کمزور پہلو کو تڑپا تھا لہذا اس نے وہیں ضرب لگائی اور بالآخر مسز بیٹرن کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ممکن ہے وہ سب اس کا وہم ہو۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس نے جن دو افراد کی آواز سنی

تھیں، ان میں سے ایک کی آواز، ملزم جارج کی تھی یا نہیں اور یہ کہ اس نے جس شخص کو ہووارڈ سمجھا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔ ریکٹ جو کچھ ثابت کرنا چاہ رہا تھا، اس کا۔۔۔ بہ آسانی تصور کیا جاسکتا تھا۔ مزیٹر نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی حالانکہ اس کا مکان جانے واردات سے چوتھائی بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ریکٹ اس کے ہر جواب پر غارتخانہ انداز سے ہماری طرف دیکھنے لگتا اور مزیٹر اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ روہاںسی ہوئی تھی۔

وکیل صفائی ہو رہی تھی اس کے قریب پہنچا اور اس نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کے اونچا سننے کا یہ جواز پیش کیا کہ اس وقت بڑے کا شکار ہے جس سے اس کی سماعت متاثر ہوئی ہے لیکن واردات کی رات وہ بالکل واضح طور پر سننے کے قائل تھی۔ اس کی اس دلیل پر جج بھی مسکرائے بغیر اندرہ سکا۔ دوسرا اہم ترین گواہ ایک دربان تھا۔ اس نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور بس۔ وہ شخص اسے فائرنگ کے چند ہی لمحوں کے بعد جانے واردات سے کچھ فاصلے پر بھاگتا ہوا نظر آیا تھا لہذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہی قاتل ہے۔ یہاں تک تو یہ بات درست تھی لیکن پھر جانے واردات پر یو ایو بدست جارج کی موجودگی کا کیا تاثر تھا جس کے بارے میں جج نے حتمی فیصلہ کیا۔

☆☆☆

ان تمام کمزور پہلوؤں کے باوجود وکیل صفائی کے پاس حکم کا اگلا تھا جسے مات و نثار ریکٹ کے بس کی بات نہیں تھی۔ دورانِ تفتیش یہ بات سامنے آئی کہ مقتول کے پاس اپنی بیوی کی ایک بھی سی تصویر ہوا کرتی تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اس کی تصدیق کی تھی اور ایک نے عدالت کو حلفیہ بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا تھا کہ وہ تصویر تو عدالت کے شب بھی اس کے پاس تھی اور اس نے اپنے دوست کے ہاں سے اپنے گھر روانہ ہوتے وقت وہ تصویر اسے دکھائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ گھر چھپنے کے بجائے عالم بالا پہنچ گیا تھا۔ وہ تصویر غائب تھی اور جارج کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے واردات کے آس پاس نہیں پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ ایک خوب صورت نکتہ تھا اور کی سمت اشارے کرتا تھا۔ جج تو یہ ہے کہ اس پورے کیس میں یہی واحد روحانی نکتہ تھا اور اخبارات اسے لے اڑے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے اس نکتے کو اچھا لٹا شروع کر دیا تھا اور ہر

اخبار اپنے ہر ایڈیشن میں اس تصویر کو شائع کرنے لگا تھا۔ جیوری کے ہر رکن نے وہ تصویر دیکھی تھی اور جان گئے کہ مقتول کی بیوی کیے نقش و نگار کی عورت تھی۔ وکیل صفائی ہو رہی تھی اسے اپنا زور بیان اس گم شدہ تصویر پر صرف کر دیا تھا لیکن سرکاری وکیل ریکٹ نے اس نکتے کو یوں مسترد کر دیا گویا اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

میرے خیال میں ہر شخص کو یقین تھا کہ ملزم جارج قاتل ہے اور شاید ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس قاتل کے پیچھے کوئی ایسا راز پوشیدہ ہے جس کی کڑی ملزم جارج اور مقتول کی بیوی سے یا مقتول اور ملزم جارج کی بیوی سے جانے کی۔

وکیل صفائی شروع ہی سے ایک راگ الا پتا چلا رہا تھا اور اس کی یہ راگ جیوری کو قطعی متاثر نہیں کر رہی تھی لیکن اس کے پاس کہنے کو بھلا اور تھا ہی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا۔ آخر میں اس کے پاس ایک ہی چیز رہ گئی تھی اور وہ تھی بیان۔ وہ جانتا تھا کہ جارج کو بری کروانے کے لیے اب صرف ایک بہت ہی وعاں قسم کے بیان کی ضرورت تھی اور وقت آنے پر اس نے وہ بیان دیا بھی۔

شکل و صورت اور طرز سے وہ کوئی فلم کی طرح لگتا تھا۔ عدالت کے طرز سے میں سمجھتا تھا کہ اس نے اپنی ریت تھی۔ وہ بے شک ایک اچھا مقرر تھا۔ اس نے بے شمار کیس جیتے تھے اور اگر اس نے جارج کا کیس ہاتھ میں لیا ہوتا تو نوبت یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔ میں چونکہ شروع ہی سے اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ تھا اور اس کے بیان کے میں اپنی ایک رائے قائم کر چکا تھا لہذا اس کے بیان کے صرف وہ حصے جو سننے کے قابل تھے۔ دونوں دیکھا کی نوک جھونک خاصی دلچسپ تھی۔ اس کے بعض فقروں پر عدالت کا کمر اتھرتا تھا۔ پتہ قاتل ریکٹ ایک جینا جانتا نکتہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت طنز آمیز تاثرات بکھرے رہتے تھے اور وہ طنز کے تیر چلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایک موقع پر ہو رہی تھی پولیس مین دینی کے بیان کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے جانے واردات کی منظر کشی کر رہا تھا اور عدالت کو بتا رہا تھا کہ جب گولی چلی تو جرم جارج لاش سے کتنے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس وقت چاند کی کیا پوزیشن تھی وغیرہ وغیرہ۔ اسے میں ریکٹ نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سمجھ کر تبصرہ کیا۔

”مسٹر ہوورس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے چاند کو بطور گواہ طلب نہ کر کے فاش غلطی کی ہے۔“ اس کے اس تبصرے پر عدالت کا کمر ازعفران زار بن گیا۔ اس کے جواب میں ہوورس نے کہا۔ ”اگر چاند کو بطور گواہ طلب کیا جاسکتا تو وہی کو طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔“

اس کی اس بات پر کوئی نہیں ہنسا۔ اس کے بعد ہوورس نے ریکٹ کو آڑے ہاتھوں لیا اور مدعا علیہ کے حمایتی چیلنے اور قبضہ لگانے لگے۔ ریکٹ ہم میں سے کسی کی بھی نگاہ میں پسندیدہ نہیں تھا لیکن اسے ملزم کو مزائے موت دلوانے کا قانونی حق حاصل تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہوورس جیوری روم میں مقبول تھا۔ لیکن وہ ریکٹ کے مقابلے میں پسندیدہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ایک کیس ہار رہا تھا لیکن اس کے باوجود جج کرلڑ رہا تھا۔ بھی بھی دونوں دکھلاؤ پڑتے اور جج کو انہیں تنبیہ کرنی پڑتی۔

☆☆☆

سارے گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد وکلاء کے دلائل کا آغاز ہو گیا۔ ریکٹ کا بیان ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔ اخبارات نے اس کا نام جلاور کیا تھا کیونکہ وہ اس کیس میں صرف ہماری کا طلب گار تھا۔ اس نے بہت سے دلائل دیے جن میں کچھ تو اس کے آدھے دلائل کے خلاف تھے۔ اسے غور طلب نکتہ یہ تھا کہ اب تک قتل کے محرک کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ گواہان کے بیانات سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی لیکن قتل کا محرک تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ دینی کی گواہی کے بعد کیس مکمل ہو گیا تھا۔ ملزم جارج کسی بھی وجہ سے ہووارڈ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور یہی بات سب سے اہم تھی۔ اس نے ایک انسانی جان لی تھی لہذا قانون اس کے بدلے اس کی جان لینی چاہیے تھی۔

ہوورس نے اپنے بیان میں پہلے تو اس کیس کے دوران ریکٹ کے رویے کی شکایت کی اور پھر ملزم جارج کو حالات کا شکار قرار دیتے ہوئے اس کی شرافت، تنک نامی اور سادہ لوحی کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس شخص نے اپنی حماقت سے ضرورت سے زیادہ نی کر خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کر لیا ہے۔ اس کی تقریر خاصی متاثر کن تھی اور اس نے جس طرح وہ واقعہ بیان کیا، اس سے اس منظر کی تصویر سی نگاہوں کے سامنے چل گئی تھی۔ ملزم جارج نقشے میں دھت تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کس سمت جا رہا

مہلت

لڑکا۔ ”آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں۔ میں اسے سوئے میں تول دوں گا۔“ باپ۔ ”مجھے کدھن کی مہلت دے دو۔“ لڑکا۔ ”شادی کی تیاری کرنی ہے کیا؟ ویسے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

باپ۔ ”دراصل میں نے بیٹی کو ڈانٹنے سے منع کرنا ہے تاکہ اس کا کچھ وزن بڑھ جائے۔“

ایک گھنٹا

ایک اسٹیشن سے ایک بڑی مونچھوں والے خان صاحب گاڑی میں سوار ہوئے اور سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مسلسل اپنی دائیں مونچھ کو مروڑتے رہے۔ جب وہ اپنی منزل پر اترنے لگے تو ایک مسافر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب آپ کی بائیں مونچھ ایک گھنٹا پیچھے ہے۔“

جرمانہ

چلی گاڑی میں بھی ایک خاتون نے ڈیڑھ گھنٹہ کی گاڑی میں سوار ہوئے اور سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مسلسل اپنی دائیں مونچھ کو مروڑتے رہے۔ جب وہ اپنی منزل پر اترنے لگے تو ایک مسافر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب آپ کی بائیں مونچھ ایک گھنٹا پیچھے ہے۔“

خاتون بولی۔

نی نے نی سے کہا۔ ”گاڑی کے کمرانے کا کوئی امکان نہیں انشا اللہ۔ آپ ڈیڑھ گھنٹے کا سوراخ بھرا کر ادا کریں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

عجیب وغریب معاشی!

اتھارویں صدی کے وسط میں جو جوہور راج کھرانے کی سابقہ ملکہ، مہارانی کور بائی اپنے زمانے کی ایک عجیب و غریب خاتون تھیں۔ ہر روز ان کے غسل کے لیے 150 سیر تازے گلاب کا عرق نکال کر رکھا جاتا تھا۔ پھر کینڑیں ان کو اس عرق گلاب سے تقریباً دو گھنٹے تک نہلاتی تھیں۔ پھر ایک دن کسی نے کہا کہ اگر آپ پتھر کے خون سے نہائیں تو اور نکھار پیدا ہوگا۔ بس پتھر کی جگہ میں روز پتھر کھینچنے لگے اور وہ پتھر کے خون سے نہا کر سکون پاتی رہی۔

مرسلہ۔ دلدار حسین، حمید رانا یاد

ہے۔ ایسے میں گولیاں چلیں اور وہ مقتول کے پاس جا کر ہوا۔ قاتل کا ریوالتور لاش کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور وہی نے موقع واردات پر پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جبکہ اصل قاتل اپنی جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔ ایک دربان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا بھی لیکن اس اندھے کو اس کی شکل نظر نہیں آئی۔

ہورس کے بیان کی روشنی میں ہم نے بے شک اس دربان کی گواہی اور مسز ہورس کے بیان کو مد نظر رکھا تھا، جس کا بیشتر حصہ تہمتوں کی بنیاد پر لکھا تھا لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا کہ مسز ہورس نے حقیقتاً آواز سن لی تھی۔ دو پراسرار افراد آپس میں لڑتے ہوئے گزر رہے تھے اور ان کی آوازیں خاصی بلند تھیں پھر ہورس نے اس تصویر کا حوالہ دیا جو بے حد اہم تھی اور جس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ وہ تصویر ملزم جارج کو بے گناہ قرار دیتی تھی۔ تصویر مقتول کے پاس سے یا پھر جارج کے پاس سے برآمد ہوئی جابجائی تھی کیونکہ جارج کو اسے بھیجئے یا چھپانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ہورس کا بیان بلاشبہ ایک عمدہ بیان تھا۔

اس نے جارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس کی بے داغ زندگی اور اس کے معزز دوستوں کا حوالہ دیا۔ ساتھ میں یہ کہہ کر ایک ایسا شخص جس نے کبھی ریوالتور کو ہاتھ نہ لگا دیا ہو، ہمیں کسی کاروبار اور دھوکے پر مت متاثر ہونے چاہیے۔ اس نے قتل کر سکتا ہے جسے اس نے زندگی میں نہ بھی دیکھا تھا اور نہ ہی جس کے بارے میں سنا تھا۔ ہورس کے دلائل سن کر ہر شخص اش اش کراٹھا لیکن ریکٹ نے اپنے آخری بیان میں اس کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ لاکھ قیاس آرائیاں کریں، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ملزم جارج ریوالتور بدست لاش کے قریب کھڑا تھا اور ریوالتور سے گولیاں چلی تھیں اور جہاں تک نشتے میں ہوئے کا تعلق ہے تو یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں، دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔“

انتا کہہ کر اس نے ہونٹوں کے ایک گوشے کو مخصوص انداز میں خم دیتے ہوئے مزید کہا۔ ”اگر چیوری یہ سمجھتی ہے کہ وہ ہوش سفاکانہ قتل کا جواز بن سکتی ہے تو ملزم کو بری کر دے تاکہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو اور لوگ شراب پی کر بے گناہ ہوں کو قتل کرنے نکل کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی جانوں کو شرابی و درندوں

سے، خواہ وہ کتنے ہی بیک نام اور معزز کیوں نہ ہوں محفوظ رکھنا ہی ہمارا فرض ہے تو خصوصی طور پر ملزم جارج کو سزا دے کر ایک اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔“

ریکٹ کا بیان اگرچہ ہورس کے بیان سے زیادہ متاثر کن نہیں تھا لیکن اس سے بہت زیادہ مدلل اور قائل کرنے والا تھا اور جہاں تک چیوری کا تعلق تھا، تو وہ بہت پہلے ہی جارج کے لیے سزائے موت جو جرح پر چکی تھی۔ سب سے آخر میں جج نے۔۔۔ دونوں دکھاء کے دلائل کی روشنی میں جو کچھ اخذ کیا تھا، بڑھ کر سنا شروع کیا۔ اس کا بیان۔۔۔ بحیثیت مجموعی سرکاری وکیل کی جانب داری کر رہا تھا جو غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس نے آخر میں ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں ملزم جارج کے جرم پر شک ہے تو ہم پر منحصر ہے کہ اسے سزائے موت دیں یا بری کر دیں۔ اس کے اس بیان کے بعد ہم سب اٹھ کر چیوری روم میں چلے گئے اور مقدمے کی اس کارروائی کی روشنی میں فیصلے پر بحث مباحثے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ڈین نامی ایک انتہائی تنگ نظر اور آدم بیزار شخص چیوری کا سربراہ تھا۔ وہ شروع ہی سے خود کو اتنی اہمیت دیتا آ رہا تھا گویا اسے ڈین کی وزارت مل گئی ہو۔ وہ اس سے پہلے بھی چیوری کی زندگی میں ان کا نام نہ لے سکتا تھا لیکن سرکاری کام یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ سارے پراسرار و مرموز سے بخوبی واقف تھا۔ سارے کے سارے گیارہ ارکان چیوری متفقہ طور پر جارج کو سزا دے کر دینے کے حامی تھے اور صرف ایک رکن ایسا تھا جو اسے بری کروانے کے حق میں تھا۔ یہ انکشاف قریب انداز کے ذریعے ہوا تھا۔ میں اس واحد رکن کو جانتا تھا لہذا ہائی گیارہ ارکان کو شش و پنج میں مبتلا رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

”دوستو! وہ رکن میں ہوں۔“ میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے قائل کرو۔“

میرا یہ جملہ کسی ہم کے گولے کی طرح ان کے سروں پر پھٹا۔ انہیں اس گولے کی توقع نہیں تھی۔ خاص طور سے ہمارا سربراہ ڈین تو ایسا بولکھلایا کہ مجھ سے اس طرح لڑنے لگا گویا یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو۔ اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے سے قاصر تھا کہ میں ان کے متفقہ فیصلے کی مخالفت بھی کر سکتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہم فوراً اس کے فیصلے کی تائید کر دیں گے اور وہ اسی وقت جج کو اس فیصلے سے آگاہ کرے گا اس کا سر اپنے سر باندھ لے گا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو وہ

جھلا اٹھا۔ پہلے پہل بقیہ ارکان کو میری یہ مخالفت محکمہ خیر تھا۔ وہ یہ جانتا چاہتے تھے کہ میں ملزم جارج کو بے گناہ کیوں تصور کر رہا ہوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ ہماری شہادتیں اس کے خلاف ہیں اور اسے مجرم ثابت کرتی ہیں۔ انہیں اس سے ہمدردی و خردورسی لیکن جہاں تک بے گناہی کا تعلق تھا تو۔۔۔

”مسٹر رسل۔“ ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ایک بالکل عام سائیکس ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وکیل صفائی ہورس نے مقدمے کی بہت اچھی پیروی کی لیکن وہ اپنے موقف کی حمایت میں ایک بھی ٹھوس دلیل نہ دے سکا۔ میں غلط میں کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہوں۔ اگر مجھے اس کے جرم پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں دوسروں سے فیصلہ کو مسترد کر دیتا لیکن مجھے اس کیس میں شک کی اہلی سی پرچام بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ملزم جارج بے شک مجرم ہے، اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔“

”اسے پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ میں نے چپکری سے کہا۔ ”اس نے پی رگھی تھی اور شوخی قسمت کے موقع واردات پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ قاتل اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پھنسا کر فرار ہو گیا۔ میرا انداز تو یہی ہے اور ہورس کی بھی یہی خیال ہے کہ ملزم میں ایک بڑے جرائم کار اور دہشت گرد کے ہونے کے باعث اس نے لاش کے قریب پڑا ہوا پستول غیر ارادی طور پر اٹھالیا۔ عین اسی لمحے کشتی سپاہی وہی موقع واردات پر پہنچ گیا اور اس نے اسے ریوالتور سمیت گرفتار کر لیا۔ میرے خیال میں قاتل نے فرار ہوتے وقت پستول اس کے ہاتھ میں تھام دیا تھا اور چونکہ وہ مدہوش تھا، اس نے وہ پستول لے لیا۔ اس میں قاتل کی کوئی بات نہیں۔“

”جوائن۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اس نے یہ جرم ایک منصوبے کے تحت کیا تھا اور شراب اس لیے پی رگھی تھی کہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔“

”تمہارے خیال میں وہ مقتول ہووارڈ سے واقف تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بے شک۔“ ان سب نے بیکہ زبان ہو کر جواب دیا۔

”لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ریکٹ نے بھی یہی کہا تھا لیکن وہ کوئی ثبوت نہ پیش کر سکا۔“

”اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“ ڈین نے لب لولہ ”میں کے مطالعے سے یہ بات از خود عیاں

ہو رہی ہے، اگر وہ مقتول سے واقف نہ ہوتا تو اسے کوئی کیوں مارتا؟“

”وکیل صفائی بھی یہی جانتا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور چونکہ وہ اس سے واقف نہیں تھا لہذا اس نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ اور اس کم شدہ تصویر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ایسی کوئی تصویر مقتول کے پاس نہیں تھی۔“ ڈین سرے سے منحرف ہو گیا۔ ”ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جس شخص نے یہ گواہی دی تھی، وہ جھوٹ بول رہا تھا۔“

”تمہاری نانی اماں کا سر۔“ میں نے پھر کر کہا۔ ”اس شخص نے ہووارڈ کے قتل ہونے سے صرف ایک گھنٹا قبل وہ تصویر اس کے پاس دیکھی تھی۔ اگر اس تصویر کا سراغ لگ جاتا تو ہمیں ایسی بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا جن کا ہمیں علم نہیں ہے اور جارج کے سر پر تلوار نہ لگ رہی ہوتی۔ آپ حضرات محض اس وجہ سے ملزم کے خلاف ہیں کیونکہ اس نے شراب پی رگھی تھی۔ میں اس کے لیے آپ لوگوں کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ چونکہ اس نے شراب پی رگھی تھی لہذا قاتل بھی اسی نے کیا ہے۔“

”اس پر جھوٹ ہے کہ ہم کسی خاص وجہ سے اسے ملزم کے خلاف ہیں۔“ ڈین نے جواب دیا۔ ”میں اس کے خیال میں یہ فرض کرنے کی ایک اچھی وجہ ہے۔“

یہ بحث پونہ پچاس رگی رہی اور دس روز گزر گئے لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے ایک دو شہادتیں کھانگیں لیکن گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے گئے۔ جرم میرے ہر شخص جارج کو مجرم تصور کر رہا تھا اور ان میں سے بعض ایسے چالاک کی جھڑپوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جارج اور میرے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ میں انہیں زہر لگنے لگا تھا۔ میری باتیں انہیں زہر لگتی تھیں۔ بہت ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ مجھے رشوت دی گئی ہے جہی میں نے معاملے کو اب تک لٹکا رکھا ہے۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگ گھر سے دور تھے اور ان کے اہل خانہ ان کی واپسی کے منتظر تھے جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں کتوارا تھا اور گھر پر میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ مجھے جارج کی گردن بھانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس دوران جج کا گہ بگاہے اپنے

پیش کار کو ہمارے پاس بھیجا رہتا تھا کہ ہماری پیش رت سے آگاہ ہو سکے اور یہ جان سکے کہ ہم کسی فیصلے پر پہنچ سکے ہیں یا نہیں۔ بار بار مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ جگہ آ کر جنوری کو برخاست نہ کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ بھی اس صورت حال سے محفوظ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جلد یا بدیر میں ہتھیار پھینک دوں گا۔

مگر گرج نے جیوری کو برخاست کر دیا تو اس کا یہ مصلحت
کہ جارج برو بارہ مقدمہ چلایا جانے کا ارادہ
تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ ہرگز نہیں جیت سکے گا۔ میں
مصلحت پر کافی غور و خوض کیا۔ اب میرے سامنے
ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ منتر کے بعد میں نے
مخاطب کیا۔

پہلے وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ میں کیا بیان کر رہا ہوں لیکن جب دو ایک دوسرے کا منہ کھلتے لگے تھے۔

”میرا حال.....!“ میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”آپ یہ سب کچھ فرض کریں تو باقی معاملہ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ دنیا میں طرح طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت کی عدم موجودگی میں ہووارڈ اس لڑکی کو کوششے میں اتارتا شروع کرتا ہے۔ وہ اسمتھ کے خلاف لڑکی کے کان بھرتا ہے۔ اسے اس کے متعلق عجیب کہانیاں سناتا ہے۔ لڑکی کا باپ اس کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکی اسمتھ کے خطوط کا جواب دینا چھوڑ دیتی ہے پھر ایک دن اسمتھ کو اس کا ایک خط موصول ہوتا ہے جسے پڑھ کر اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے شہر سے آنے ہوتے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اور وہ واپس جا کر اپنی محبوبہ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جبکہ اس کی محبوبہ نے لکھا تھا کہ وہ ہووارڈ سے شادی کر رہی ہے لیکن آپ اس کے لیے لڑکی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہووارڈ جھوٹا، مکار اور خشن طرز از تھا۔ اس نے لڑکی کو اسمتھ سے بدظن کروایا تھا اور اسمتھ اس کی باتوں کو جاننے نہ سکے۔ اس لیے وہ ان سے دور ہو گئی تھی۔ اس پر غریب و بختیاری میں کسی نہ ہووارڈ کے کسی کسی ہاتھ میں اس سے منسوب کر کے لڑکی کو سزا دی تھیں اور اس نے اسے اس سے چینیں لان لیا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے قطعاً ناواقف تھا لہذا وہ سخت حواس باختہ ہو گیا لیکن وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ لڑکی نے اس سے بے وفائی کی اور نہیں۔ ہو سکتا ہے اس واقعے نے اس کا دل تلخ کر دیا ہو۔ مردوں کے دل اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ ہاں انہیں وہی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہووارڈ کو شراب سے پابند کرتا آتا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ یہ عام سی ناپسندیدگی تھی جو مردوں میں ایک دوسرے کے لیے پائی جاتی ہے۔ میرا حال اسمتھ جہاں تھا، وہیں رہا۔ چند دنوں کے بعد اسے اپنی محبوبہ کی شادی کی خبر موصول ہوئی اور عشق کا وہ باب یوں ختم ہو گیا۔ کم از کم اسمتھ نے اپنے سین بھی سمجھا اور ممکن ہے ہووارڈ نے بھی یہی سمجھا ہو.....“

وہ سب اپنی جگہ خاموش تھے۔ شاید انہیں کچھ کچھ گزارشہ ہونے لگا تھا لیکن ڈین آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے لگا۔

Lea

دعا پر اعتقاد ہی نیکی ہے، جب ہم تنہائی اور خاموشی میں دعا مانگیں تو ہم اس شخص کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تنہائی میں ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی سمیٹتا ہے۔ دعا میں خلوص آنکھوں کو غم خیز نہادیتا ہے۔ یہی آنسو دعا کی منظوری کی دلیل ہیں۔

لفظوں سے خوشبو آئے

میرا مشاہدہ ہے کہ لوگ ترقی کرنے کے لیے دو مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی ٹانگ کھینچتے ہیں اور انہیں پیچھے دھکیل کر خود آگے ہونا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً ناکام رہتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی سعی کرتے ہیں وہ عموماً نہیں بلکہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

”بہت خوب۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”میں تمہارے محفل کی داود تاجا ہوں۔ تم اس پر ایک اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن جارج کا اس کہانی سے کیا حلق؟“

”مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو۔“ میں نے کہا۔

اسمیتھ کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ یہی اسمیتھ کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اس کی شہر میں ہے۔“

وہ سب ہمیں تن گوش تھے کیونکہ اب ان پر حقیقت واضح ہوتی جا رہی تھی کہ میں اسمیتھ سے اور اس کی داستان حیات سے واقف ہوں اور میں نے ٹک واقف تھا۔ تاہم ان میں سے ایک نے فقرہ چست کیا۔ ”معلوم ہوتا ہے، مگر اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے ہوگا۔“

ڈن غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور اب مجھ سے ایک سوال پوچھتا جا رہا تھا۔ ”یہ اسمتھ کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیا جارج ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسمیتھ وہ شخص ہے جسے دربان نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جارج کو پھانسی کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ عین موت پر جانے والی حالت کے پاس سے نفیس ہے جو درگمگنا ہوا گزرا تو یہ دیکھنے کے لیے رگ گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اسمتھ جو اپنی اس حد درجہ عقلمندی پر انتہائی دہشت زدہ تھا اور موقع واردات سے فرار ہونا چاہتا تھا اپنی مجبوری کی وہ نفیس سی تصویر اٹھا کر اور مقتول کارپورالور جارج کو تھما کر بھاگ گیا۔ اس نے اتنی چڑھا رکھی تھی کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جرم کی مہمت سے انکار کر دیا لیکن اس وقت تک اس کے پیروں کے نیچے سے ہلکا سا ٹکڑا پھوٹ گیا۔“

کرتے تھے سوائے میرے.....
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اسمتھ کا کیا ہے
 گا؟ کیا وہ باارج کی جگہ لے لے گا؟ تم لوگوں کو اس کے
 بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے کیا تم لوگ اسے ہوا ورڈ
 کے قتل کے الزام میں تھیں؟ دارر لکا دو گے؟ واضح رہے کہ
 میں نے جو کچھ کہا، سچ ہے اور ہارج کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس
 وقت تم لوگ اسمتھ کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہو۔ تم اسے
 سزائے موت دو گے یا رہا کر دو گے؟ اگر تم نے عدالت کو
 اسمتھ کے بارے میں بتا دیا تو دوسری جیوری اس معاملے کو
 اس طرح نہیں دیکھے گی جس طرح تم لوگوں نے سمجھا ہے۔ تم
 لوگوں پر حقیقت منکشف ہوئی ہے۔ کہو، کیا کہتے ہو؟“
 ”ہمارا سہرا کر دوں گے۔“ ایک نے کہا۔

محفل شہر و سخن

✽ جبران احمد ملک..... کلشن اقبال، کراچی

کسی نے پھر ہمیں تسخیر کر لیا آخر
کوئی مثال تو آئی تری مثال کے بعد

✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ

موسم جبر میں یہ بارش کا برسا کیسا؟
اک صحرا سے سندھ کا گزرتا کیسا؟
اے میرے دل نہ پریشان ہو تنہا ہو کر
وہ تیرے ساتھ چلا کب تھا چھڑتا کیسا؟

✽ کمال انور..... کراچی

اس کے بعد اور بھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا

✽ زخمی کرشن..... جبر کوٹ

ہوئے کشمکش کا طائر وہ ہے شاخ سے
جس پر وہ چڑھا تو گم ہو گیا وہ

✽ احسان بھر..... میانوالی

تک آچکے ہیں اب تو فریب نظر سے ہم
گھبرا گئے ہیں اپنے ہی دیوار و در سے ہم

✽ قہر انوان..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

نہ میرے قلم سے کہی گئی نہ میری زبان سے ادا ہوئی
جو آنکھ سے کہنے کی بات تھی وہ حرف میں نہ سائے گی
کوئی پھول چٹا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے ہمیں زندگی ہی بتائے گی

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور

لاکھ خاموش رہیں ضبط کے خوگر ہو کر
آنسوؤں سے بھی تو کچھ راز عیاں ہوتا ہے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

جانے کیا مجھ سے زمانہ چاہتا ہے
میرا دل توڑ کر بھی مجھے ہنساتا چاہتا ہے
جاننے کیا بات جھلکتی ہے میرے چہرے پر
ہر شخص مجھے ہی آزماتا چاہتا ہے



✽ تفسیر عباس باہر..... اوکاڑہ

مٹ خیاں و خواب تھیں وصل کی وہ راحتیں
مقدم میں پھر ہجر کا زندان اس نے لکھ دیا
پس و پیش سا درپیش تھا بوقت رخصت یوں ہوا
قرع اس کذب و دریا پہ اک پیمان اس نے لکھ دیا

✽ سعدیہ بخاری..... ضلع انک

اب کسی بات پہ کیا اس سے خفا ہوتا ہے
زندگی بھر کے لیے جس سے جدا ہوتا ہے
تم سے چھڑے ہیں تو اب سینے کی عمریوں میں
کون دیکھے گا جو اک حشر پچا ہوتا ہے

✽ مہرین ناز..... حیدرآباد

جو ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا
اس شخص کے لوٹ آنے کا امکان سائیکوں ہے
مٹی کا بنا ہے تو مکمل کیوں نہیں جاتا
پتھر کا اگر ہے تو پھر انسان سائیکوں ہے

✽ راجہ افتخار علی..... چچا سدن شاہ (موہڑہ)

کبھی سجدے بھی آنسو ہزاروں کوششیں لگیں
جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے نہیں ملتا

✽ عمران علی..... سرگودھا

کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے
سچی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

✽ شائد حسن..... لاہور

خیر زیست میں چلتے چلتے
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
بے تحاشا محبت کرنے والے
بے وجہ چھوڑ جاتے ہیں

✽ محمد آصف شہزادہ..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

اب تیرے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایہ امیر کی مانند گزرتا جاؤں گا

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانہوال

بلا کا تضاد ہے تیرے حسن و ظہن میں
نرم ہونٹوں سے بہت سخت بولتے ہو

✽ ایم رشید سیال..... روہڑی، سکھر

لہجہ ایسا کہ مطمئن کر دے!
کتنے سچے ہیں اس کے جھوٹ!

✽ غالب حسین طلحہ..... نیو سنٹرل جیل ملتان

شام غم انکی بلا خیر نہ دیکھی تھی کبھی
آسمان پر نہ رہا کوئی بھی تارا باقی
اب کہیں جتنی نہیں محفل ارباب چہن
میں ہی رہ گیا اس بزم میں غما باقی

✽ احمد علی صدیقی..... نیو سنٹرل جیل ملتان

ہم اپنے رزم دکھاتے کے زمانے میں
کسی نے قصہ غم شوق سے سنا ہی نہیں
لے جو اشک تو ہم بی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں کبھی ہوا ہی نہیں

✽ سید اکبر شاہ..... منہرہ

خاک نکلی آرزو اگر نکلی
ہر سستی اپنی بے اثر نکلی
بر کوئی باخبر ہے دوراں سے
عقل اپنی ہی بے خبر نکلی

✽ ناصر علی صدیقی..... رحیم یار خان

بہت سکون سے سو میرے بن
جیسے ابھرن کوئی سلیم بن ہو
✽ عبدالغفور خان ماسٹر، گلستان جوہر، کراچی

بہت پختہ مزاج ہے وہ شخص
اسے یاد ہے کہ مجھے یاد نہیں کرتا

✽ زوہب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

اس طرح لیے پھرتے ہیں تیری محبت کو ہم
ٹوٹا ہوا بازو جیسے سینے سے لگا ہو

✽ عرفان احمد عاجز..... چچا سدن شاہ

بنا کے گردش دوراں کو زندگی ہم نے
یہ بار زیست اٹھایا فنی خوشی ہم نے
اٹھا کے تاز ترے صبح و شام جان کلیم
بڑھا دیا ترا انداز دلبری ہم نے

✽ ریاض بٹ..... حسن ایدال

تم مکانوں میں ہو مقید تمہیں کیا معلوم
دل میں اخلاص و محبت ہو تو گھر بنتے ہیں

✽ امجد ہرل..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

پھر کے تجھ سے نہ دیکھے گئے وصال کے موسم
کسی کو ملتے ہوئے دیکھا تو دھانپ لیں آنکھیں



شکنبہ

سکیم انور

کھا کھا کر گوشت کا پہاڑ بننا اور پھر فاقے کر کر کے رفتہ رفتہ اس پہاڑ کو گھٹانا پر زمانے کا قبضہ نہ رہا۔ شاید وہ بھی اس اذیت کا شکار تھا کہ ایک روز اس کے ہاتھ ایسا گر لگا کہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ سب تو زندگی کے جھمیلے ہیں مگر وہ کیوں ڈھیر نہ دھیرے موت کے قریب پوتا جا رہا تھا۔

فاتح کی فکر میں گئے والوں کی عجیب منتقلی کا اظہار

جس روز میری ملاقات ویڈی ہائیکر سے ہوئی، میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔ رٹو کارٹن ہوں گے بار کا باجول نہایت پرسکون تھا اور ہر شے سے نفاست چک رہی تھی۔ میری پوری زندگی بلوئیں شہر میں گزری تھی لیکن مجھے بھی رٹو کارٹن میں جانے کی تمنا نہیں ہوئی تھی۔ باہر سڑک پر لوگ جولائی کی آلود فضا سے بچنے کے لیے تیز قدموں سے ادھر سے ادھر جا رہے تھے اور پبلک گارڈنز کی جانب رواں ٹریفک دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ لیکن رٹو کارٹن کے بار کی فضا میں مدھم سرگوشیوں اور ہرف کے ڈالوں کی شن شن کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں کھڑکی کی جانب سے

سیدھی الدین اشفاق..... فتح پور، لیہ
علم کا سودہ، یہ رسالے یہ کتابیں
ایک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے
کائنات مریم، عائشہ ثانی..... حیدر آباد
ہم تو مٹی سے اکائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو، ستارے جاؤ
احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف بائی پاس
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے
ہارون بھروس..... مردان
ذرا سی بھول پر جنت سے نکلا
میں بھکا کب تھا بھکایا گیا ہوں
رائہ..... کورنگی
کس منہ سے جاؤ گے خدا کے رو بہ محشر میں تم
عمر ساری عشق بیتاں میں اب گزر جانے کے بعد
نعیم الحسن شاہ..... اسلام آباد
رہے بھی دل میں ہو، دکھاتے بھی دل ہی ہو
ایسا مقام..... اور ایسا کام..... دیکھو
رمضان پاشا..... نعیم الحسن شاہ کراچی
اس وطن کے واسطے دی جتنی قربانی نہ پوچھ
چشم گردوں کی فکر یہ فتنہ سامانی نہ پوچھ
ڈاکٹر محمد عصفہ عباس..... خوشاب
دل کے دروازے پہ پھر سے شہساز دستک
پھر وہی شخص نیا روپ لیے آیا ہے
شاز یہ کمال..... نارتھ کراچی، کراچی
سفر کا بوجھ ہے سر پر، لدے ہوئے زر سے
تھکے ہوئے مسافر، چلے تھے جو گھر سے
نورین عباس..... پشاور
اک ایسے عالم وارفتگی سے گزرا ہوں
جہاں سمیٹا خود کو تو میں بکھر جاتا

محفل شاعر و سخن

کوین

برائے

شمارہ

فروری

2015

لبہ لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



وہ فولڈر میں موجود کاغذات کو پڑھنے میں یوں مگن رہی جیسے میں نے کچھ پوچھا ہی نہ ہو۔ پھر اپنی ٹیکس دو بار تاک پر جھٹکتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔ ”میں یہاں تمہارا مسئلہ حل کرنے کے لیے موجود ہوں۔ ہماری ملاقات کہاں ہو رہی ہے، یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔“ اس نے سر ہچکے میں کہا۔

میں ہلکا سا گیا۔ اس لیے کہ میں توقع کر رہا تھا جو فری میری اس پریشانی کا حل نکالے گا، وہ ہمدردی کے جذبے سے معمور اور حساس طبیعت کا مالک ہوگا۔ شاید اٹھواڑھواڑھ لہجہ میرے مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھا، یہ سوچ کر میں چپ رہا۔

ساتھ ساتھ اپنا فولڈر بند کر دیا اور ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ پھر بولی۔ ”میرے خیال سے تمہارے لیے ایک سو پچاس پونڈ تک کا وزن کافی رہے گا۔“ میں مسکرا دیا۔ ”ایک سو پچاس پونڈ وزن زبردست رہے گا۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ میں کھانا دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔“

وہ اپنے فولڈر پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”مگر نے راجز اینڈ ڈسکن کے یہاں بطور اکاؤنٹنٹ چار سال تک کام کیا ہے۔ تمہاری آمدنی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ تمہاری بیوی سیدہ راہے بطور سیکریٹری کام کرتی ہیں۔ تم اور گزشتہ برس اس کی آمدنی بارہ ہزار ڈالرز تھی۔ تم دونوں کو بچوں کی خواہش ہے لیکن سیدہ تمہارے منہ پر اور وزن کے بارے میں فکر مند رہتی ہے اور اسے امید ہے کہ عارضی علیحدگی تمہیں اپنا وزن گھٹانے اور دبلا پتلا بننے پر مجبور کر دے گی۔“

یہ سن کر میرا منہ لٹک گیا۔ ”آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟“ ”میری بیٹی ہمارے تمام کلائنٹس پر مکمل ریسرچ کرتی ہے مگر ہم۔ میں ہر سیشن کی فیس تین سو ڈالرز لیتی ہوں اور نتائج کی ضمانت دیتی ہوں۔“

میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ ”آپ میرے معاملے میں کچھ زیادہ تیز جارہی ہیں۔“ میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”میں خود کو کسی بھی چیز کا پابند بنانے سے قائل یہ جانتا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا طریقہ کار کیا ہے؟“ ساتھ ساتھ اٹلیشن نے اپنا رخ میری طرف کیا، ایک دروازہ کھولی اور کاغذ کی ایک شیٹ نکالی۔ ”میرا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔ تمہارا جو جی چاہے کھانی سکتے ہو۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ”پلیز اس پر دستخط کر دو۔“

کے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کر سکتی ہے۔ اگر معاملہ ویڈی کی سفارش اور میرے عزم مصمم کا نہ ہوتا تو میں وہیں سے گھر واپس چلا جاتا۔

جو سیزنیاں اوپر جاری تھیں ان پر ناگوار بورچی ہوئی تھی۔ ہر طرف خالی بوٹیں اور کھانے پینے کی اشیاء کے پیرکھنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری منزل کے بیشتر دفاتر کے دروازے بند تھے اور ہر شے کی سطح گرد کی تھیں جی ہوئی تھیں۔

مجھے آگے کی جانب ایک دروازے پر پینٹل کی پلٹ دکھائی دی جس پر ساتھ ساتھ اٹلیشن کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے شیشے پر دستک دی۔ جب کسی نے جواب نہیں دیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔

کمرے کی دیواریں سیلرنگ کی گئیں اور ان پر کسی بھی تصویر نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھڑی کے پاس ایک موٹیل ماڈرن میز اور دو تنگ آلود فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

”ہیلو!“ میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اسے میں نے پتہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند سیکنڈ بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دفتر میں قدم رکھا۔ اس نے اپنے خاکستری بالوں کی شکل میں ہاتھ دھوئے تھے اور پیرے پر مولڈیشن کی ٹیک نمایاں لگی۔ وہ عورت دہلی تھی اور اس کا قد لاگتا تھا۔ اس کا لباس ڈارک لیوکلر کے اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز پر مشتمل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا فولڈر دیا ہوا تھا۔

”میں ساتھ ساتھ اٹلیشن ہوں۔“ اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور تم یقیناً جم ہیرس ہو اور ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“

پھر وہ فولڈنگ کرسیوں میں سے ایک پر براہمان ہو گئی اور اپنا اسکرٹ درست کرنے کے بعد مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے فولڈر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھول دیا۔

”آپ کا حوالہ ویڈی ہانچتے دیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی کامیابی کا ریٹ اٹھاؤں تو فیصد ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ جب میں نے یہ بلڈنگ دیکھی تو قدرے بے زار ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر اپنے مقصد کی خاطر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا آپ اپنے تمام کلائنٹس سے اسی جگہ پر ملاقات کرتی ہیں؟“

”میں اس وقت تک کوئی دستخط نہیں کروں گا جب تک اس بارے میں مزید نہ جان لوں کہ آپ کرتی کیا ہیں۔ مجھے تین سو ڈالر کے عوض کیا ملے گا؟“ میں نے اصرار کیا۔ ”ترغیب مسٹر جیم۔ اگر تم دستخط نہیں کرنا چاہتے تو پھر تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ میں نے کاغذ کی سمت اشارہ کیا۔ ”مجھے حقیقت میں کس بات کے لیے دستخط کرنا ہیں؟“

”یہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے تم اس بات کے پابند ہو گے کہ میری ہدایات کے مطابق یقینی عمل کرو گے اور اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ مزید یہ کہ تمہیں اقرار کرنا ہوگا کہ میرے طریقہ کار کو کسی پر آشکار نہیں کرو گے۔ کسی بھی قسم کے اخلاف کا مطلب خاتمہ ہے۔“ یہ کہہ کر سانٹھا اسٹیشن نے اپنی آنکھیں نیم دا کر لیں۔ ”تم یہاں سے رخصت ہونے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اپنی مدد کے لیے میری ضرورت ہے۔ کوئی بھی تمہیں وہ نتائج نہیں دے سکتا جو میں دوں گی۔“

میں نے معاہدے پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ اس پر درج دونوں ہی اگراف من و عنون تھے جو ابھی سانٹھا نے زبانی بتائے تھے۔ لیکن میں اب بھی دستخط کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ سانٹھا اسٹیشن کی سردمہری مجھے کھل رہی تھی اور اس کی رازداری کی شرط کی وجہ میری کچھ نہیں آ رہی تھی۔ پھر ونڈی ہانچ کر چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس نے اسی تھراپسٹ کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور وزن گھٹانے میں کامیاب رہی تھی۔

اس لحاظ سے سانٹھا اسٹیشن میری آخری امید ہو سکتی تھی۔ میں نے میز پر سے ایک پین اٹھایا اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

سانٹھا اسٹیشن نے معاہدے کا دستخط شدہ کاغذ اٹھا کر اپنے فولدر میں لگا دیا اور فولدر اپنی میز کی دراز میں بند کر دیا۔

”پروگرام میں خوش آمدید۔ تمہیں ہفتے میں ایک بار اپنا وزن چیک کرانے کے لیے مجھے رپورٹ کرنا ہوگی اور اس وقت تک آتے رہنا ہوگا جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ اس وزن کے حصول کے بعد تمہیں وزن چیک کرانے کے لیے سال میں صرف ایک بار آنا پڑا کرے گا۔ تم اپنے حصول

کردہ وزن ایک سو پچاس پونڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونے دو گے۔ یہ لازمی ہوگا۔ ہماری کوئی امتحان ڈائنٹ یا گولیاں نہیں ہیں جو تمہیں کھانا پڑے گی۔ صرف ایک سادہ اصول ہے جس پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا اور تم اس سے بھی انحراف نہیں کرو گے۔“

”وہ سادہ اصول کیا ہے؟“ میں نے جانتا جاہ۔ ”ہر ہفتے جب تم اپنا وزن کرانے آؤ گے تو تمہارا وزن لازمی طور پر کم از کم تین پونڈ گھٹا ہوا ہونا چاہیے۔“ سانٹھا اسٹیشن نے جواب دیا۔

”کیا یہ کسی قسم کا لطیفہ ہے؟“ ”یہ مذاق یا لطیفہ نہیں ہے مسٹر جیم! میں تمہیں اس بات کا یقین دلانے ہوں۔“ سانٹھا اسٹیشن کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ”ہر ہفتے تین پونڈ وزن گھٹانا ناممکن ہے۔ یقیناً ابتدائی چند ہفتوں تک تو ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ چند ہفتے میں کوئی وزن گھٹانہ سکوں۔“

”کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟“ ”یقیناً کرتا ہوں لیکن کیا وہی ترغیب کافی نہیں ہے۔“ ”وہ کافی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے۔ اس وقت تمہاری بیوی اپنی بہن کے ساتھ ایک شاپنگ مال میں ہے۔ وہ اس وقت ایک بڑے بڑے کھانے کی دکان میں کھڑی ہے۔“

تک تمہارا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹ نہیں جاتا۔ اگر کوئی ہفتہ ایسا رہا کہ تم اپنا وزن کم از کم تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہ ہوئے تو تمہاری بیوی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔“ سانٹھا اسٹیشن نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ”خاتمہ؟ خاتمے سے آپ کی مراد کیا ہے؟“ میں اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے مسکرانے لگا۔ ”کیا آپ اسے قتل کر دیں گی؟“

”نہیں ایک گندی اصطلاح ہے۔ میں خاتمے کے لفظ کے استعمال کو ترجیح دیتی ہوں۔“ سانٹھا اسٹیشن نے کہا۔ میں نے میز کی دراز کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ معاہدہ جس پر میں نے دستخط کیے ہیں، اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کی ہدایات سے کسی بھی قسم کے اخلاف کا مطلب خاتمہ ہوگا۔ کیا آپ مجھے قتل کروں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر نوبت یہاں تک آئی تو!“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل دنگی رفتار سے دھڑکنے لگا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے اپنی انگلی سے کھونے کے انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا اور قدرے بلند آواز سے

بولی۔ ”تم پاگل ہو۔ میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔“ اب میں اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر رہا تھا۔

”اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری بیوی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے گا اور اس کا الزام تمہارے سر دھریا جائے گا۔ ہم نے تمہارے گھر سے ایسی بہت سی چیزیں ہٹا دی ہیں جن کی وجہ سے تم اس جرم میں یا آسانی ملوث ہو جاؤ گے۔ اب ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ.... تمہاری بیوی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی شروع کر دی جائے۔ تمہاری تھراپسٹ کی حیثیت سے میں سینڈرا کو قتل کرنے کے تمہارے ذہن پر سوار خیال اور اس سے متعلق ہماری خفیہ مہنگو کو پولیس پر آشکار کرنے پر مجبور ہو سکتی ہوں۔ پولیس تم پر کبھی یقین نہیں کرے گی کیونکہ تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جبکہ ایک تھراپسٹ کی حیثیت سے میری بات پولیس کی نگاہ میں زیادہ وزن دار اور اہمیت کی حامل ہوگی۔ سو تم دیکھ سکتے ہو کہ جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے لیتے، تم میرے کنٹرول میں ہو۔ اب تمہارے حق نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔“

”ادہ شینٹ۔“ مجھے اپنی آواز کا ہنسی محسوس ہوئی۔ ”تم جو چاہ رہی ہو وہ نہ مانگتا ہوں۔ کوئی بھی ہر ہفتے اپنا وزن تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک کاروباری کورت ہوں مسٹر جیم۔ اگر میں چاہوں تب بھی تمہیں اس پروگرام سے باہر نہیں نکال سکتی۔ میرے سامنے میرے لیے نامعلوم ہیں۔ میں ان کے راپلے کے طور پر کام کرتی ہوں۔ تمہاری ادا کردہ رقم کو میں الحاق کمپنی کے پوسٹ آفس بکس کے پتے پر روانہ کر دیتی ہوں۔ پھر وہ مجھے میری تنخواہ بھیج دیتے ہیں۔ وزن کنٹرول کرنا ایک بڑا بزنس ہے اور میرے جو پاس ہیں انہوں نے اسے اپنے لیے انتہائی منافع بخش بنانے کا ایک طریقہ وضع کیا ہوا ہے۔ وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں جو تمہارے عہد کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔“

”میں اس بات پر یقین کرنا ہوں۔ دیکھو، تم اپنے راپلے کو بتا دو کہ اگر وہ اس معاملے کو نہیں ختم کر دیں تو میں انہیں جوہر چاہیں گے، ادا کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔

سانٹھا اسٹیشن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ بات ہمارے کاروبار کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ ہماری ایک شہرت ہے جس کی بدولت ہم جی رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی کامیابی کے تناسب پر بے حد فخر ہے۔ ایک بار جب آپ معاہدے پر دستخط کر دیتے ہیں

تو پھر آپ ہمارے کلائنٹس میں سے ایک بن جاتے ہیں۔ میں اس بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔“ سانٹھا نے ٹکاسا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”فرض کرو کہ میں اپنا وزن کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوگا؟“ میں نے جانتا جاہ۔

”ہم جانور نہیں ہیں۔ ہم لپک دکھاتے ہیں۔ لیکن ہم منطقی طور پر قابل قبول جواز کے بغیر غیر حاضری تسلیم نہیں کرتے۔ میرے سامنے ہر وقت تم پر نگاہ رکھے رہیں گے اور میں متنبہ کر دوں گا کہ اگر انہوں نے محسوس کیا کہ تمہاری غیر حاضری کا جواز اطمینان بخش نہیں تو پھر میں ان کے رد عمل کی ذمہ داری نہیں ہوں گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہر ہفتے باقاعدگی سے رپورٹ کرنا تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔“

سانٹھا اسٹیشن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

☆☆☆ جب میں اپنی کارڈرائیو کرنا ہوا اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک طوفان سا رہا تھا۔

سانٹھا اسٹیشن کے دفتر سے نکلنے پر سیاہ رنگ کی ایک لکڑی کا کار نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے تعاقب اور نگرانی کو خفیہ رکھنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ میری آنکھوں کے نیچے سپرڈ پڑ گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ یقیناً سینڈرا کو قتل کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔

یہ میں نے اپنے آپ کو کس جہال میں پھنسا لیا ہے؟ یہ میں نے سینڈرا کو کس جہال میں پھنسا دیا؟ اس پاگل پن سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ہوگا۔

جب میں اپنے پارٹمنٹ پہنچا تو سینڈرا گھر پر موجود نہیں تھی۔ میں لپک کر اندر پہنچا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر کی طرف دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لکڑی کا سڑک کار موجود تھی۔ اگر میں پولیس کو فون کرتا ہوں تو وہ لوگ سینڈرا کو قتل کر دیں گے۔ مجھے اس بارے میں منصوبہ تیار کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔

میں نے سبک کے نیچے سے کوزے کا ایک خالی تھیلا نکالا اور پکن کے کیبنٹ کھول کر ان میں رکھی ہوئی اشیاء جیسے بسکٹ، ایک، بٹر کے جارد، آلو کے چپس، کیڈنی بارز نکال کر تھیلے میں بھرنا شروع کر دیں۔ جو بھی شے مجھے کھانے پر دعوں لگتی تھی، وہ اس تھیلے میں منتقل ہو رہی تھی۔

جب میں ان اشیاء سے دوسرا تھیلا بھر رہا تھا تو سینڈرا

گھر میں داخل ہوئی۔

”تم کیا کر رہے ہو، ہنی؟“ اس نے پوچھا۔

میں چند سیکنڈ تک اس کی صورت نہکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں۔ ہم دونوں کی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ کیا ممکن ہو سکتا تھا کہ انہوں نے ہمارے مکان میں بھی آواز سننے کا خفیہ آلہ لگا رکھا ہوگا؟

جس معاہدے پر میں نے دستخط کیے تھے، اس کی رو سے میں نے ہر انداز آشکارہ کرنے کا عہد کیا تھا۔

سینڈرا کی ہڈیاں چوڑی چٹکی تھیں مگر وہ فریبنس تھی۔ جب وہ اپنے سنہری بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھتی تھی تو دیکھنے میں اتھارہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ہم نے باہم بہت سی مشکلات سہی تھیں اور میں کئی مرتبہ اسے آپس بھی کرچکا تھا لیکن اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے کتنا زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اسے کھو دینا میرے دل کو جبر دینے کے مترادف ہوگا۔

”اس مرتبہ میں یہ کر کے رہوں گا۔“ میں نے اپنی آواز کو کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی۔ ”میں اپنا وزن کھانے جا رہا ہوں۔“

سینڈرا نے اپنے بازو میری گردن میں حائل کر کے ہاتھ لگا کر کہا۔ ”میں اس سے اس قدر پیار کرتی ہوں کہ اگر وہ کبھی میری طرف سے کوئی خطرہ ہوگا تو میں اسے بھینس دوں گی۔“

اس کے بارے میں بتاؤ۔ ”کچھ زیادہ بتانے کو نہیں ہے۔ اس کا راز ترغیب ہے۔ میں نے ایک فارم پر دستخط کیے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ میں اس کے طریق کار کا راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ حتیٰ کہ تم پر بھی نہیں۔ لہذا تم خود ہی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔“

وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”تم جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کچھ بھی، ہم چھٹی اور مرغی کھا دیں گے۔ ہر قسم کی سبزیوں پر گزارہ کریں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم نے مجھے یہ حد خوش کر دیا ہے۔ آج ہماری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہو رہا ہے۔“

سینڈرا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ کس حد تک حقیقت اور سچائی پر مبنی تھے۔

☆☆☆

ہماری چوبیس گھنٹے کی کڑی نگرانی مستقل جاری تھی۔

وہ سیاہ رنگ کی لیکن کار ہر جگہ میرا پیچھا کرتی تھی۔ دو خواتین گھر سے رنگ کی شیورلیٹ کار میں سینڈرا کا تعاقب کرتی تھیں۔ اگر سینڈرا اپنے تعاقب سے باخبر تھی تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

دفتر میں میرا کام متاثر ہو رہا تھا۔ میں اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا تھا اور مجھ سے غلطیاں سرزد ہونے لگی تھیں۔ جیسے تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ دفتر میں لوگوں نے میرے بارے میں باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ پاس نے بھی کہہ دیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو درست نہیں کیا تو وہ مجھے تو کرسی سے برخاست کر دے گا۔ لیکن میں نے اپنا وزن کھانا لیا۔

پہلے پتے میرا وزن آٹھ پونڈ کم ہو چکا تھا۔ اس سے اگلے پتے چھ پونڈ اور اس کے بعد تیسرے پتے مطلوبہ وزن پر پہنچ گئے۔

میں نے ہر مرتبہ ساتھ اسٹیشن سے مت ساجت کی کہ وہ مجھے اس پروگرام سے نکال دے اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

یہ جو تھا جتنے تعاقب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

جمعرات تک میں صرف ایک پونڈ وزن کھانا یا تھا اور مجھے علم تھا کہ میں اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتی تھی۔ اپنا وزن مطلوبہ وزن پر پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اگر کوئی معجزہ رونما ہو جاتا ہے اور میں مطلوبہ وزن تک پہنچا لیتا ہوں تب بھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کبھی نہ کبھی تو میں ساتھ اسٹیشن کے برف کو پانے میں ناکام رہ سکتا ہوں۔ پھر کیا ہوگا؟

اس سہ پہر میں سوچوں میں گم ہو گئی کہ میں کونوں پر بونٹی گھومتا رہا۔ میں سینڈرا سے مدد طلب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ہمارے گھر میں آواز سننے کا خفیہ آلہ نصب ہو۔ اگر ہم اس بارے میں گفتگو کرنے کی خاطر باہر چہل قدمی کے لیے جاتے تب بھی شاید ان کے پاس کوئی ایسا طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری گفتگو سنیں۔

اس رات جب میں گھر پہنچا تو سینڈرا کچھ ہی کی معاملہ کچھ گزربہ۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اگر میں وزن کھانے کی کوشش کروں تو تم میری مدد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تب میں نے ایک نوٹ لکھا کہ اس کے ہاتھوں میں تھمادی۔ میں نے تمام باتیں اس نوٹ تک میں تحریر کر دی تھیں اور وہ منصوبہ بھی بیان کر دیا تھا جس

کے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ہماری جائیں بچا سکتا ہے۔ سینڈرا کا ڈیج پر آگئی پائی مار کر بیٹھ گئی اور نوٹ تک کی تحریر کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ اسے مکمل تحریر پڑھنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں اس بات کا اسے کرڈٹ دیتا ہوں کہ اس نے بالکل بھی کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب وہ پڑھ چکی تو میں نے اس کی آنکھوں میں یکے ارادے کے تاثرات دیکھے۔ میں جان گیا کہ اب ہم باہم ان لوگوں کو شکست دے دیں گے۔

پھر سینڈرا نے اپنی بہن کو فون کیا اور وہ دونوں شاپنگ مال چلی گئیں۔

اگلے روز جب سینڈرا کی نوپوتا اس میونسپل ٹینک پلانٹ روانہ ہوئی جہاں وہ گزشتہ ماہ سے بطور سیکرٹری کام کر رہی تھی تو گھر سے رنگ کی شیورلیٹ کار نے حسب معمول اس کا تعاقب کیا۔

البتہ اصل بات یہ تھی کہ سینڈرا کی کار اس کی بہن وانکٹ جلا رہی تھی جس نے اپنے پیلیے اور لباس سے سینڈرا کا بہروپ اختیار کیا ہوا تھا۔

سینڈرا ان کے جانے کے چند منٹ بعد گھر سے نکلی۔ اس نے ہمارے پتے لانا کے احاطے کو عبور کیا اور انٹر پورٹ فون کی کھنٹی بجی تو میں سمجھ گیا کہ وہ یہ حفاظت جہاز میں سوار ہو چکی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور میں جانتا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ہمارے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہماری زندگیاں محفوظ ہوں گی تو وہ مجھ سے خود ہی رابطہ کرے گی۔

میں نے گھر کو تالا لگا دیا اور پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سیاہ لیکن کار معمول کے مطابق میرا تعاقب کرنے لگی۔ جب میں پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو یہ بات نوٹ کی کہ اس سیاہ لیکن کار کا ڈرائیور میل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سینڈرا کی نگرانی کرنے والوں کو پیغام دے رہا تھا کہ وہ سینڈرا کو تالا بکریں۔ لیکن اس وقت تک سینڈرا کی بہن وانکٹ پلانٹ کے مٹی دروازے سے نکلنے کے بعد اپنی کار میں سوار ہو کر حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی جو اس نے گزشتہ شب وہاں پارک کر دی تھی۔

جب میں اندر پہنچا تو شیشے کے پار ٹینک کے پیچھے بیٹھی

ہوئی خاتون پولیس افسر نے استقبالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی بیوی کو قتل کرنے والا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرے منہ پر کا مذاق اڑاتی ہے۔ بالآخر آج میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا ذہن صحیح رہا ہے۔ وہ محفوظ نہیں ہے۔ تمہیں اسے بچانے کی خاطر مجھے لاک اپ میں بند کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

میرے نفسیاتی ٹیسٹ لیے گئے جنہیں میں جان بوجھ کر ناکام بناتا رہا۔ مجھے پرکھنے کے ان سلسلوں کے بعد عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ میری ذہنی کیفیت نارمل نہیں اور میں معاشرے کے لیے خطرناک ہوں۔

ایک بیج نے حکم دیا کہ مجھے راج دے ایکرز نامی سینٹرل اسپتال میں اس وقت تک لاک اپ میں رکھا جائے جب تک کہ ڈاکٹر اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتے کہ میں ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے فٹ ہو چکا ہوں۔ جب ہی میں عام زندگی میں لوٹ سکتا تھا۔

میرا اسپتال پہنچنا یقینی طور پر سنبھلنے کے روز واپس آنے کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اس وقت میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ کے لیے جان بوجھ کر ہراساں ہوا تھا۔

اپنی بابت نئی تصویر کی بہتری کے لیے انہوں نے مجھے پندرہ سو کیلوریز فی یوم کی غذا پر رکھ دیا۔ اگر میں نے تھمرانی پر حسب ہدایت بہتر عمل کیا تو وہ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

اس وقت تک میرا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو چکا ہوگا۔ اور اس طرح میں نے ساتھ اسٹیشن کو مات دے دی۔

☆☆☆

میرا نیا تھراپسٹ آفس بڑا اور چوکور بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ سفید تھا اور ان پر فریم شدہ کئی... سرٹیفکیٹ آویزاں تھے۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو تھراپسٹ نے اپنی کرسی کا رخ کھڑکی کی سمت کیا ہوا تھا۔ میں میز کے سامنے پہنچ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد تھراپسٹ نے اپنی گھومنے والی کرسی میری طرف کیا تو بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔

وہ ساتھ اسٹیشن تھی جو تھراپسٹ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔



محی الدین نواب

چودھوی قسط

READING CORNER

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کے سات پرے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بتایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے قدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سلطان سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی جلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ رات کو سوئے ہوئے آنسوؤں کا حیران کن سنگ۔

ایک چہرہ نگار روپ، محی چھاؤں کی خوب، محبت کی مٹائیوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



مرا وہ تو آدم آئینے کے سامنے آ کر اپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ اب چہرہ بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔ بچاس لاکھ ڈالرز کی محاسبات پر ہر سمت سے ذہن پریشیاں آ کر مٹا رہی تھیں۔ ہر قاتل کے ایک ہاتھ میں گولہ اور دوسرے ہاتھ میں اس کی تصویر تھی۔ ان قاتلوں کے ذہن میں اس کی صورت اس کا نام نقشہ اچھی طرح نقش ہو گیا تھا۔

مراد کے لیے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ
سارے ہی جان کے دشمن اسے پہچانتے تھے وہ کسی کو نہیں
پہچانتا تھا۔ وہ جے پور کی پناہ گاہ سے نکل کر آنے کے بعد
دلی شہر کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہوئے بڑی نادانی کر رہا
تھا۔ ابھی تک قسمت اچھی تھی کہ سلاستی سے تھا۔

”مگر ماروی! میں تیرے لیے اجنبی بن جاؤں گا۔
 بڑی مشکلوں سے یقین دلایاؤں گا۔ پھر بھی صورت سے پرایا
 لگا رہوں گا۔ کہیں عجیب سی بات ہوگی، تیرا سرا علی منگی تجھے
 دکھائی نہیں دے گا۔“

اس نے آئینے میں خود سے کہا۔ ”مہینے باروی کو بتانا چاہیے کہ میں بدلنا چاہتا ہوں۔ ذرا دیکھوں کہ وہ کیا کہتی ہے؟“

اس نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ وہ غصہ دکھانے لگی۔ ”یہ تم کیا کرتے ہو؟ بات پوری نہیں کرتے اور فون بند کر دیتے۔ شہر چھوٹی جگہ ہے۔ تم بیکس میں بیٹھ کر اندر بیچال آ جاؤ گے۔ اس کے آ جاؤ گے؟ یہاں کی پولیس اور جاسوس ہمیں دیکھتے ہی گولی بار دیں گے۔ کیوں مجھے بھلا سے ہوسراؤ؟“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ میرا حوصلہ ہے کہ آؤں گا۔ بلا سے جان جائے گی، ایک بار تمہیں دیکھ تو لوں گا۔“

”کیوں رولانے والی باتیں کر رہے ہو؟ جان دینے کے لیے آؤ گے تو میرے لیے کیا رہ جائے گا۔“

لوں گا پھر اس اطمینان سے دم توڑوں گا کہ میرے بعد عیش و آرام سے اور سلاستی سے رہا کر دوں گی۔“

”میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ خون بند کروں گی۔“
یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔

چھپنے کا مستقل ٹھکانا ہے۔ نہ بھاگنے کا راستہ ہے۔ تمہاری طرف جانے والے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ پھر بھی تمہیں ایک بار دیکھنے ضرور آؤں گا۔“

”چپ ہو جاؤ۔ مریں گے تمہارے دشمن۔ میں
آخری سانسوں تک تمہارے ہی نام رہنا چاہتی ہوں لیکن کیا

کروں؟ اپنے ہی فیصلے اپنی ہی زبان کے مطابق دو تارخ کو محبوب کی دلہن بنانا پڑے گا۔ اس سے پہلے ہی آجاؤ مراد... پولیس والوں سے بیچ بچا کر مجھے انخواہ کر کے لے جاؤ۔ مجھ پر الزام نہ آئے کہ میں نے محبوب کی دلہن بننے سے انکار کیا ہے۔“

”سچ ہی سمجھتو میں نے بھی کئی بار سوچا ہے کہ پاکستان میں نہیں رہ سکوں گا۔ کیوں نہ چھپیں وہاں سے بھگا کر لے آؤں۔ ابھی میں نہیں جانتا کہ کیا کر سکوں گا۔ تمہیں فون پر بتاتا رہوں گا کہ کس حال میں ہوں اور کیا کرنے والا ہوں؟“

”میں روز ہی تمہارے فون کا انتظار کرتی رہوں گی۔ مجھ سے روز ایسی ہی حوصلہ دینے والی باتیں کرتے رہو۔“

”ابھی میں نے ایک ضروری بات کہنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے دشمن میری تصویر لیے پھر رہے ہیں تاکہ مجھے پہچان کر گولی مار سکیں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں محبوب کہہ رہے تھے کہ خطرناک لوگوں کے پاس تمہاری تصویر ہے۔“

”اس طرح جھوک کر لو کہ میری جان کے دو کون ہیں، وہ مجھے چرے سے بچاتا ہے۔ اس کے برعکس میں کسی دشمن کو نہیں بچاتا ہوں۔ وہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے سامنے آکر لڑے گا۔“

یا اللہ...! پھر تو کم بے جبری میں ان سے مات کا واسطہ۔“

”سیدھی سی بات سمجھو کہ بے خبری میں گولی کھاؤں گا۔“
”مراد اتم کیسے ہر طرف سے پھنسے ہوئے ہو؟ تمہارا
اینا چہرہ ہی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔“

”ہاں، یہ چہرہ قالموں کو بڑی آسانی سے اپنی طرف بلانے والا ہے۔ میں اس سے پہلے ہی اس چہرے سے

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کرنے والے ہو؟“

”میں نہیں جانتی پلاسٹک سرجری کیا ہوتی ہے۔ کیا

اس کے بعد دھن کہیں نہیں پہچانیں گے؟“
 ”دوست بھی نہیں پہچانیں گے۔ تم میری بچپن کی
 ساتھی ہو۔ تم بھی نہیں پہچان سکو گی۔“

”ہاں، میرے سامنے آؤ گے تو میرے مراد کا چہرہ نہیں رہے گا۔ تم کوئی اجنبی دکھائی دو گے۔“

”جب تک اپنی پہچان نہیں کراؤں گا، پچھلی تمام

باتیں بیان نہیں کروں گا تم یقین نہیں کرو گی۔
 "صرف ایک ہی بات سے یقین کروں گی تم کو ڈرڈر
 ... ادا کرو گے۔ یاد ہے نا؟ بولو کیا بولو گے؟"
 "میں بولوں گا، میری ماروی کسی عمر کے شکستے میں کبھی
 نہیں آئے گی۔"
 وہ بولی۔ "ہاں، تب میں آنکھیں بند کر کے یقین کر
 لوں گی کہ اجنبی بن کر آنے والے تم ہی ہو۔"
 "تو پھر یہ چہرہ مٹا دوں؟"
 "ہاں، میں ہر حال میں نہیں بچاؤں لوں گی۔ تم اپنی جان
 بچانے کی فکر کرو۔ جتنی جلدی ہو سکتی اپنی شخصیت کو بدل دو۔"
 "میں تو پھر ٹھیک ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ چہرہ
 تبدیل ہونے کے بعد نہیں کال کروں گا۔"
 مراد نے رابطہ ختم کر کے اطمینان کی سانس لی۔ اسے
 کسی کی پروا نہیں تھی ایک ماروی کی طرف سے فکرمندی کہ وہ
 اس نئے چہرے کو قبول نہیں کرے گی۔ مگر اب اس نے اسے
 بھولے ہوئے کو ڈرڈر یاد دلانے تھے۔ اب وہ اطمینان
 سے پیدا نئی چہرے کو اوداع کہہ سکتا تھا۔
 اس نے اپنا فون اٹھا کر ایم این اے دھرم داس سے
 رابطہ کیا پھر بچھا۔ "آکر آکر اب مصروف نہیں ہیں تو ضروری
 باتیں کر کے دے دے آتا چاہتا ہوں۔"
 وہ بولا۔ "مصروفیات تو ہیں۔ یہ کبھی بیچھا نہیں
 چھوڑیں گی۔ مگر تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔
 آجاؤ۔"
 وہ آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے
 کہا۔ "مراد... اتم نے دشمن کی بہن کو ہلاک نہیں کیا۔ اس
 کی جان بچائی ہے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔"
 مراد نے پوچھا۔ "بڈن آپ سے کچھ کہہ رہا تھا؟"
 "تم نے اسے اچھا دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ لیزا کوئی
 زندگی دینے والا اگر کوئی دیتا ہے تو وہ اس سے ملاقات کیے
 بغیر کیوں چلا گیا اور اس نے اپنی کال ماسک پہن کر اپنا چہرہ
 کیوں چھپا رکھا تھا۔ وہ دیتا بھی ہو سکتا ہے اور دشمن بھی۔"
 "وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔ کل کرکس ڈے ہے۔ وہ مجھ
 سے کہہ رہا تھا کہ ہال میں جشن منایا جائے گا وہاں سکیورٹی
 کے لیے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ یہ غیر ملکی
 سفارت خانے والوں کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے بہت کچھ
 کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ سکیورٹی
 سخت کر دی جائے گی۔ تم بولو کیا کرنا چاہتے ہو؟"
 "میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے والی ایمی ای

ہال کی عمارت باہر سے دیکھی ہے۔ اسے اندر سے بھی دیکھنا
 چاہتا ہوں۔"
 "کسے دیکھو گے؟ تمام دشمن تمہاری صورت کو دور
 سے پہچان لیں گے۔"
 "میں اسی مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ کسی
 پلاسٹک سرجری کے ماہر سے رابطہ کر سکتے ہیں؟ میں آج ہی
 بلکہ ابھی چہرہ بدلنا چاہتا ہوں۔"
 وہ سر ہلا کر بولا۔ "تم بروقت صبح قدم اٹھا رہے
 ہو۔ ڈاکٹر مینی من بہت ہی ماہر اور تجربہ کار سرجن ہے۔ میں
 نے سنا ہے، دو چار گھنٹے میں سرجری ہو جاتی ہے۔ میں اس
 سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں ڈاکٹر مینی من سے معلومات
 حاصل ہو جائیں گی۔"
 "آپ ان سے اتنا کہہ دیں کہ چہرہ آج ہی بدل
 جائے۔ کل بڈن کے معاملے میں مصروف رہوں گا۔"
 دھرم داس فون اٹھا کر ڈاکٹر مینی من کے نمبر پر کال کرنے لگا۔
 ☆☆☆☆
 جرائم کی دنیا میں اگلی کی اہمیت اس حوالے سے ہے
 کہ پہلا گاڈ فادر ٹیکس نے اٹھرا تھا۔ جب سے اب تک اس
 ملک میں گاڈ فادر کی فکری تسلیم اور تسلیم پھلتی جا رہی
 ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کا بڑا مسئلہ ان کے بڑے بھائیوں کو اس
 کے سامنے گھٹنے ٹیکنا پڑتا ہے۔
 دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی مجرموں کی تحقیق
 اتنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں کہ بلیک لسٹ میں ہونے کے
 باوجود آزادی سے آگ اور بھوکا ٹھیک جاری رکھتی ہیں۔ یہ
 تحقیقیں لاکھوں پاؤنڈز اور کروڑوں ڈالر کی ڈیٹنگ کرنی
 رہتی ہیں۔
 تمام تحقیقیں ایک دوسرے کی دوست بھی ہوتی ہیں
 اور دشمن بھی۔ ان خطرناک لوگوں کی ایک الگ دنیا
 ہے۔ سب سے الگ اپنی سوسائٹی ہے۔ یہ حرام موت بھی
 مرتے ہیں اور عیش و عشرت سے زندگی بھی گزارتے ہیں۔
 سنڈکیٹ ریڈ الٹ کا ہیڈ کوارٹر سسلی میں تھا۔ مراد نے
 ان کے سب سے اہم کارندے برنارڈ کو ہلاک کیا تھا۔ برنارڈ
 ایک بڑے ملک کا سیکرٹ ایجنٹ تھا اور ریڈ الٹ کے سربراہ
 سسلی الٹ کا بھتیجی بھی تھا۔ مراد نے بھتیجی برنارڈ کے بعد
 سالے سسلی الٹ کو بھی جہنم میں پہنچا دیا تھا۔
 اب دوسرا سالہ سسلی براؤن ریڈ الٹ کا سربراہ بنا
 گیا تھا۔ اس نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالر لگائی
 تھی۔ اس سلسلے میں وہ دن رات تمام خطرناک تحقیقوں سے

اور انڈر ورلڈ کے مجرموں سے رابطے میں رہتا تھا اور اسی
 مقصد کے لیے اس نے تمام تحقیقوں کے سربراہوں کو ایک
 سینار اسٹار ہوٹل میں شراب و شباب کی دعوت دی تھی۔ دوسرو
 پچاس کروڑ کے سات منزلہ ہوٹل میں ہر سربراہ کے لیے
 کمرے اور سوئٹس ریزرو کرائے گئے تھے۔ ایک
 خوبصورت سے سونگ پول میں انتہائی حسین عورتیں
 ہاشت بھر کے لباس میں تیار رہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر
 بڑے ناز و انداز سے مہمانوں کو شراب کے جام پیش کر رہی
 تھیں۔ پھر وہاں سے پلٹ کر پول کے شفاف پانی میں
 غوطے لگا رہی تھیں۔
 تمام سربراہ پول کے کنارے بیٹھ کھانی رہے تھے۔
 شبابی نظاروں سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ تھوڑی دیر
 بعد وہ حسنا میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مہمانوں کے
 سامنے سے شراب کی بوتلیں اٹھائی گئیں۔ ایک مہمان نے
 سسلی براؤن سے کہا۔ "مسٹر براؤن..... ایہ کیا؟ ابھی تو
 پینا شروع کیا تھا۔"
 دوسرے نے کہا۔ "ابھی حسنا میں مست کرنے والی
 تھیں ہائے کیا کیا؟ تم نے اپنا ایک ہی سب کو غائب کر دیا۔"
 سسلی براؤن نے کہا۔ "ابھی ہم جس بات کے لیے
 یہاں اکٹھے ہوئے ہیں صرف دو بات ہوگی۔ عیش و عشرت کے
 لیے ساری رات پڑی ہے۔"
 "میرے دوستو! ہماری جرائم سے بھرپور ایک الگ
 دنیا ہے۔ ہم اس دنیا میں ایک بھی زندگی گزارنے آ رہے
 ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے خطرناک مجرم آتے جاتے
 رہے ہیں جو کسی سے ذریعہ نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود
 وہ کی دشمن کی گولی سے حرام موت مر گئے۔"
 "لیکن وہ... وہ مراد علی سنگی کسی کے نشانے پر نہیں
 آ رہا ہے۔ اپنی بات نہیں ہے کہ وہ ناقابل شکست
 ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی اسے ایک چنگی میں مسل دے
 گا لیکن وہ نظر آئے جب... وہ اب تک اس لیے
 سلامت ہے کہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہمارے شوٹرز اس کی تصویر
 لیے بھرتے ہیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے، وہ جانا پہچانا
 چہرہ نہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔"
 ایک تنظیم کے سربراہ نے کہا۔ "جب وہ دکھائی دیتا
 تھا تب ہم نے کون سا تیر مار لیا؟"
 ایک انڈر ورلڈ کے سربراہ نے کہا۔ "بڑے شرم کی
 بات ہے ایک چھپر مارا نہیں جا رہا ہے اور ہم کرائیاں پیٹتے جا
 رہے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آنے کے بعد کراچی شہر میں

آزادی سے گھومتا رہا۔ کتنا آسان ٹارگٹ تھا لیکن اسے
 گولیاں مارنے والے شوٹرز خود ہی موت کے گھاٹ اترتے
 چلے گئے۔"
 دوسرے نے کہا۔ "ہماری معلومات کے مطابق مرید
 اسے اٹھانے کی کئی بھی اور وہ اب تک وہیں چھپا ہوا ہے۔"
 ڈی بلیک نے کہا۔ "مرید کا قہقہہ عجیب ہے، اس نے
 مراد کے بچے کی ماں بننے کے لیے اسے چھپا رکھا ہے۔ بڑی
 عجیب عورت ہے۔ ایک بچہ پیٹ میں لینے کے لیے پچاس
 لاکھ کی قیمت کو ٹال رہی ہے۔ اس کے MET
 ڈیپارٹمنٹ والے اسے فوراً پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بیچلی
 تمام رات بے پور کے لوگ جاگتے رہے۔ ہیکری بڈن کے
 اور میرے کارندے وہاں ایک ایک گھر میں کھس کر اسے
 تلاش کرتے رہے لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔
 "میرا خیال ہے بڈن کوئی چال چل رہا ہے۔ اس نے
 مراد کو بے پور سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں
 کوشش کر رہا ہوں۔ میرے آدھوں نے دہلی میں بڈن پر
 حملہ کیا تھا تا کہ وہ خوفزدہ ہو کر مجھے مراد تک پہنچا دے۔"
 سسلی براؤن نے کہا۔ "MET سے ہمارا معاہدہ ہو
 چکا ہے۔ اگر مراد بڈن کے پاس ہوتا تو وہ پچاس لاکھ حاصل
 کر لے گا۔ لیکن وہ ہمارے ہاتھ سے نہیں آ رہا۔"
 ڈی بلیک نے کہا۔ "MET والوں کا مراد سے ایسا
 کوئی سمجھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی پچاس لاکھ جیسی
 بڑی رقم نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے اہم معاملے کو نظر
 انداز کر رہے ہیں۔"
 "آج صبح میرے دو ماتحتوں نے بڈن کی بہن لیزا
 کو اغوا کرنا چاہا تو اچانک ایک شخص نے آکر اسے بچا
 لیا۔ میرے دونوں ماتحتوں کو اس نے مار ڈالا۔ اس کا چہرہ
 مارک میں چھپا ہوا تھا۔
 "میں یقین سے کہتا ہوں کہ بڈن کی بہن لیزا
 والا وہ مراد علی سنگی ہوگا۔ مراد میرے بڈن اور ان کے
 ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کے درمیان خفیہ گٹھ جوڑ ہے۔"
 سسلی براؤن نے کہا۔ "اسے اپنی نقصانی خواہش کی
 خاطر چھپا کر رکھنے والی مرید ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ
 پہلے مرید کو ہی اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔"
 ڈی بلیک نے کہا۔ "آج میں نے اسے قابو میں
 کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غضب کی فائر ہے۔ اس نے
 ایک ہی حملے میں میرے چاروں فائٹرز کو موت کے گھاٹ
 اتار دیا۔"

اس نے بتایا کہ مرینہ نے کبھی چالباز سے انہیں ہلاک کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے تحارت سے کہا۔ ”عورت کتنی ہی زبردست فائز بن جائے۔ پہاڑ جیسے مرد کے مقابلے پر آئے تو چڑکریاں بھول جاتی ہے۔“ ڈی بلیک نے اس سے پوچھا۔ ”بار بروس... تم واقعی زبردست ہو۔ کیا اسے زیر کر سکو گے؟“ بار بروس نے پوچھا۔ ”بہت کتنی ہوگی؟“ ”اگر اسے جاننے سے نہیں مارو گے، اس کے ہاتھ پاؤں تو نوکر اسے اپنا چنگ کر لے کر دے گا تو میں ہزار ڈالر زدوں کا۔“ ”بہت کم ہیں۔“

غصے اور جوش و خروش میں ہو۔ مراد نے پہلے تمہارے بھتیجے
برنارڈ کو مارا پھر تمہارے بھائی۔ میکس الیٹ کو ختم کر دیا۔ میں
تم سے کہوں گا کہ جہاں تک ممبر کرو اور اسے بھول جاؤ تو
ممبر کرو گے۔ یہ بھولو گے۔“

میکس براؤن نے پوچھا۔ ”میرے ممبر کرنے سے کیا
وہ گرفت میں آجائے گا؟“

”اسے سیکھائی دینے والے کو پوچھنا اور دوسرے مددگار ہر روز ہر مہینے اس کے دشمن کو کہیں نہیں یا کہیں گے تو یقین کر لیں گے دشمنوں نے مراد کو بھلا دیا ہے۔ انہوں نے مراد سے خوفزدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

وہاں سے بخوا کر کے لانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مراد پاگل ہو کر اس کے پیچھے دوڑا چلا آئے گا۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”ایسی بات ہے تو ہم ماروی کے متعلق اپنے طور پر معلومات حاصل کریں گے، اگر وہ مراد کے لیے مقناطیس ثابت ہوگی تو جان جوہم میں ڈالنے والے ہمارے جاناں ہر حال میں اس مشق کو اٹھا کر لے آئیں گے۔“

اس نے کہا تھا۔ ”الحمد للہ۔ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرا نام ایمان علی ہے۔“

یہ سنتے ہی اس نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اب بچہ تارہا تھا۔ ایمان علی نے فون کی سم بدل دی تھی۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ایک بار اپنے باپ سے ملنے ضرور آتا۔ وہ سنگدل نہیں ہے۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پانچ برس تک اس کی شادی اور لاعلمی نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اللہ کو چارہ ہو گیا ہے۔ جب ڈاکٹر یحییٰ من نے دل میں ہی عہد کیا تھا کہ پھر سے بیٹے کو زندہ کرے گا۔

یہ سراسر خدائی دعویٰ تھا۔ بیٹے کی جدائی اسے اپنا رمل بنا رہی تھی۔ اسی لیے سب اسے کر بڑی کہتے تھے۔ وہ بھی غلام بن چکا تھا۔ ”میرے بیٹے نے مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھ سے ملنے کے لیے توپ رہا ہے۔ ڈیڈی! اور دائرہ ہلا رکھو۔ میں جلد ہی آنے والا ہوں۔“ وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ بیٹا اس دنیا میں رہا ہے یا نہیں ہے؟ اگر مر چکا ہے تو اسے پھر سے زندہ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ پھر وہ دن آیا کہ اس نے مجھ کو لکھا۔ ”جیسا کہ چاہا ہے۔ وہ زندہ اور تندرست ہے۔“

نکس ہے مگر ہو گیا تھا۔

اس وقت سرجری روم میں آئینے کے سامنے ایمان علی سرجری جینز پہننا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر یحییٰ من کھڑا ہوا اپنے بیٹے کو سامنے لیتے دیکھ رہا تھا۔

مراد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ یہ تو کمال ہو گیا۔ میں تو اپنے اندر ایسے کم ہو گیا ہوں کہ خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر! آپ نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ مجھے غائب کر دیا ہے۔ کیا میں بھی خود کو دکھائی نہیں دوں گا؟“

وہ بولا۔ ”جب چاہو گے سرجری کے ذریعے تمہارا چہرہ واپس لے آؤں گا۔ ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو زندہ کیا ہے۔ آج سے تم مجھے ڈاکٹر نہیں ڈیڈی بولو گے۔“

پھر وہ ایک مختصر شیش اٹھا کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”خود کو آئینے میں دیکھ رہے ہو، یہ بتاؤ میرا اپنا کتنا پیڑم تھا۔“

”بہت ہی خوب رو تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے خوبصورت نہ بنائیں۔ معمولی سی صورت ہوتا کہ عورتیں مجھ

سے دور رہیں۔“

”کیا تم ارادے کے کمزور ہو؟ عورتیں تمہاری طرف جھکتی ہیں اور تم ان کی طرف جھک جاتے ہو؟ میرے بیٹے کیا تمہارے اندر ایمانی قوت نہیں ہے؟“

”میں پار سار بننے کے لیے ایمانی قوتوں کا ہی سہارا لے رہا ہوں۔ صنف نازک سے کڑا آ رہا ہوں۔ اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ مجھ میں خوب روی اور کشش نہ ہو اور آپ نے تو مجھے بہت ہی خوب رو اور پُر کشش بنا دیا ہے۔“

”میرا بیٹا ایسا ہی گلفام تھا۔ لڑکیاں اس پر مرقی تھیں اور وہ ان سے دین ایمان کی باتیں کرتا تھا۔ دراصل اپنی نیت کھری اور مستحکم ہو تو قدم نہیں ڈکھاتے۔ شیطان دور کھڑا نکلتا رہ جاتا ہے۔ دھرم جی نے تمہارے حالات بتائے ہیں۔ تم ایک شریف مجرم ہو۔ پہلے انتہائی سیدھے سادے اور شریف تھے لیکن تمہیں مجرم بننے پر مجبور کیا گیا ہے۔ صرف مجرموں کے لیے ہی مجرم نہیں ہوا تو ان کے محافظ کہلاتے والے بھی تمہیں مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”اب کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ میں یہاں کا ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔ یہی ضرورت ہوئی تو میں بیان دوں گا کہ تم میرے بیٹے ہو۔“

”اس معاملے کے لیے تمہیں اور مجھے ملنا پڑے گا۔“

”میں پھیلے ہوئے میرے رشتے دار کو ایسی دیں گے کہ تم میرے بیٹے راہن بن ہو اور تم نے دین اسلام قبول کیا ہے۔ میرے پاس راہن بن کا شتھی کارڈ اور تھیں ڈاکٹر یحییٰ من ہیں۔ میں ایمان علی ولد ڈاکٹر یحییٰ من کے نام سے تمہارا بیٹا شتھی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا دوں گا۔“

مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں آپ کے یہ احسانات بھی نہیں بھولوں گا۔ آپ میرے راز دار بن کر رہیں گے تو کوئی مجھ پر بھی شبہ نہیں کرے گا۔“

”تمہارا فرض ہے کہ میرے احسانات کا بدلہ مجھے دو اور میری ایک خواہش پوری کرو۔“

”جہاں تک میرے اختیار میں ہوگا، میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں ہمیشہ میرے بیٹے بن کر رہوں۔“

”میں یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکوں گا۔ پاکستان میں میری جان حیات ہے۔ آپ کی ہونے والی ہوگا تا نام ماروی ہے۔ میرا دیاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میں تمہیں بہو کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا لیکن وہاں کیسے جاؤ گے؟ دھرم داس جی نے کہا ہے کہ

دلکش تحریریں لیے جنوری 2015ء کا سال نو نمبر حاضر ہے

پاکینہ

ماہنامہ

کراچی

نگہت سیمیا اور افاق جاوید کے ماہرانہ قلم کے شاہکار سلسلے وار ناول

جنگل کا پھول زاہدہ پروین نے کھلائے کچھ نئے طرز کے پھول

نایاب جیلانی کی خوبصورت تحریر ترک وفا کا اک نیاموڑ

سال نو کے لیے انجم انصار کے ماہر قلم کا شاہکار ناول

سمیرا یونس ہارون محبت بھرے مکمل ناول کے ساتھ حاضر ہیں

عظمیٰ آفاق سعید کا پُر لطف سفر نامہ دینی

اس کی جگہ

نگہت اعظمی، عنیقہ محمد بیگ، شمیم فضل خالق

نہایت جبین ضیا اور دیگر کہنہ مشق رائٹرز کی دلنشین کاوشیں

یہ نیا سال کیا پیغام لاتا ہے پڑھیے
شائستہ زریں
کے کیے گئے سروے کا دلچسپ احوال

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

تمہارے وطن کی زمین تمہارے لیے تلک ہوگئی ہے۔
 ”اب وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں چھپ کر
 ماروی سے ملوں گا۔ وہاں اس کے ساتھ پوری زندگی
 گزارنے کے لیے اس نئے روپ میں نیک نامی سے۔۔۔
 پڑسن شہری کی طرح رہوں گا۔ تمہارا چھپک دوں گا۔“
 ”وہاں نہیں رہ سکو گے۔ اگرچہ کوئی تمہیں نہیں
 پہچانے گا۔ لیکن ماروی کی وجہ سے تم پہچان لیے جاؤ گے۔“
 ”ہاں، یہ سنا دیشہ ہے۔ میں سوچوں گا۔ کوئی تدبیر کام
 نہ آئی تو ماروی کو یہاں لے آؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ ہوئی نیا بات۔ اس سے اچھی
 کوئی بات ہوئی نہیں سکتی۔ میرا بیٹا میری بہو میرے پوتی
 پوتے یہاں میرے گھر میں رہیں گے۔“
 ”اگر کسی وجہ سے یہاں نہ آسکا تو؟“
 ”تو لندن میں میرا ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ میرے
 بعد اور کون میرا ہوگا؟ تم ہی بیٹے کی حیثیت سے میری تمام
 دولت اور جائیداد کے مالک بن جاؤ گے۔“

ڈاکٹر ٹینیسن کے ذریعے اسے بڑی سہولتیں حاصل
 ہو رہی تھیں۔ ایمان علی کے نام سے ایک پاسپورٹ اور
 شناختی کارڈ بن جاتا تو وہ آسانی سے حد بار اپنی ماروی کے
 پاس جاسکتا۔
 اگر ماروی کے ساتھ پاکستان میں رہنا ممکن نہ ہوتا تو
 وہ اپنی شریک حیات کو لے کر وہی ڈاکٹر ٹینیسن کے پاس
 پھرے پڑسن شہری کی طرح شریفانہ زندگی گزارنے لگتا۔
 اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ تمام کر کہا۔ ”آپ بیٹے سے
 محروم ہو گئے تھے۔ اب میں اس کی کی پوری کروں گا۔ ابھی
 جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا۔“
 وہ خوش ہو رہا تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں جھپک
 رہی تھیں۔ مراد نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ جلد سے
 جلد دشمنوں سے نجات حاصل کروں اور اپنی دلی خواہش
 کے مطابق یہاں ماروی کے ساتھ رہ کر محفوظ اور پر امن
 زندگی گزاروں۔“

اس نے کہا۔ ”تم اگر بڑی بولتے ہو لیکن لندن کے
 عیسائیوں والا لہجہ اور اسٹائل نہیں ہے۔ اسے سیکھنا تمہارے
 لیے بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ رہو گے تو یہ سیکھ لو گے۔
 ”میرے بیٹے کی حیثیت سے وہاں تمہارے کئی
 عیسائی رشتے دار بھی ہیں۔ وہ مزاج کے کیسے ہیں؟
 کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ تمہارے لیے یہ سب
 جاننا لازمی ہے۔ میں اہم سے ان کی تصویریں تمہیں دکھاتا

رہوں گا۔ ان سب کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا رہوں گا۔“
 ایک ملازم نے آکر کہا۔ ”دھرم داس جی آئے ہیں۔“
 ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد آئے،
 مراد کی صورت تبدیل ہو جانے کی۔ وہ دونوں کھینک کے
 وزینٹک روم میں آئے۔ دھرم داس نے اس کے بیٹے کو دیکھ
 کر حیرانی سے کہا۔ ”راہن بن اس اقم واپس آگئے؟ تم کیسے بیٹے
 ہو؟ باپ کو پانچ برسوں سے ترساتے اور پریشان کرتے
 رہے ہو؟“

مراد نے اس سے معافی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ
 مجھے اچھی طرح دیکھیں، میری یہ انگریزی لیٹگوں سنیں۔ کیا
 میں واقعی راہن بن ہوں؟“
 وہ بولا۔ ”اس میں کیا شبہ ہے؟ تم ڈاکٹر کے بیٹے
 ہو۔ میں برسوں سے تمہیں دیکھتا آیا ہوں۔“

وہ ہنسنے ہوئے ہندی بھاشا میں بولا۔ ”دھرم داس جی
 میں آپ کا سبک مراد علی مگنی ہوں۔“
 اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر نے ہنسنے ہوئے
 کہا۔ ”میری مہارت دیکھ رہے ہو۔ میں نے مراد کو نیا چہرہ
 دے کر اپنے بیٹے کو زندہ کر دیا ہے۔“

دھرم داس بالکل قریب آکر مراد کے چہرے کو چھو کر
 دیکھ رہا تھا۔ ”مراد علی، تم نے اپنے آپ کو کتنا بدل دیا ہے۔
 ہو جاتا ہے؟ ڈاکٹر اہم نے چھکار دکھایا ہے۔ مراد علی کی کو
 بالکل ہی غائب کر دیا ہے۔ دشمن تو اسے ڈھونڈتے
 ڈھونڈتے مرجائیں گے۔“
 وہ پھر اسے چھو کر بولا۔ ”وہ تمہارے اس کے سامنے
 آکر بھی اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ تم نے کمال کر دیا ہے
 ڈاکٹر!“

پھر اس نے مراد سے پوچھا۔ ”اس نئے چہرے کے
 ساتھ ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ تم ایک بہت ہی
 مشہور و معروف اور بہت ہی عزت دار ڈاکٹر کے بیٹے بن
 گئے ہو۔ تمہیں قسمت سے یہ موقع مل رہا ہے۔ ڈاکٹر کے
 ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اسلحہ جھینک دو۔ اپنے تمام دشمنوں کو
 بھول جاؤ۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دھرم جی بہت اچھی بات کہہ رہے
 ہیں۔ آج تم نے نیا جنم لیا ہے۔ آج سے تمہارا کوئی دشمن نہیں
 ہے۔ اس لیے اب نہ اسلحہ اٹھاؤ، نہ نئے دشمن پیدا کرو۔“
 مراد نے کہا۔ ”میری ماروی دل سے چاہتی ہے کہ میں
 پڑسن شہری کی طرح شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آؤں۔“
 وہ سر اٹھا کر خلا میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر

میں پڑسن دن کے اندر نیک نامی حاصل کر کے اس کے
 پاس نہیں جاؤں گا تو وہ پرانی ہو جائے گی۔
 ”میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس رب کریم
 سے وعدہ کیا تھا کہ گناہوں سے باز آ جاؤں گا اور پانچوں
 وقت کی نمازیں ادا کرتا رہوں گا۔ شکر ہے میرے
 معبود۔۔۔ اب سے میری زندگی میں بہتری آ رہی
 ہے۔ میں گناہوں سے دامن بچاتا آ رہا ہوں اور یہ تو ناممکن
 نظر آتا تھا کہ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے پاکستان جا
 کر ٹین دس لاکھوں گا کہ میں اب مجرم نہیں رہا ہوں۔ میں نے
 ہتھیار چھینک دیے ہیں۔“

”صرف وہی ہمارا معبود ناممکن ناممکن بنا دیتا ہے۔
 اب میں آزاد ہوں۔ یا اللہ۔۔۔ اب میں ہتھیار چھینک کر
 بارودی کے ساتھ شریفانہ زندگی گزار سکوں گا۔“
 ”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ جیسے ہی ایمان علی کے
 نام سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنے گا، میں یہاں سے
 پاکستان چلا جاؤں گا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دھرم داس جی! یہ آئی ڈی کارڈ اور
 پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنا آپ کے لیے گھر کی بات
 ہے۔ میرے بیٹے کا اسلامی نام ایمان علی ہے۔ کیا دو چار
 روز میں اس کے بارے میں کوئی کارڈ بنا کر ہمارے پاس
 اس نے کہا۔ ”آپ ابھی بیٹے کے لیے درخواست
 لکھیں اور اس کی تصاویر دیں۔“

وہ چپکلی بھا کر بولا۔ ”یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل
 ہے۔ کل ہی آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔“
 مراد خوشی سے کھل گیا۔ اس نے کہا۔ ”اس کا مطلب
 ہے میں اپنی ماروی کے پاس دو چار روز میں جاسکوں گا۔“
 ”بے شک جاسکو گے لیکن وعدہ کرو۔ وہاں سے بہو کو
 میرے پاس لاؤ گے۔“

”اللہ کو منظور ہو تو اسے اسی پناہ گاہ میں لاؤں گا لیکن
 کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ بات یہاں آکر ختم ہے کہ
 ماروی میرے ساتھ پاکستان یا انڈیا میں یا لندن میں
 رہے۔ اس کی وجہ سے میں اس بہروپ کے باوجود پہچان لیا
 جاؤں گا۔“

دونوں نے ہاں کے اعداد میں سر ہلایا۔ دھرم داس نے
 کہا۔ ”جہاں جاؤ گے ماروی تمہاری پہچان بن جائے گی۔“
 ڈاکٹر نے کہا۔ ”میری بہو مصیبت نہیں بنے گی۔ میں
 اس کی بھی صورت بدل دوں گا۔“
 مراد نے کہا۔ ”تمہیں ڈیڈ! میں ایسی پیاری من موہنی

سی صورت کو ملنے نہیں دوں گا۔ ایسا لا جواب قدرتی حسن نہ
 اس دنیا میں ہے نہ ہوگا اور نہ ہی آپ جیسے ماہر سرجن سرجری
 کے ذریعے ایسا حسن پیدا کر سکیں گے۔ ہم اس پہلو پر بعد
 میں گفتگو کریں گے۔ ابھی رازداری کے سلسلے میں کہنا چاہتا
 ہوں کہ ڈیڈی نے میرا یہ چہرہ بنایا ہے اور دھرم داس جی
 ہمارے رازدار ہیں۔“

”دھرم جی! آپ ماسٹر کو یو کے وفادار ہیں۔ کیا اس
 سے یہ بات چھپائیں گے کہ میں ڈاکٹر ٹینیسن کا بیٹا بن کر
 زندگی گزارنے جا رہا ہوں؟“

اس نے کہا۔ ”ماسٹر کو یو میرے کام آتا ہے۔ میں
 اس کے کام آتا ہوں۔ اس حد تک اس کا وفادار ہوں۔ ورنہ
 وہ انڈیا میں اور بہت سے اہم معاملات مجھ سے چھپاتا ہے
 میں بھی اپنے بہت سے اہم راز کی ہوا اسے لکھنے نہیں دیتا۔
 تم مجھ پر شبہ کر سکتے ہو۔ لیکن مجھ پر بہرہ و سار کرنا ہی پڑے گا
 کیونکہ ڈاکٹر کے بعد میں دوسرا رازدار ہوں۔“

وہ مراد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ”تم رفتہ
 رفتہ ٹین کر لو گے کہ میں تمہارا سچا رازدار ہوں۔“

ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رنگ ٹون نے
 مداخلت کی۔ اس نے بھی سی اسکرین کو بڑھ کر کہا۔ ”کوئی
 جتنی کال کر رہا ہے۔ اس نے ہٹا دی۔“
 لگایا۔ پھر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون ہیں آپ؟“

کسی نے کہا۔ ”میں تمہاری موت ہوں۔ اگر پوری
 زندگی جینا چاہتے ہو تو بتاؤ، مراد علی مگنی کہاں ہے؟“
 اس نے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں کسی مراد علی مگنی کو
 نہیں جانتا۔ تم شاید رنگ نمبر پر بول رہے ہو۔“

مراد اپنی جگہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دھرم داس کا منہ
 تنکے لگا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”پانچ گھنٹے پہلے
 ہمارے ایک تجربے نہیں مراد کے ساتھ تمہارے گھر سے
 نکلے دیکھا ہے۔ تم اسے چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ ہم نے
 تمہارے بی اے سے مراد کا پتا پوچھا تھا۔ اس نے بتانے
 سے انکار کیا تو اسے گولی مار دی۔ تم اس کے گھر جا کر اس کی
 لاش دیکھ سکتے ہو۔ یہ تمہارے لیے وارننگ ہے۔ اگر تم نے
 ایک گھنٹے کے اندر مراد تک نہیں پہنچایا تو اپنی چٹا کا بندھن
 بن جاؤ گے۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ دھرم داس نے
 فوراً ہی فون کے ذریعے اپنے بی اے کی خبریت معلوم کی تو
 دشمن کی دشمنی درست ثابت ہوئی۔ اس بے چارے کو کسی
 نے گولی مار دی تھی۔

مراد نے اس سے کہا۔ ”ابھی آپ اور ڈیڈی صحت کر رہے تھے کہ مجھے اسطرحیں اٹھانا چاہیے۔ اب بتائیں میں کس دل سے آپ کو دشمنوں کا نشانہ بننے دوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ ابھی اپنے اطراف سیکورٹی سخت کرلوں گا۔“

”دھرم جی! آپ نے ہیلری ہڈن کے لیے بھی سیکورٹی بڑھادی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بہن کو اغوا کر رہے تھے۔ آپ اپنی جوان بیٹیوں اور بیٹوں کو کیسے سیکورٹی دیں گے۔ وہ میری بہنیں ہیں۔ کالج اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ آپ کے بیٹے میرے بھائی ہیں۔ سرکاری عہدوں پر ڈیوٹی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت ہمیں سے ایک اندھی گولی آکر انہیں لگ سکتی ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں! آپ کے حفاظتی انتظامات دھرم کے دھرم سے رہ جائیں گے۔“

وہ اپنے صوفے پر پریشانی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایک باپ خود کو خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جوان اولاد کی طرف موت آئے۔ فون کال سے ملنے والی دھمکی کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹیاں اور بیٹے نایدہ گن پوائنٹ پر ہیں۔

”وہ بولا۔“ ”تم نے لہذا کو بھالنا تھا۔ تم سیکورٹی گاؤں سے زیادہ غیر ملکی اور گاہی اٹھادو گے۔ وہ تمہیں کو میری بیٹیوں اور بیٹوں کے قریب آنے سے روک سکو گے۔“

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”دھرم جی کے بچے میرے بچے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ میرے بیٹے ایمان علی! انہیں اسطرحیں پھینکنا چاہیے۔ میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ کچھ روز کے لیے... دھرم جی کے بچوں کی سلامتی کے لیے اسطرح اٹھاؤ۔“

وہ بولا۔ ”کچھ روز کے لیے نہیں ڈیڈی! یہ اسطرح میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ آگے جا کر دشمن مجھے نہیں پا سکیں گے تو ماروی کو اغوا کرنا چاہیں گے۔ مجھے اسطرح ہاتھوں میں رکھنا ہی ہوگا۔“

دھرم داس اپنے تمام بچوں کو فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ آج اور کل گھر سے نہ نکلیں۔ تا معلوم دشمنوں نے پی ایس کو ہلاک کیا ہے انہیں بھی گولی مار سکتے ہیں۔ وہ گھر آکر انہیں تفصیل بتائے گا کہ معاملات کیا ہیں؟

پھر اس نے فون کے ذریعے سیکورٹی گاؤں کو بلا دیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ موٹر سائیکل پر دور تک جاؤں گا، چاروں طرف دیکھوں گا۔ جو لوگ مشکوک

نکلیں گے، انہیں دور سے نشانے پر رکھوں گا۔ جب آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے تو میں واپس آ جاؤں گا۔ آپ بچوں کے متعلق بتائیں وہ کہاں ہیں۔“

”ایک بیٹی اور تین بیٹے گھر میں ہیں۔ بڑی بیٹی پریمنا پر کینیکل کلاس اسٹڈز کرنے گئی تھی۔ وہیں ڈکی رہے گی۔ میں دو گاؤں کو بھیج رہا ہوں۔“

”آپ پریمنا سے پولیس، وہیں گاؤں کے ساتھ رہے۔ جب میں وہاں پہنچوں تو کالج سے نکلے۔“

دھرم داس بیٹی کو کال کرنے لگا۔ مراد نے اپنے رپوالہ کو چیک کیا۔ اسے لباس کے اندر چھپایا۔ دو فاضل میگزین جیبوں میں رکھے پھر ہیلمٹ پہن لیا۔ اس طرح اس کی صورت کسی کو نظر نہ آئی۔ پھر وہ کلینک سے باہر آ گیا۔

وہ موٹر سائیکل کے پاس آکر دو رنگ نظر میں دروازے لگا۔ سامنے بچوں کا پارک تھا۔ شام کے وقت بچے کھیل رہے تھے۔ اس کے بعد ایک شاہراہ کھڑک سکھ گئی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ادھر جانے لگا۔ وہ پارک کے ایک طرف گھوم کر جا رہا تھا پھر نہیں گزے کہ فاصلے پر جا کر رک گیا۔ پارک کے اس حصے میں لڑکیاں اور لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ تالیاں بجا رہے تھے۔

وہ بے غار قیادت سے کھینچنے کے لیے اپنے ایک دورنگ نظر میں دروازے کا پارک تھا۔ شام کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اب تب میں رات کی تاریکی چھانے والی تھی۔

وہاں ایک جالی دار بیچرہ تھا۔ بچے اس بیچرے میں کھس کر بیٹھے ہوئے دور تک جاتے ہوئے بیچرے کے دوسرے سرے سے باہر نکلتے تھے۔ اب بچوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے باعث وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ ایسے وقت مراد نے دو مشکوک افراد کو اس بیچرے میں دیکھا۔

وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے ریختے ہوئے بیچرے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ اس دوسرے سرے کا رخ ڈاکٹر کے کلینک کی سمت تھا۔

کلینک سے صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ دھرم داس دروازہ کھول کر باہر گاڑی میں بیٹھے آتا تو گاڑی تک پہنچنے سے پہلے بڑی آسانی سے ٹارگٹ بن جاتا۔

قاتلوں کے قرار ہونے کے لیے پارک کے احاطے کے باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ احاطے کے باہر جہاں مراد تھا وہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو دھکیلتا ہوا بیچرے کے دوسرے سرے کے سامنے

آ گیا۔ احاطے کی دیوار نے اور تاریکی نے اسے چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں شوئرز صاف نظر آرہے تھے اور بہت ہی ایڈی ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔

اس نے فون پر کہا۔ ”دھرم جی! آپ اپنے گاؤں کا انتظار نہ کریں۔ آپ دروازہ کھول کر ابھی اسی وقت کلینک سے باہر آئیں۔ میں آپ کے قریب ہی رہوں گا۔“

اس نے فون بند کر کے اسے جیب میں رکھا پھر رپوالہ کو کال کر دونوں ہاتھوں سے تمام لیا۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر دھرم داس کے باہر آتے ہی وہ گولی نہ چلا دیا تو اس کا نشانہ ہو چک جاتا تو دشمنوں کی گولوں سے لگی ہوئی گولیاں باہر آنے والے ایم این اے کا کام تمام کر دیتیں۔

ہوسکتا تھا، وہ اسے جان سے نہ مارتے زخمی کرنے کے بعد اس سے مراد کا پتا پوچھتے رہتے۔ اس وقت انہوں نے اپنا اسلحہ ایک تختے میں چھپا رکھا تھا پھر جیسے ہی کلینک کا دروازہ کھلا، انہوں نے پھر سے اپنی نہیں باہر نکال لیں۔

ان دونوں کی گولوں میں ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ نشانہ کھانا نہیں ہوسکتا تھا۔ ان سے پہلے ہی مراد ان کی ٹانگ میں احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا۔ گولی ایک کی کھوپڑی

میں سون گئی۔ دوسری گولی گھر گئی۔

دوسرا شوئرز بیک گیا۔ چشمہ دونوں میں چھپ گیا کہ کسی نے نشانے پر سے۔ ایسی پوزیشن میں فوراً جگہ بدلی تھی۔ وہ وہاں سے اچھل کر ایک کھمبے کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن اچھلنے کے بعد گولی کھا کر زمین پر واپس آیا اور تکلیف سے جڑنے لگا۔

فون سے رنگ ٹون ابھرے گئی۔ اس نے اسے کان سے لگا لیا۔ دھرم داس نے واپس اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے باہر آنے کو کہا تھا۔ وہاں نہیں سے گولیاں چل رہی ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے گولیاں چلائی ہیں۔ جو آپ کو قتل کرنے آئے تھے، ان میں سے ایک مر گیا ہے۔ دوسرا شاید زندہ ہے، زخمی پڑا ہے۔ سامنے پولیس فوراً اسے اسپتال لے جا کر انکوائس کریں کہ وہ کس خطرناک گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، اس کی شامت آگئی۔ ایک گولی اس کے ہیلمٹ سے ٹھن کی آواز کے ساتھ گرائی ہوئی خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی گز گئی۔ وہ دھپ سے زمین پر گر کر لڑکھٹا ہوا احاطے کی دیوار سے لگ گیا۔

آدھائی گز آدھائی گز دور تک شامت تاریکی میں

دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی دور تاریکی میں جیسے شعلہ سا پڑا، ایک گولی چلی۔ اس کے سامنے کسی کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ فائرنگ کی زد میں آئی۔ اس گاڑی نے آنے والی گولی کو روک لیا تھا۔

اسی لمحے میں مراد کے رپوالہ سے لگی ہوئی گولی نے کسی کو آخری بار چیتنے پر مجبور کیا۔ دوسرا بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کی سمت متواتر گولیاں چلانے لگا۔ ایک فائر دوسرا فائر پھر تیسرا... آخر چوتھے فائر پر بھاگنے والا گر پڑا۔

ایسے وقت پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی کلینک کے سامنے آکر روک گئی تھیں۔ مراد فوراً ہی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے سنے روپ میں ایمان علی کو گن فائر کے طور پر دیکھے۔ اس نے دور جا کر فون پر دھرم داس سے کہا۔ ”یہ یاد رکھیں۔ کسی سے نہ پولیس کو ڈاکٹر مینسن کے بیٹے نے ان قاتلوں سے مقابلہ کیا ہے۔ آپ انجان بن جائیں۔ یہ کہہ دیں کہ آپ کلینک کے اندر تھے باہر نہ جانے کن لوگوں کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی تھی۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”بہت خوب مراد...! میں تمہیں اس کی سزا دے گا۔“

مراد نے بات کرلوں گا۔

وہ فون کو جیب میں رکھ کر تیزی سے ہائیک دوڑاتا ہوا ایک ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ صبح ناشتے کے بعد کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک میز پر آکر کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے فون پر ممبر شپ کرنے لگا۔

☆☆☆

ماروی نئے شہر اسے کھیل رہی تھی۔ محبوب ایک گھنٹے بعد ڈنر کے لیے آنے والا تھا۔ اس کے نصیب میں مہاد کے ساتھ کھانا چینا نہیں تھا۔ وہ دن رات اس کے بچے سے ملتی رہتی تھی۔ اس نے سرگھما کر اپنے فون کو دیکھا۔ رنگ ٹون اسے بلارہی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے فون کو اٹھایا۔ دل کہہ رہا تھا مراد آ رہا ہے اور واقعی وہ اسے یاد رکھتا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ گویا دل سے لگایا۔ دل والے نے پوچھا۔ ”میری جان! کیسی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں یہ غور سوچو۔“

”ثناء اللہ جہادی کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بات سن رہا ہوں۔ تم سے مشورہ کرنے اور تم سے

اجازت لینے کے بعد چہرہ تبدیل کر چکا ہوں۔ آج سے کوئی دوست اور دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ تمہارے سامنے آؤں گا تو تم بھی مجھے اپنی جھوٹی "میرے سامنے آؤ اور آزماؤ۔ میں کوڈ ورڈ کے ذریعے تمہیں پہچان لوں گی۔ یہ تم ہے چہرہ بدل کر بہت اچھا کیا ہے۔ اب تو وہ دشمن تمہارے پیچھے آئیں گے نہ تمہندوق انٹاؤں گے۔"

"ہندوق تو میرے مقدّر میں لکھ دی گئی ہے۔ چہرہ بدلنے کے بعد میں محفوظ ہو گیا ہوں لیکن تم غیر محفوظ ہوئی ہو۔ دشمن جانتے ہیں کہ تم میری جان ہو۔ میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ وہ تمہیں کن پوائنٹ پر انڈا کر کے نہیں لے جائیں گے۔ پھر تم سمجھ سکتی ہو۔ وہ درندے تمہاری زندگی کا سودا مجھ سے کریں گے اور مجھے کن پوائنٹ پر آنے کے لیے مجبور کر دیں گے۔"

"یا اللہ! یہ نئی بات کیا کہہ رہے ہو؟ عقل کبھی ہے دشمن ایسا ضرور کریں گے۔ پھر کیا ہوگا مراد؟"

"میں تو کہہ رہا ہوں کہ ہندوق چھپک نہیں سکتا۔ آئندہ تمہارے لیے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تم پر آج نہیں آنے دوں گا۔ یاد رکھو، سب سے زیادہ خطرہ میری طرف سے ہے۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ اگر تم میری بات نہ مانتے ہو تو میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اس کے سامنے گھٹنے فیک دوں اور اس کے ساتھ بھی ازاد دینی زندگی گزاروں۔"

ماروی نے ناگواری سے کہا۔ "وہ کیسی بے شرم عورت ہے۔ کیا شرم اور شرافت اسے چھو کر نہیں گزری ہے؟"

"وہ مغربی ماحول کی پروردہ ہے۔ تم اطمینان رکھو اب وہ نہ مجھے پہچان سکے گی، نہ آئندہ میری مجبوریوں سے کھیل سکے گی۔ میں تمہیں اس کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔"

"کیا تم اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے یہاں آ سکو گے؟"

"انشاء اللہ! آج نہیں تو کل یا پھر چوتیس دنوں کے اندر ضرور آؤں گا۔"

"آؤ جاؤ گے لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آئے ہو؟"

"تمہاری تو صورت بدل گئی ہے۔ کیا انہیں بتاؤ گے کہ تم نے نئے چہرے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے؟"

"ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ مجیب وغیرہ کو میرے چہرے کی تبدیلی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہاں آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔"

ویس اس کے سامنے کھانا لا کر رکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ ماروی بول رہی تھی۔ "خود کو یہاں آؤ ظاہر کرنا ہوگا کہ تم مراد ہو اور جرائم کی دنیا سے نکلنے کے لیے چہرہ بدل چکے ہو۔"

"مجبوب کو بتانے کا مطلب یہ ہوگا کہ معروف صاحب کو، میرا کو اور حماد صدیقی کو معلوم ہوگا۔ میرا چہرہ تبدیل ہونے کا راز کھلتا جائے گا۔ دشمنوں کو چھٹک لے گی تو پھر وہی دشمنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ وہی بھاگ دوڑ وہی پریشانیں مزید تو جان کو آجائے گی۔ فی الحال اسی میں بہتری ہے کہ میں سنے بہرہ میں جب تک چھپ سکا ہوں چھپا رہوں۔"

"مجبوب پوچھیں گے کہ تم کہاں ہو؟ اور ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئے ہو؟ پھر تو وہ دو تاریخ کو مجھے دہن بنانے کے حق دار ہو جائیں گے۔"

"ہاں۔ یہ بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ حل نہ ہوا تو تمہیں پرانا ہونا پڑے گا اور ایسا نہیں ہونے نہیں دوں گا۔"

"نہیں مراد! حقائق کو تسلیم کرو۔ تمہاری پارسیا کی یقین صرف میں کر رہی ہوں۔ تم نے چہرہ بدلتے ہی مراد سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اب تم مجرم کہلانے والے مراد علی سنگی نہیں ہو۔"

"میں نے یہاں تک مجبوب کو اور معروف صاحب وغیرہ کو معلوم ہونے چاہئیں معلوم نہیں ہوگا اور تم گناہ گار اور مجرم کہلاتے رہو گے تو میں زبان ہار جاؤں گی۔ پھر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھے مجبوب سے نکاح قبول کرنا ہوگا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے، میرا فیصلہ کن لو۔ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ تک کوئی تدبیر سوچتا رہوں گا۔ جب دوسرے دن دو تاریخ کو دیکھوں گا کہ تم پرانی ہونے والی ہو تو مجبوراً خود کو ظاہر کروں گا۔ یہ ثابت کر دوں گا کہ چہرہ بدل کر میں نے مجرمانہ زندگی بدل دی ہے اور اب میں گناہ گار بھی نہیں رہا ہوں۔"

"اس کے بعد تمہارے پرانے دشمن پھر سے پیدا ہو جائیں گے اور تمہاری زندگی عذاب بنائیں گے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھ پر جو بھی قیامت گزرے میں تمہیں پرانا نہیں ہونے دوں گا۔"

"مراد! کچھ ایسا کرو کہ جتنی جلدی ہو سکے چپ چاپ یہاں آ کر مجھے لے جاؤ اور کہیں چھپا کر رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کسی بند کوٹھری میں زندگی گزار لوں گی۔"

"میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ تمہیں رازداری سے

یہاں لے آؤں یا لندن لے جاؤں۔ ابھی بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہے۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں پھر کسی وقت کال کروں گا۔"

وہ کھارہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے کہا۔ "یہ اچھی طرح جانتی ہوں دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔ ہائے مراد! میں تم سے جتنا پیار کروں گی اتنا ہی کم ہوگا۔ میں دل ہی دل میں تم پر قربان ہو رہی ہوں۔"

"ایسی پیار بھری باتیں کرو گی تو ابھی بھاگ کر چلا آؤں گا۔ پانی دادے، یہ یاد رکھو اب میرا فون نمبر بدل جائے گا۔ یہ سیم نکال کر چھپک دوں گا۔ اگلی کال سننے نہ رہے آئے گی۔ خدا حافظ۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ماروی کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اگر وہ جلد پاکستان نہ جاسکا تو ماسٹر کو بوبوکو اس کی ملاقاتی اور مضبوط سکیورٹی کے لیے بولنا ہوگا۔

وہ آخری فقرہ چراتے ہوئے دل ہی دل میں بولا۔ "اللہ نے چاہا تو کل جج ہونے تک ماروی کے چاروں طرف سکیورٹی کی آہنی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔"

وہ کھاتے ہوئے بعد پانی پیتے گا۔ اسے وقت دھم داس نے اسے کال کی۔ وہ فون کو اٹھانے سے لگا رہا بولا۔ "میں دھرم دی! وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ بچا کھلا کر وہ دشمن کون تھے؟"

اس نے کہا۔ "تم نے تمہارا چہرہ زکوہ کر لیا ہے۔ ان میں سے ایک زندہ ہے۔ بری طرح زخمی ہے۔ وہ مقامی باشندہ ہے۔ سنڈیکیٹ ریڈارٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔"

"مراد! پتا نہیں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ آج صبح بٹری ہڈن پر ڈیجیٹل ریکٹ کے شوٹر نے حملہ کیا تھا۔ اس کی بین لیئر انگوٹھا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی تمہارا پتا پوچھ رہے تھے۔ یہ ریڈارٹ والے بھی پوچھ رہے ہیں۔ بہر حال تم کالج جاؤ۔ وہاں میرے دو دشمن مین گاڑی لے کر گئے ہیں۔ تم جاؤ گے تو پرینما کالج سے باہر آئے گی۔"

"میں ابھی جا رہا ہوں۔ آپ ماسٹر کو بوبوکو میرے اور اپنے حالات بتائیں۔ میں پرینما کو سکیورٹی دینے کے بعد ماسٹر سے بات کروں گا۔"

دھرم داس نے اسے پرینما کا فون نمبر بتایا۔ وہ رابطہ ختم کر کے کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد ریستورنٹ لے آیا اور کالج کی طرف جانے لگا۔

برسر اقتدار پارٹی کے ایک اسم این اسے پر قاتلانہ

حملہ ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تمام پولیس اور سی آئی اے والوں نے ریڈارٹ اور ڈیجیٹل ریکٹ کے زرخیز شوٹروں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ دھرم داس۔ پریس والوں کو بیان دے رہا تھا کہ خطرناک تحقیقوں اور انڈر ورلڈ والے کسی مراد علی سنگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے بوبو کے اسمیس کے تنظیم بھری ہڈن پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مراد علی سنگی کو نہیں چھپایا ہے۔ کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ میں پاکستان سے آنے والے کسی جاسوس کو چھپا کر رکھوں گا۔ ان خطرناک تنظیموں کے سربراہوں سے بات کی جائے۔ انہیں حکم دیا جائے کہ ہمارے دیں سے نکل جائیں ورنہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور وہ جو مراد علی سنگی پاکستانی جاسوس ہے اسے بھی جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ ہم دیس بھگت ہیں۔ دیس کے دشمنوں کو یہاں سانس بھی لینے نہیں دیں گے۔"

مراد اس دیس بھگت کی مٹی کو سکیورٹی دینے کے لیے کالج کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ سونہرے سا رنگ سے مسجد میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون نے اس کی توجہ کو پکارا۔ اس نے فون کو دیکھا۔ ایک نا نمبر تھا۔ اس نے اسے کال سے لگا کر پوچھا۔ "کیا ہے؟"

دوسری طرف سے بہت ہی محرم آواز سنائی دی۔ "راہن! یہ تم بول رہے ہو نا؟ ڈیڈی نے تمہارا نمبر دیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں کبھی راہن نہ تھا، اب ایمان علی ہوں۔"

وہ بولی۔ "تم ایسے والی ریڈ کوئی سا بھی نام رکھ لو، میرے ساتھ گزارے ہوئے پیار بھرے لمحات تو یاد ہوں گے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ دیکھو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے کالج کے سامنے والی مسجد میں جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد فون کروں گا تو تم کالج سے باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھو گی۔"

"تم بھی میرے ساتھ بیٹھو گے نا؟"

"میں اپنی سونہرے سا رنگ پر درو سے گمرانی کرتا رہوں گا۔ آدھے گھنٹے تک یہ فون بند رہے گا۔" اس نے فون کا سوچ آف کر کے اسے جیب میں رکھا پھر ذریعہ کلمہ پڑھتا ہوا مسجد کے اندر چلا گیا۔

پرینما کالج کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی، اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اس کے یار راہن سن کی آواز بند

TSR watermark image.com Registered version

نئے سال کا پہلا شمارہ اہمیت کا حامل شمارہ

سرگزشت

ماہنامہ

شکوہ سخن

اس شاعر کا زندگی نامہ جسے کالا پانی کی سزا ہوئی تھی

کیسے کیسے لوگ

انوکھی شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف

سمندر کے بھید

سمندر کی انوکھی دنیا کے رنگ عجیب ہیں

فکر و خیال

اس فنکار کی سرگزشت جس نے فن میں نام پیدا کیا

مایا

اندرونِ سندھ سے ایک انتہائی

دلچسپ و سبق آموز ج بیانی

ادبیات

”سرب“ جیسی لہو گرم کردینے والی طویل کہانی
”دلنی الف لیلہ“ جو خود میں تاریخ ہے
”لوہو“ ایک ایسی سفر کہانی جو حلویت کا خزانہ ہے

ادب

ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات
انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
آج ہی خود کی ایک اسٹال پر پرچہ شخص کرا لیں

”یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم میرے ساتھ بیٹھنے کی حذر کر رہی ہو۔ تمہارے ڈیڈی پر قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ میں دور رہ کر سیکورٹی دوں گا۔ چلو باہر نکلو۔“

”پلیز رابن سن! میری بات مان لو۔ تم نے میری پہلی شلہ کے گھر میں میرے ساتھ رات گزاری تھی۔ اب اگر ہم اسی گھر میں جا سکیں گے۔ وہاں تمہاری میں دو چار کچے گز اریں گے۔ میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ شیلہ نے مجھے روک لیا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہوتا چاہیے کہ میں اب رابن سن نہیں رہا۔ میرا مذہب ’میرا سن‘ مزاج سب بدل چکا ہے۔ میں عورتوں کے سامنے سے دور رہتا ہوں۔“

”تم نے مجھے لڑکی سے عورت بنایا ہے۔ اب مذہب بدل کر مجھ سے نہ بھاگو۔ اپنی موٹر سائیکل دو لوں گا ریزہ زار۔“

”میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔“

اس نے فون بند کیا پھر دھرم داس سے رابطہ کر کے بولا۔ ”دھرم جی! میں آپ کو پریسنا کے بارے میں ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ پانچ برس پہلے رابن سن سے اس کے رومانس چل رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار چکا ہے۔“

”دھرم جی! میں آپ کو اس کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ وہ مجھے رابن سن سمجھ کر خد کر رہی ہے کہ ابھی ایک نیکی کے گھر جا کر میرے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے گی۔ میں نے انکار کیا ہے تو وہ کالج سے باہر آئے سے انکار کر رہی ہے۔ کہتی ہے میں اس کی بات مانوں گا تو گاڑی میں آکر بیٹھوں گی۔ ورنہ میری سیکورٹی میں نہیں جائے گی۔ آپ اسے سمجھائیں۔“

دھرم داس نے فوراً ہی مراد سے رابطہ ختم کر کے بیانی مخاطب کیا۔ پھر پوچھا۔ ”رابن سن کے ساتھ تمہارا کیا چکر تھا؟“

”وہ بولی۔ ”ڈیڈی! میں اسے جانتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ گھر آکر آپ کو یہ بتانے والی تھی کہ وہ تو پہنچ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ مسلمان ہو گیا ہے۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ وہ مسلمان ہوتے ہی بدل گیا ہے۔ میرا دل توڑ رہا ہے۔“

وہ اتر کر رہی تھی کہ رابن سن کے ساتھ اس کا چکر چلتا رہا تھا۔ باپ نے پریشان ہو کر کچھ سوچا پھر کہا۔ ”تم کو تو میں تمہاری خبر نہیں گا۔“

”پلیز دھرم جی! میں ڈیڈی...! کیا آپ نہیں جانتے کہ

ہو گئی تھی۔ اس نے پھر اس کا نمبر ری ڈائل کیا۔ پتا چلا فون بند ہے۔ وہ کہہ چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کال کرے گا۔

وہ اسے تصویر کی اسکرین پر دیکھنے لگی۔ رابن سن چھ فٹ سے بھی اونچا ایک محنت مند جوان تھا۔ لڑکیاں اس کی خوب روٹی پر مری تھیں۔ وہ دین اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک کھلنڈ راپلے ہوا تھا۔ حسین لڑکیوں کو خوش کرتا رہتا تھا۔ اس نے پریسنا سے بھی خوش کرنے والی دو چار ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ اس کی دیوانی ہوئی تھی لیکن پھر اچانک ہی رابن سن بدل گیا۔ لڑکیوں سے کٹ کر آئے لگا۔ اس نے پریسنا سے کہا۔ ”مجھے بھول جاؤ۔ میں نے گناہوں سے توبہ کی ہے۔ میں اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے والا ہوں۔ اس سے پہلے میں تمام غلطیوں سے پاک ہو جا چکا ہوں۔“

اگر وہ تنہائی میں یہ بات کہتا تو پریسنا بھی اس کا چھپچھا نہ چھوڑتی۔ پیاس بھجا کر رہتی لیکن اس نے ایک ریسٹورنٹ میں یہ کہا تھا اور اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے دین اسلام قبول کیا ہے اور باپ نے طیش میں آکر اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ان دنوں وہ انیس برس کی تھی۔ اب چوبیس کی ہو گئی تھی۔ اس نے پانچ برس بعد

”تمہارے گھر ہو گا یا تمہارا“

وہ سمجھ میں تھا نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔ ”یا میرے پاک پروردگار! میں گناہوں سے بچنے کی کوششیں کر رہا ہوں اور تو مجھے میری نیک نیتی کا بھرپور صلہ دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے کہ مجھے گناہوں سے دور کر رہا ہے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑتا ہوں۔ آج پھر آزمائش سے گزرنے والا ہوں۔ پتا نہیں پریسنا کسی لڑکی ہے اور کس حد تک جائے گی۔ تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔ تو ہی غلطیوں سے اور گناہوں سے بچانے والا ہے۔“

وہ دعا مانگ کر زبردستی آتیشیں پڑھتا ہوا مسجد سے باہر آیا۔ اس نے فون نکال کر اس کا سوچ آن کیا پھر پریسنا سے رابطہ کر کے بولا۔ ”اپنے گاؤں کے ساتھ باہر آکر گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور اپنے گھر کی طرف جاؤ۔“

اس نے خلاف توقع کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”تم میرے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھو گے تو میں یہاں سے نکلوں گی۔ تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی ڈیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

جارے تھے۔“

مراد نے بالکل سادہ سا کہہ دیا۔ ”اگر تم میری طرح پیشہ ور شوہر ہو تو سن لو میں ڈیجیٹل ریسیٹ کا ایک شوہر ہوں۔ وہ دیکھو دھرم داس کی بیٹی گاڑی میں بیٹھ کر جارتی ہے۔ میں اسے زخمی کرنے یا ہوس کا تو اسے اغوا کرنے آیا ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہو۔ کیا تمہارا اسے اغوا کر سکو گے؟“

”نہ کر سکا تو زخمی ضرور کر دوں گا۔ وہ جا رہی ہے۔ تمہارا بھی یہی مقصد ہے تو دیر نہ کرو۔ وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں ریڈیو الارٹ کے لیے کام کر رہا ہوں۔ چلو ایک سے دو بیٹھے۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اسے زخمی کرنے میں کامیاب ہوگا تو ریڈیو الارٹ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

وہ دھرم داس کو صرف دھمکی دینے کے لیے اس کی بیٹی کو زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تو پھر چلو۔ دیر نہ کرو۔“

وہ شوہر دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی بانکس کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا۔ پھر رفتار بڑھا کر آگے جانے والی گاڑی کے پیچھے ہو گئے۔

مراد نے بڑی چال بازی سے دھرم داس کو ہتھکڑیاں لیا تھا۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ ایک لڑکی کو زخمی کر کے بھاگنے کے لیے ایک ہی شوہر کافی ہوتا ہے۔

وہ اپنی موٹر سائیکل کو دوڑاتے ہوئے مراد کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”اس گاڑی میں دو گن مین ہیں۔ اگر ہم کسی طرح انہیں ختم کر دیں تو لڑکی کو لے جائیں گے۔ اسے اغوا کرنے سے مجھے وہیل ہیمنٹ ملے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”مجھے بھی وہیل ہیمنٹ ملے گی۔ چلو آج ہم وہیل کمانی کریں گے۔“

وہ بولا۔ ”اگر ہم گاڑی کے پینوں پر فائر کریں تو یہ آگے نہیں جاسکیں گے۔ گاڑی سے نکل کر ہم پر فائر کریں گے ہم جوانی فائرنگ سے انہیں ہلاک کر سکیں گے۔ کیا ان سے مقابلہ کرو گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں، مقابلے میں ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔ چلو گاڑی کو ناکارہ بناتے ہیں۔ پھر ہم ان سے دور جا کر دیکھیں گے کہ اس کے گاڑی کیا کرتے ہیں؟“

”تو پھر اسپرڈر بڑھاؤ، اس کا رے قریب ہو کر پینوں پر گولیاں چلائی ہوں گی۔“

اس مقصد کے لیے دونوں نے رفتار بڑھائی۔ پھر

مراد نے اچانک رفتار کم کر دی۔ اس طرح وہ آگے کی گلیاں گیا۔ مراد نے فوراً ریو اور نکال کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ پینوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ بیک وقت دونوں نے گولیاں چلائی۔ آگے جانے والا گولی کھا کر موٹر سائیکل سے اچھلا۔ پھر نیچے سڑک پر آ کر دوڑتک لڑھکتا چلا گیا۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ ادھر ایک گاڑی نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کسی فائر کے۔ لیکن وہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ گولیاں یوں ہی ہوا میں چلتی رہیں۔

مراد موٹر سائیکل روک کر اتر گیا۔ دور جانے والی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بس ہوئے شوہر کے پاس آیا۔ گولی اس کے شانے میں گئی تھی لیکن پتھر کی سڑک پر اچھل کر گرنے اور لوٹنے کے بجائے ہڈیاں بچ رہی تھیں۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مراد نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”فون نکالو اور اپنے پاس رکال کرو۔ کم آن ویر نہ کرو۔“

اس نے تکلیف سے کہا۔ ”ابو بھائی! میں نارائن بول رہا ہوں۔ یہ نہیں ہے۔ کون ہے اس نے مجھے دھوکا دیا ہے؟“

مراد نے اس کے فون پر زور دیا۔ ”اس فون پر کون ہے؟“

کہا۔ ”اچھا تو تم انڈیا میں ریڈیو الارٹ کے ایجنٹ ہو۔ میں نے تمہارے پہلے آقا مسٹی الارٹ کو اس شہر میں کوئی مادی گئی۔“

”اب تمہارے دوسرے آقا مسٹی براؤن کا نام ہے۔“

گا کہ اس کے درختوں جاں نثار اسی طرح حرام موت مرتے رہیں گے۔ چنانچہ وہ اور کتنوں کو قربانی کا کبرا بناتا رہے گا۔ اپنے اس آقا سے بولو یہاں آئے اور اپنے بھائی کا اور بہنوئی برنارڈ کا انتقام مجھ سے لے۔

”اور بابو بھائی! غیر ملکیوں کے غلام...! آج کے بعد تو بھی گیا۔ اپنی سانسیں نکلتے رہتا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر سڑ سے بولا۔ ”یہ بابو بھائی کہاں رہتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”چاندنی چوک پر رہتا ہے۔ بہت مشہور ہے۔ سب ہی اسے جانتے ہیں۔ مجھے کسی طرح اسپتال پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

مراد نے پوچھا۔ ”میں کیوں احسان کروں؟“

زندگی میں کوئی اچھا کام کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو ایک بے قصہ لڑکی کو زخمی کرنے اور اغوا کرنے کیوں آئے تھے؟

اس نے جواب سے بغیر اسے گولی ماری۔ پھر اب

میٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے ڈاکٹر ڈیڈی کے بیچلے میں آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں دعا میں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے واپس آ جاؤ۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”خدا نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ میں خیریت سے آ گیا ہوں۔“

”مجھ سے اسی طرح انگریزی میں بولا کرو۔ میرے لیے اور مسائل پر توجہ دیتے رہو۔ لوگوں کو یقین ہونا چاہیے کہ تم برطانوی انگریز ہو اور واقعی ڈاکٹر مین کے مسلمان بیٹے ایمان علی ہو۔“

وہ ہنسنے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مینی سن نے کہا۔ ”میں تمہارا بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ وہاں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔ نیند آئے تو سو جاؤ۔“

وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے بیٹے رابن سن کے بیڈ روم میں آ گیا۔ آرام دہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنی ہونے والی بیوی کو فکر کریں ڈیڈی...! میں اسے وہاں سے ڈال آیا تو دشمن اسے ضرور نقصان پہنچائیں گے۔“

”تم اسے کسی طرح پاکستان سے... یہاں لے آؤ۔ پھر میں جاہوں گا کہ تم دونوں لندن جا کر رہو اور دشمنوں سے دور سکون سے زندگی گزارتے رہو۔“

”بہت مشکل ہے ڈیڈی! میں ملک میں بھی میرے ساتھ رہے گی میری ذات بچان بنی رہے گی۔ دوست اور دشمن سب ہی کہیں گے کہ اس کے ساتھ رہنے والا مراد علی سنگی ہی ہے۔“

اسی وقت ماروی نے کال کی۔ مراد نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”یو لو مراد کی جان! کیسی ہو؟“

جواب معلوم ہے کہ میرے بغیر اور کیسی ہوگی۔ آہٹ پہ کان لگے رہتے ہیں۔ درپے نظر رہتی ہے اور آنے والا نہیں آ رہا ہے۔“

”میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ یہاں آنے کی جلدی نہ کرو۔ لیکن دو تاریخ سے پہلے ایسی خوش بلائنگ کے ساتھ آؤ کہ مجھے یہاں سے لے جا سکو۔“

”میری جان...! مجھے میری یہ طرف سے زیادہ اندیشہ ہے اس لیے جلدی آنا چاہتا ہوں۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ میری فرمائش پر مجبور یہاں جدید انیکٹر وکل حفاظتی انتظامات کر رہے ہیں۔ کوئی بھی کوئی کے احاطے کی دیوار پر چڑھے گا تو یہاں اندر چارلی دی اکرین پر نظر آ جائے گا۔ کوئی دروازے اور کھڑکیوں کے قریب آئے گا تو خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ میں ایسے

انتظامات سے بہت مطمئن ہوں۔“

”محبوب نے سیکورٹی کا رڈز کی تعداد بڑھا دی ہے۔ تین گاڑیوں دن رات چھت پر الارٹ رہتے ہیں۔ چھ گاڑی زاحاطے کے اندر کوئی کے چاروں طرف بکھیر لگاتے رہتے ہیں۔ مراد...! یہاں تو اب کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔ مزید کا باپ بھی یہاں نہیں آ سکے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”جب ایسے خوش انتظامات ہو رہے ہیں تو میں بھی پوری طرح مطمئن رہوں گا۔“

”لیکن یاد رکھو تمہیں دو تاریخ سے پہلے یہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔“

”بے شک تم میری ہو۔ صرف میری ہی رہو گی، میں دو تاریخ سے پہلے آؤں گا۔“

اسے فون پر اپنے بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ماروی اسے گود میں اٹھا کر پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میرا بچہ خند میں چوک کر اٹھا ہے۔ پتا نہیں اتنے سے بچے ایسا کیا خواب دیکھ لیتے ہیں کہ ڈر جاتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈیڈی! ماروی کی طرف سے فی الحال اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بہت مطمئن ہو گئی ہیں۔ اب جلدی نہیں ہے۔ میں دس بارہ دن بعد بھی وہاں جاسکتا ہوں۔“

”یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ کل تمہارا پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ لندن چلو۔ میرے بیٹے کی حیثیت سے اپنے تمام رشتے داروں سے ملو۔ میں تمہیں الیم سے ان سب کی تصویریں دکھاؤں گا۔ ویڈیو متحرک فلم کے ذریعے تم شادی بیاہ اور کرسمس ڈے کی تقریبات میں تمام رشتے داروں کو ہنسنے بولنے دیکھو گے اور انہیں یاد رکھو گے۔“

وہ بولنے بولنے رک گیا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے ہوئے دروازے پر ایک بونا کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ! تم...؟“

عبداللہ نے مراد کو دیکھ کر خوشی سے چیخ ماری۔ ”میرے دوست رابن سن...! نہیں، ایمان علی تم آ گئے؟“

وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلانے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ بونا اتنا چھوٹا تھا کہ مراد کو اس سے گلے ملنے کے لیے اٹھنا نہیں پڑا۔ وہ بیٹھا رہا۔ عبداللہ آ کر اس کے گلے لگ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تمہارے بچپن کا یار عبداللہ ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ کوئی سات برس پہلے دو بد معاش تم سے الجھ رہے

TSR Watermark Images - Unregistered version

تھے۔ عبداللہ نے ان کی خوب پٹائی کی تھی۔ یہ بہت زبردست فائز ہے۔ یہ جوڈو کرانے اور جمناسٹک کے کربت بھی جانتا ہے۔

عبداللہ نے حیرانی سے کہا۔ ”انکل! آپ اسے میرے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں؟ کیا یہ مجھے بھول گیا ہے؟“

”ہاں بچے! انکس ہی بات ہے۔ یہ بچہ بھلی بہت سی باتیں بھول گیا ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“

عبداللہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ڈونٹ وری مائی فرینڈ! تم اپنے ڈیڈی کے پاس اور اس دوپانے دوست کے پاس آگے ہو۔ ہم تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلادیں گے۔“

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”تم یہ بتاؤ اسے دونوں تک کہاں رہے؟ تقریباً ایک برس بعد آئے ہو۔“

”کیا بتاؤں انکل! اول ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو صوبہ یار آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے سے بھی مل کر نہیں گیا۔ اس کے بعد میری جان میری محبوبہ کینسر کے مرض میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔“

وہ سر جھکا کر قریبی صوفے کے پاس گیا۔ وہ صوفاس کے قد سے اونچا تھا۔ وہ اچھل کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم بڑی دنیا میں اکیلے ہو۔ سوچ رہا تھا مجھے جا کر افسوس میں کام کروں گا میں میرا یاد اور اس آگیا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

ڈاکٹر اس کی باتیں سن رہا تھا اور دور تک سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”عبداللہ! تم غضب کے فائز ہو۔ اکیلے دو چار پر بھاری پڑتے ہو۔ یہ بتاؤ کبھی تم نے گن چلائی ہے؟“

”انکل! میں اڑتی چڑیا کو مار کر مارتا ہوں۔ بچپن سے میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ میرا قد چھوٹا ہے۔ کیوں نہ میں ایسے ہنر اور ایسے کمالات سکھ لوں جن کے ذریعے دوسروں سے برتر ہو جاؤں۔ قد آدھ لوگوں کو مات دے کر ان سے اونچا ہوتا رہوں۔“

ڈاکٹر نے مراد سے کہا۔ ”بیٹے! تم اسے آزما کر دیکھ لو۔ یہ واقعی تیز طرار اور بے باک فائز ہے۔ تمہارا بہترین ساتھی اور محافظ بن کر رہا کرے گا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”انکل! اس سے کیا پوچھتے ہو؟ میں خود اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اب اسے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر آ جاؤں گا۔“

”یہ لندن جانے گا پھر پاکستان جائے گا۔ کیا تم اس

کے ساتھ جاؤ گے؟“

اس نے کہا۔ ”میں اپنے یار کے ساتھ صرف جڑی میں ہی نہیں جہنم میں بھی جاسکتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”مراد! میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ زبان کا دھجی ہے اور میرے بیٹے کا سچا یار تھا۔“

عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ ”تھا“ کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ بیٹا آپ کے سامنے موجود ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”میں موجود ہوں لیکن ان کا بیٹا اور تمہارا یار موجود نہیں ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”موجود ہو اور موجود نہیں ہو۔ یہ کسی مشکل خیز باتیں کر رہے ہو؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ! وہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا بیٹا تمہارا یار واپس نہیں آیا ہے۔ گاڑ جاتا ہے کہ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے سرجری کے ذریعے گمشدہ بیٹے کا زندہ کیا ہے۔“

وہ بڑی حیرانی سے اور بے یقینی سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا نام مراد علی منگی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے خطرناک خلیوں کے شوٹرز اور انٹروڈرلڈ والے ہی نہیں یہاں کی پولیس اور سی آئی اے والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے سب تک درجنوں دشمنوں کو گولی مار دی ہے۔ درجنوں کو زخمی کیا ہے۔ مجرمانہ دھن میں کہ برساتی مینڈلوں کی طرح پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ان سب سے چھپنے کے لیے تمہارے یار کے اس چہرے کے پیچھے پناہ لی ہے۔“

وہ اسے ابتدا سے اب تک کی اہم باتیں بتانے لگا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ بنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد دنیا کے بدترین اور خطرناک مجرم اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ایک خطرناک عورت مرینڈن کی MET آفیسر ہے۔ وہ بھی بدظاہر اس کی دوست اور باطن میں جانی دشمن ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ پیدا کئی مجرم نہیں ہے۔ افسوس! یہ جتنا شریف ہے دشمن اتنی ہی مینگی سے اسے بددوق پکڑتے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عبداللہ! اس کی صورت دیکھو۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ تم بولو اسے یا تسلیم کرو گے؟“

وہ صوفے سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ پھر مراد کے پاس آ کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ ”تم سر سے پاؤں تک انکل کے بیٹے رابن سن ہو۔ میرے یار ایمان علی ہو۔ خدا کرے کہ تم تمہارے کام آتے رہیں اور میں انعام کے طور پر ایمان علی زندہ سلامت مل جائے۔ اللہ چاہے گا کہ وہ کہیں سے ضرور واپس آئے گا۔“

ماروی

”میری محبوبہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ میں تمہاری محبوبہ کو تم سے ملانے کے لیے ننگی کروں گا۔ تمہارے کام آتا رہوں گا۔ میرا یار جانتا تھا کہ میں کیسے کمالات دکھاتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ اٹھو! آؤ! آؤ! میں تمہیں کچھ دکھاؤں گا۔“

وہ تینوں بیڈروم سے نکل کر لاؤنج میں آگئے۔ وہاں اس نے کہا۔ ”جمناسٹک کے کمالات دیکھو۔“

وہ بچپن کے بل جو رنگ کرتا ہوا چانک بنی ہندی کی طرف اچھلا پھر نفا میں قلابازی کھاتا ہوا مراد کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا گیا۔ مراد نے فوراً پیچھے ہٹ کر دیکھا۔ وہ فرش پر پھینچ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر ذرا بھی ڈگمگاتا تو کھڑا نہ ہوتا۔ فرش پر اوڑھتے منہ کرتا۔ یہ اس کی مہارت تھی کہ دونوں پیروں پر جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مراد اور ڈاکٹر نے داد دینے کے لیے تالیاں بجائیں۔ وہ بولا۔ ”میرا کمال دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میں کبڈی کا کھلاڑی لگتا ہوں۔ سب مجھے عبداللہ کبڈی کہتے ہیں۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ تمہارے کربت اور چھوٹے قد کے حوالے سے یہ نام اچھا لگتا ہے۔ میں بھی تمہیں یہ نام دے گا۔“

اس نے کہا۔ ”ایمان علی! میرا چھوٹا سا گلدان ہے۔ اسے ایک ہاتھ سے اٹھاؤ۔ مجھ کو تم نے رولو اور پکڑا ہے۔“

مراد نے گلدان کو نہیں اٹھایا۔ اس نے مسکرا کر لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر رولو اور نکال لیا۔ کبڈی نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ میرا نشانہ لڑھیجے کوئی مارنے والے ہو۔“

مراد نے نشانہ لیا۔ وہ بولا۔ ”یاد رکھو! میں اسے گراؤں گا اور تم نے نہیں دو گے تو جیجی دھجی ہو جاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟“

اس نے کہا۔ ”منظور ہے۔ میں نے بڑے دھم کھائے ہیں۔ ایک معمولی چوٹ کھانے سے نہ ڈراؤ۔“

اس نے پھر چونک کی۔ بچپن کے بل اچھلنے لگا۔ وہ نفا میں اچھلتا ہوا قلابازی کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا۔ رولو کے نشانے سے متاثر ہوا۔ مراد نے فوراً ہی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔

ہاؤ ہاؤ ہاؤ۔۔۔ وہ نفا میں اچھل کر مراد کے بائیں طرف آ گیا۔ وہ اتنی تیزی سے چلا گیا کہ رولو اور نفا میں قلابازی کھاتے ہوئے فٹ بال کی طرح کھوم رہا تھا کہ مراد کی آنکھیں ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ نشانہ لینے کے لیے رولو اور کارخ ادھر سے ادھر کر رہا تھا۔

وہ واقعی چھوٹے قد کی وجہ سے نفا میں قلابازیاں کھاتے وقت فٹ بال کی طرح دکھائی دیتا تھا پھر چانک ہی مراد کی آنکھوں کو اور توجہ کو ادھر سے ادھر نکالتے ہوئے نفا میں اڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ٹھوکر مار کر گزر گیا۔ وہ ٹھوکر پتھر کی طرح لگی تھی۔ مراد کے حلق سے ہلکی سے کراہ نکلی۔ کبڈی نے درست کہا تھا کہ وہ دھجی ہوگا۔

رولو اور اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور فرش پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ مراد اسے اٹھاتا ”وہ ایک قلابازی کھاکر اسے اٹھاتا ہوا دور جا کر فرش پر جم کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے مراد کو نشانے پر رکھ لیا۔

مراد ایسے کمالات دیکھ کر اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اسے گلے لگانے کے لیے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔

مراد نے اس کی پیٹھ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ”بھدا! میں نے پہلی بار ایک فائز کی ایسی پجرتی اور مہارت دیکھی ہے۔ اب تو میں چاہوں گا کہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرو۔“

وہ بولا۔ ”اور میں جی جان سے رہوں گا۔“

”تمہارے ہاتھ پاؤں پتھر کی طرح سخت ہیں۔ میرے ہاتھ ڈھک رہے ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بھی تمہیں کرتا ہوں۔ میں عام بولو کی طرح نرم و دانک نہیں ہوں۔“

ڈاکٹر نے کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا تم دونوں کی دوستی کو سلامت رکھے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے مراد کو اپنے بیٹے کی صورت دی ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم اس کے ساتھ باڈی گاؤں ذہن کر رہے ہو۔“

مراد نے کہا۔ ”میں تمہارا دل کے بغیر لڑتے وقت کی محسوس کرتا تھا۔ اپنی طاقت سے دشمنوں کو زیر کرتا تھا لیکن لڑنے کی تکنیک یا داؤ پیچ نہیں جانتا تھا۔ جوڈو کرانے بھی نہیں جانتا۔“

وہ بولا۔ ”میں ہوں نا۔ تمہیں سکھاتا رہوں گا۔ دشمنوں نے تمہیں خطرناک شوٹر بنا دیا ہے۔ میں تمہیں خطرناک فائز بنا دوں گا۔ اب ذرا گھڑی دیکھو۔ آدھی رات ہو رہی ہے اور میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے بھی نہیں کھایا ہے، ابھی ملازم کھانا لگے گا۔“

وہ چلا گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے شام کو سات بجے کھانا کھا پھر بھی ساتھ دوں گا۔ میرے دوست! تمہارے ساتھ ایک نئی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔“

ڈاکٹر نے کھانے کی میز پر کہا۔ ”تم دونوں میرے سامنے انگلیش لیٹونج میں بولتے رہو۔ میں تمہیں برطانوی لہجہ اسٹائل اور محاورے وغیرہ بتاتا رہوں گا۔“

وہ کھانے کے دوران ان کی کلاس بھی لیتا رہا اور ضروری باتیں بھی کرتا رہا۔ مراد بار بار عبداللہ کبڑی کی کوڈیکتا چار چار کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آکر چائے پینے لگے۔ کبڑی نے کہا۔ ”ایمان! ہم بار بار مجھے دکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو بات کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک بات پک رہی ہے۔ ذرا یہ پک جائے تو بولوں گا۔“

ایسے وقت ماسٹر کو بولو نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ”لیس ماسٹر! میں حاضر ہوں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ابھی دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم ایک نئے چہرے کے پیچھے چھپ گئے ہو۔ یہ تم نے بہت ہی دانشمندی کی ہے۔ اب کوئی ذہن نہیں پہچان سکتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں اس نئے چہرے کا راز دار کسی کو نہیں بنانا چاہتا۔ صرف میرے اپنے اعتقاد کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا مجھے اس سلسلے میں چھپت راز پر بھروسہ کرنا چاہیے؟“

”جست راز“ چھپنے چھپنے سے مراد قیادار سے اس چہرہ پر ہوا کرتے ہوئے۔ میرے دوسرے وفاداروں پر نہ کرو۔ میں یہ بات چھپت راز کو سمجھا دوں گا۔ وہ ابھی تم سے بات کرے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ماسٹر! میرے ایک وفادار نے ریڈ ارٹ کے پاکستانی ایجنٹ عالی جناب کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ آپ نے اس کی تعریف نہیں کی۔“

”سوری مراد! میں بہت زیادہ مصروفیات کے باعث بھول گیا تھا۔ وہ تمہارا دوست راست کہاں ہے؟ واقعی انعام کا حق دار ہے۔ میں اسے منہ کانکا انعام دوں گا۔“

”وہ بے چارہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے چھپتا پھر رہا ہے۔ آپ اسے سکیورٹی دیں۔ یہی اس کا انعام ہوگا۔“

”میں اسے پاکستان میں سکیورٹی نہیں دے سکوں گا۔ البتہ وہاں سے اسے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دوں گا۔“

”وہ میری طرح آپ کے بہت کام آنے والا بندہ ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس کی بیوی کے ساتھ اسے اپنے پاس سن سٹی بلا لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل تک اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ مجھے اس کا پتا نہ آو۔“

بلا بلو پستان کے ایک علاقے میں چھپا ہوا تھا۔ مراد نے اس کا پتا بتایا پھر کہا۔ ”جس طرح میں آپ کے لیے میرا ہوں، اسی طرح بلال احمد عرف بلا میرے لیے میرا ہے۔ آپ فوراً اس پر توجہ دیں۔ وہ مصیبت میں ہوگا۔“

”گھر نہ کرو۔ وہ کل تک اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس آ جائے گا۔ اور بولو؟“

”اور کچھ نہیں بولتا ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ وہ کل تک آپ کی چست چھایا میں کچل جائے گا۔“

”تم کمال کر رہے ہو مراد! دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم نے میرے ذہن ریڈ ارٹ والوں کو پھر نقصان پہنچایا ہے۔ آج دھرم داس اور اس کی بیٹی کو سکیورٹی دیتے ہوئے تم نے ریڈ ارٹ کے پانچ شوگر زکو مار گرایا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف تو۔ تمہارا یہ پرائیڈ کیا یہاں آ جائے گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد اپنے فون کی سمدلیے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”مرینہ کسی وقت بھی کال کرنے والی ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے بعد اس سے باتیں کروں گا۔ پہلے وہاں جاؤں گا کہ چہرے کی تبدیلی کے متعلق اسے بتاؤں۔“

چال چلون بومیرے ذہن میں ابھی پک رہی ہے، ڈاکٹر عبداللہ کبڑی نے کہا۔ ”ابھی تم نے مجھے بار بار دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ذہن میں کوئی بات پک رہی ہے۔ کیا کچھ بولیگا؟“

مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آپ نے مجھے غائب کر دیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مراد علی منگی پیدا ہو جائے تو؟“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”دوسرا کہاں سے پیدا ہو جائے گا؟“

”آپ غائب کرتے ہیں تو آپ پیدا بھی کریں گے۔ کسی دوسرے کو میرا چہرہ دے سکیں گے۔“

”اچھا تو تم چاہتے ہو میں سر جری کے ذریعے کسی دوسرے کو مراد بنا دوں؟ کیا پک رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“

”سوچ رہا ہوں ایک تو میں ایمان علی کے پیچھے چھپ کر دشمنوں کو دھوکا دیتا رہوں گا۔ پھر آپ کا دوسرا بنایا ہوا مراد علی منگی بھی انہیں اٹو بناتا رہے گا۔“

ڈاکٹر نے ہلکا کر کہا۔ ”اچھا آئیڈیا ہے۔“

کبڑی نے ہنستے ہوئے اس کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یار! بڑا مزہ آئے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”مزہ اس وقت زیادہ آئے گا جب

ڈیڈی جنہیں مراد علی منگی بنا دیں گے۔“

دونوں نے اسے جھڑپ سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اب بولو کتنا مزہ آئے گا جب ذہن پورے مراد کی جگہ آدھے مراد کو دیکھیں گے اور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کریں گے کہ تم مراد ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں گے اور ایمان علی سمجھتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہارے دماغ میں بڑا اچھا خیال آیا ہے۔ ابھی اس کے کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ ذہن ماریشی طور پر چکرا جائیں گے۔ انہیں جادو منتر اور آتما شکتی والی کوئی کہانی سنانی پڑے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ تمہیں کالے جادو کے ذریعے ایک سے آدھا کر دیا گیا ہے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”جس میں بڑی کامیابی سے مراد کے انداز میں بولوں گا، اس کی طرح چلتا پھرتا رہوں گا اور اس کی طرح خود کو فائز اور گن میں ثابت کروں گا تو سب حیران بھی ہوں گے اور اصلیت معلوم کرنے کے لیے میرے پیچھے بھی بڑھ جائیں گے۔“

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”یار! بہت مزہ آئے گا۔ ہم دن رات تنہا کرتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر ٹینی سن نے کہا۔ ”مراد! تم انہوں کے اور بولو کے ذہن میں کتنی تبدیلیاں کر سکتے ہو؟“

”جی ہاں! آدھے مراد علی منگی کو کس طرح پیش کرو گے؟ کسی باتیں بناؤ گے؟ پہلے یہ اچھی طرح سوچ لیجھ لو۔ رات بہت ہو گئی ہے ابھی جا کر سو جاؤ۔ سوچتے سمجھتے کا بہت وقت ہے۔ میں کل شام کو کبڑی کا چہرہ تبدیل کروں گا۔“

ڈاکٹر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آئیڈیا زبردست ہے۔ لیکن خوب سوچ لیجھ کر اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

مراد اور کبڑی ایک کمرے میں آکر ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ایسی پہچان جانے والی بات ذہن میں آئی تھی کہ انہیں فوراً ہی نیند نہیں آ سکتی تھی۔ کبڑی آئندہ مراد بننے کے لیے اس کالاب دلچسپ سمجھتے سمجھتے ہو گیا۔ مراد جھکا ہوا تھا، اسے بھی نیند آگئی۔

☆☆☆

مرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اسے آفیسر کا کاج اور آفیسر آن انکسٹ ڈیوٹی کا آئی ڈی کارڈ مل گیا تھا۔ اسے قانونی طور پر ایسے اختیارات حاصل ہو گئے تھے جنہیں وہ غلط طریقوں سے بھی استعمال کر سکتی تھی۔

اس کے ذہن میں جو سب سے اہم غلط خیال پرورش پا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ماروی کو مراد کی دنیا سے غائب کر دے۔ وہ اسے ڈھونڈتا پھرے اور جب اسے معلوم ہو کہ اس کی ماروی مرینہ کی قید میں پڑی ہے تو وہ اس کے سامنے آکر گھٹنے ٹیک دے۔

سب ہی ذہن کھل رہے تھے کہ مراد لاپتا ہو گیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ شاید ہمیں بدل کر رہنے لگا ہے۔ مرینہ نے اسے کال کی تو رابطہ نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اس کا فون بند ہے۔

ڈائریکٹر جنرل جان اخٹونی نے کہا۔ ”دیکھو۔ اس نے تم سے بھی رابطہ ختم کر دیا ہے۔ اسی دن کے لیے سمجھا رہا تھا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ ہم اس کی نگرانی کرتے رہیں گے تو وہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ نہ کہیں چھپ سکے گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ مجھ سے نہیں چھپ رہا ہے۔ اس نے مجبوراً فون کو بند رکھا ہے یا فون اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ وہ ضرور بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔“

مرینہ کو یقین تھا کہ اس نے مراد کو اچھی طرح ٹریپ کر لیا ہے۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہے۔ وہ حالات پر قابو پاتے ہی ضرور اسے کال کرے گا لیکن وہ اندر سے پتہ چل رہی تھی۔ اس کی جتنی بھی جتنی بھی مراد اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل اور ہڈن کے آدمی اسے تلاش کرنے بے پور گئے تھے۔ تب سے وہ مرینہ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے۔

وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ ”وہ مجھے بڑے جذبے سے میری جان مرینہ کہتا تھا۔ اب شاید نہیں کہے گا۔ میرے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ والوں نے کام لگا ڈیا ہے۔“

اس نے اپنی رہائش گاہ میں آکر ماسٹر کو بولو کال کی اور کہا۔ ”ماسٹر! تمہیں خوش خبری سنارہی ہوں۔ میں نے آج MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

ماسٹر نے خوش ہو کر کہا۔ ”مارک! ہو مرینہ! میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”ویل مرینہ! جب اس ڈیپارٹمنٹ والوں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا اور ریڈ ارٹ والوں نے بھی تمہارا ہاتھ نہیں تھا تاہم اب میں نے تمہیں سر پر بٹھایا تھا۔ اب کیا خیال ہے؟ میری دوستی کا جواب دوستی سے دو گئی؟ ضرورت کے وقت میرے کام آؤ گی؟“

”ضرور کام آؤں گی۔ مراد آپ کا خاص آدمی ہے۔ آپ اسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میں اس کی خاطر

مرینہ نے فون بند کر دیا۔ اس نے پچھلی رات انڈین ٹائم کے مطابق ایک بجے فون کیا تھا۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ مراد کا فون بند ہو چکا ہے۔ یعنی گیارہ بجے ماروی سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے فون سے سم نکال دی تھی۔ آئندہ نئی سم کے ذریعے کی وقت اپنی مشن کو دے دے والا تھا۔

وہ مٹھیاں سمجھ کر سوچنے لگی۔ کیا کمینہ ہے؟ اس نے ماروی کو بتایا کہ کم بدلنے والا ہے۔ مجھے نہیں بتایا۔ اب سم بدل کر مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ میں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ آئندہ میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ اب تو اس کی کمینگی اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے۔ اب میں اس دشمن کو تلاش کرتے ہی ریڈ الارٹ کے حوالے کر دوں گی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس کا پیپر میرے پیٹ میں آ رہا ہے۔ اگلے مہینے تصدیق ہو جائے گی۔

وہ جی کی طرف جانے کے لیے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ کچھ محسوس کر رہی تھی اور انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی چیخ سنائی دی اور خاموشی چھا گئی جیسے مرگئی ہو۔ مراد کے بچے کی ماں بننے کی امید دم توڑ چکی تھی۔ جس کے باپ کے سر کا سودا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی وہ بچہ ہی وجود میں آنے سے پہلے بنا ہوا ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد واش روم سے نکل کر کمرے میں آگئی اور جھکا کر چلتی ہوئی صوفے کے پاس آئی پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ حالات نے اسے اٹھا کپٹھن دیا تھا۔ بعض عورتیں مرینہ کی طرح پاگل ہوتی ہیں۔ اپنے مرد کے بچے کو کوکھ میں رکھنے اور اسے جنم دینے کے لیے ایک ایک دن کئی رہتی ہیں۔ اس روز اس کی کئی ختم ہو گئی تھی۔ نئی کتنی شروع کرنے کے لیے پھر مراد ملنے کی مراد ملے گی اسے پکار رہی تھی۔

ہائے کس دل سے اس کے سر کا سودا کروں گی؟ ہرگز نہیں کروں گی۔ وہ شاید مجھ سے بدلتی ہو رہی ہے۔ مجھ پر شاید نہیں کر رہا ہے۔ مجبوراً مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا ہے۔ آج شام تک بار بار تک ضرور بتے نمبر سے بات کرے گا۔

اس کی سوچ پہلے نئی تھی پھر ثابت ہونے لگی۔ وہ پٹری

سے فون پر رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ معلوم ہوتا تو پتا چل جاتا کہ مراد نے اپنے فون کی سم بدل دی ہے اور ایسا اس نے صرف اپنی ماروی سے باتیں کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے اہمیت دیتا ہے۔

وہ اپنے فون کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا کرے؟ کیسے معلوم کرے؟ وہ تو فون انڈینڈ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے مجبوراً پھر ماروی کے نمبر پر کیے پھر چاچی کی گالیاں سننے کے لیے تیار ہوئی۔

دوسری طرف کال تیل جاری تھی پھر بند ہو گئی۔ نئی انڈینڈ نہیں کر رہی تھی۔ مرینہ نے زہر لب کہا۔ ”کب تک فون کا قحی رہے گی۔ ایک بار گالیاں دینے کے لیے ضرور بولے گی۔ اس سے پہلے ہی چاچی کی جتنی کے دماغوں کو ایسا جھکا پھینچاؤں گی کہ وہ دونوں ہی تڑپنے لگیں گی۔“

اس نے پھر نمبر پر کیے۔ رابطہ ہونے پر ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”تم کیوں ہمارے پیچھے پڑی ہو؟“
مرینہ نے کہا۔ ”مجھے تم سے کوئی ڈھکی نہیں ہے۔ میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ مراد مچکا ہے۔“
فون پر ماروی کی چیخ سنائی دی۔ ”نہیں۔ نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”تم کوئی رپٹ نہیں مانتی ہوں کہ اس کی لاش کہاں پڑی ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی اسے معلوم ہونے والا تھا کہ مراد اس سے رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟
اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مرینہ نے مسکرا کر اپنے فون کو دیکھا پھر پٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر طنز یہ انداز میں پوچھا۔ ”مجھے گالیاں دے رہی ہیں۔ اب کیوں فون کر رہی ہو؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مرینہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ سچ بولو۔ مراد زندہ ہے؟“

”مجھے سے کیا پوچھتی ہو، اسے فون کرو۔ خود معلوم کرو۔“
وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ کیسی مکاری سے سچ معلومات حاصل کر رہی ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مراد نے پچھلی رات کہا تھا کہ فون کی سم بدل دے گا۔ پھر مجھ سے باتیں کرے گا۔ ابھی میرے پاس اس کا نیا نمبر نہیں ہے اور اس نے کل رات سے اب تک مجھے کال نہیں کی ہے۔“

”اس نے آخری بار تم سے کب بات کی تھی؟“
”کل رات گیارہ بجے۔“

ہے۔ ماسٹر اسے چھپا رہا ہے۔ پھر مجھے اٹو بنا رہا ہے۔ ایسا ہو رہا ہے۔ تو میں ماسٹر کو بوبو کے سٹڈی کیٹ کو جس جس کے رکھ دوں گی۔ اب میں مراد کے جھانسنے میں نہیں آؤں گی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے کش کر دوں گی۔ پورے پچاس لاکھ وصول کروں گی۔“

وہ صوفے کے بچے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”ڈی جی جان اتھوئی درست کہتا ہے۔ مجھے اس کی دیوانگی سے باز آ جانا چاہیے۔ مجھے کسی بھی پہلی فلائٹ سے انڈیا جا کر اسے ڈھونڈ کر پچاس لاکھ ڈالر زخمی بڑی رقم وصول کر لینا چاہیے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”مگر وہ کہاں چھپا ہوگا؟“
سوکن کے دماغ نے کہا۔ ”ماروی کے اندر چھپا ہوگا۔ ہاں وہ نہیں بھی ہوتا ہے، کسی بھی حال میں ہوتا ہے موت سے بھی لڑتا رہتا ہے۔ تب بھی ماروی سے ضرور رابطہ رکھتا ہے۔“

وہ ہونٹوں کو سختی سے سمجھ کر سوچنے لگی، پھر اس نے ماروی کے نمبر پر کیے۔ ”اُوروہ مراد کے بچے سے مل گئی ہوئی تھی۔ سچے اپنے باپ کی طرح ضدی تھا۔ وہ اسے کھلونوں سے بہلا رہی تھی۔ ضدی جو نیم مراد ابھی روٹے روٹے جب ہوا تھا اس نے فون پر اپنے نمبر پر کیے۔ ”ماروی! ماروی! پتا نہیں کون ہے۔ لو تم بات کرو۔“

نئی نے فون لے کر پٹن دبا کر کان سے لگا دیا۔ پوچھا۔ ”ہیلو کون ہو جاہلی؟“

مرینہ نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“
نئی نے کہا۔ ”میں میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں مرینہ ہوں۔ ماروی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“
”اچھا تو تو شیطاں کی بیٹی؟ تو ماروی سے کیا بات کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟“

مرینہ نے کہا۔ ”لیکن کون پلیرز۔“
وہ بولی۔ ”میں انگریزی سمجھ لیتی ہوں۔ تیری پلیرز کھانا ڈاروں۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ ”تم نے اچھی سنائی ہے۔ سمجھتا ہمارے پیچھے لگنے سے باز نہیں آ رہی ہے۔“
مرینہ نے رابطہ ختم ہونے پر اپنے فون کو دیکھا۔ چاچی کی باتیں سن کر اسے آگ لگ رہی تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو اس بڑھیا کی ہڈی پہلی توڑ کے رکھ دیتی۔ وہ اپنی اسلٹ پر تھما کر صوفے پر پہلو بدلنے لگی۔ وہ ماروی سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مراد اس

آپ کے کام آتی رہوں گی۔ ابھی میں نے اسی کی بات کرنے کے لیے آپ کو کال کی ہے۔“

ماسٹر کو بوبو سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ ”مراد کی بات کیا کرے گی؟ چپیت راؤ نے اسے دشمنوں سے بچا کر راتوں رات کو لکھ پھینچا دیا تھا۔ وہاں جتنے کے بعد وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کی خبر ختم سے پوچھنے والا تھا۔“

”میں بھی اسے کال کر رہی ہوں لیکن بات نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے، وہ ایسی مصیبتوں میں ہے کہ اپنے فون سے بھی محروم ہو گیا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”ماسٹر! ایک گھبراہٹ سی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے اسے گولی تو نہیں مار دی؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔ جب بھی وہ دشمنوں کے ہاتھوں مرے گا وہ خوشیاں منا میں گے بلکہ جشن منائیں گے اور مجھے طعنے دینے کے لیے فون کریں گے۔ اس کے لیے اچھا سوچو۔ وہ موت کا رخ پھیرنے والا شیر دلیر نہیں زندہ ہے۔ ہم جلد ہی اسے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے سنیں گے۔“

وہ بولی۔ ”پتا نہیں کون ہے۔ لو تم بات کرو۔“
نئی نے فون لے کر پٹن دبا کر کان سے لگا دیا۔ پوچھا۔ ”ہیلو کون ہو جاہلی؟“

مرینہ نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“
نئی نے کہا۔ ”میں میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں مرینہ ہوں۔ ماروی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“
”اچھا تو تو شیطاں کی بیٹی؟ تو ماروی سے کیا بات کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟“

مرینہ نے کہا۔ ”لیکن کون پلیرز۔“
وہ بولی۔ ”میں انگریزی سمجھ لیتی ہوں۔ تیری پلیرز کھانا ڈاروں۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ ”تم نے اچھی سنائی ہے۔ سمجھتا ہمارے پیچھے لگنے سے باز نہیں آ رہی ہے۔“

مرینہ نے رابطہ ختم ہونے پر اپنے فون کو دیکھا۔ چاچی کی باتیں سن کر اسے آگ لگ رہی تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو اس بڑھیا کی ہڈی پہلی توڑ کے رکھ دیتی۔ وہ اپنی اسلٹ پر تھما کر صوفے پر پہلو بدلنے لگی۔ وہ ماروی سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مراد اس

آپ کے کام آتی رہوں گی۔ ابھی میں نے اسی کی بات کرنے کے لیے آپ کو کال کی ہے۔“
ماسٹر کو بوبو سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ ”مراد کی بات کیا کرے گی؟ چپیت راؤ نے اسے دشمنوں سے بچا کر راتوں رات کو لکھ پھینچا دیا تھا۔ وہاں جتنے کے بعد وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کی خبر ختم سے پوچھنے والا تھا۔“

”میں بھی اسے کال کر رہی ہوں لیکن بات نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“
”ہمارا بھی یہی خیال ہے، وہ ایسی مصیبتوں میں ہے کہ اپنے فون سے بھی محروم ہو گیا ہے۔“
مرینہ نے کہا۔ ”ماسٹر! ایک گھبراہٹ سی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے اسے گولی تو نہیں مار دی؟“

بدل کر سوچ رہی تھی۔ "میں خواہاں اس سے بدظن ہو رہی ہوں۔ نہیں میں پھر اسے محبت سے قابو میں کروں گی۔ وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرے گا۔ وہ مجھے بھول ہی نہیں سکتا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے حزان بھی بدل گیا۔ ارادے بھی بدل گئے۔ اب وہ آئندہ ہونے والے بچے کے باپ کو کیجیے سے لگانے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ سوچتے رہتے سے یہ بات عقل میں آئی کہ مراد کو جتنے کے لیے ماروی کا دل بھی جیتنا ہوگا۔ اگرچہ یہ مشکل ہے پھر بھی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔

اس نے ماروی سے بات کر کے لے کے پھر فون کو اٹھایا۔

اوجھڑے ہائے ہائے کر رہی تھی کہ مراد مارا گیا ہے اور اس کی لاش کہیں پڑی ہوئی ہے۔ مٹی نے کہا تھا۔ "مٹی! اس ڈانک کی بات پر بھروسہ نہ کرو۔ وہ پٹی جھوٹی اور مکار ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں کیسے معلوم کروں کہ وہ زندہ ہے؟"

"ڈرامہ کر۔ وہ جیسے ہی کسی مشکل سے نکلے گا، سب سے پہلے تمہیں فون کرے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی نے لپک کر فون کو اٹھا یا پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے مٹی کی اسکرین کو دیکھ کر بولی۔ "یہی جڑیل ہے۔" مٹی نے اپنے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "ارادے وہ بھی اے کھری کھری سنائی ہوں۔"

"نہیں چائی! میں دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔"

اس نے مٹی کو دبا کر اسے کان سے لگا دیا پھر کہا۔ "ہاں بولو۔ کیا بولنے آئی ہو؟"

"ہاں ماروی! اس وقت میں غصے میں تھی۔ جو منہ میں آیا بول گئی۔ مجھے معاف کر دو۔"

"توبہ! تم مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔"

"اگر معاف کر دو گی تو میں تمہاری بہن بن کر رہوں گی اور بہن کے حق پر ڈاکٹریں ڈالوں گی۔ مراد سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس کا نام بھی زبان پر نہیں لادوں گی۔"

"میں تمہاری اس تہدیلی پر حیران بھی ہوں اور خوش بھی ہوں۔ یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جلدی جلدی کیسے بدل جاتی ہو۔ تم کہہ رہی ہو کہ میرے حق پر ڈاکٹریں ڈالو گی۔ مراد سے بھی نہیں ملو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں ماروی! خدا اسے دشمنوں سے بچائے۔ مجھے غلط خبر ملی تھی۔ دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں کسی اور کو مار ڈالا ہے۔"

وہ خوش سے چخ کر بولی۔ "یا اللہ! میرا مراد زندہ ہے۔"

"ہاں۔ اسی خوشی میں مجھے معاف کر دو۔"

وہ بولی۔ "میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔"

"وعدہ کرو۔ مراد سے کیونگی کہ ہم بہنیں بن چکی ہیں اور آئندہ میں بھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

"مریدہ! خدا تمہارے اس نیک ارادے پر تمہیں قائم رکھے۔ مراد فون کرے گا تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ تم بالکل ہی بدل گئی ہو۔ میری بہن بن گئی ہو۔ ابھی کچھ خیال نہ کرنا، فون بند کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کرنے جا رہی ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ مریدہ نے اپنے فون کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "نماز پڑھنے کی ہے۔ خدا سے کہنے کی ہے کہ میں مراد کے سامنے بھی نہ جاؤں۔ اسے بھی ہاتھ نہ لگاؤں۔"

"لو کی پٹنی! مراد کو اپنے باپ کی جاگیر بھی ہے۔ وہ جاگیر دار پہلے میری زمین کا ہے۔ میں اسے تیری زمین تک پہنچنے ہی نہیں دوں گی۔"

وہ اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں تھی۔ پھر سے وہی سبق دہرانے والی تھی یعنی پہلے محبت سے اسے راضی کرنے والی تھی۔ وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسے اپناج قیدی بنا کر اصل ملک واپس لائی تھی۔

بچے کو جنم دینے والی ہے تو پھر اس قربانی کے بکرے کو کچاس لاکھ میں ضرور فروخت کر دیتی۔

☆☆☆

اس سرجری روم کا آئینہ جادو کی کمالات دکھاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس آئینے میں مراد کا چہرہ غائب ہو گیا تھا اور ایمان علی کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ اب اسی آئینے میں عبداللہ کبڑی کا چہرہ مٹ گیا تھا۔ مراد کا چہرہ پھر سے ابھر آیا تھا۔

مراد کبڑی کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر مٹی بن فاطمہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں دو چہرے بدل گئے تھے۔

کبڑی نے مسکرا کر مراد کے انداز اور لب و لہجے میں کہا۔ "سامع! مجھ کو کیا دیکھتے ہو؟ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ میرا نام مراد علی مٹی ہے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارے ہوئے کہا۔ "تم کسی شک و شبہ کے بغیر مراد بن گئے ہو۔ صرف قد سے مات کھا گئے ہو۔"

"قد کے معاملے میں یہ کہانی یاد کر لی ہے کہ کس طرح ایک تانترک مہاراج نے کروڑھوں میں آکر میرے قد کو آدھا

کر دیا ہے۔ میں مریدہ کو اور محبوب علی چانڈیو کو اور اس کے ساتھ رہنے والے معروف جی اور امیر اکوٹکی کہانی سناؤں گا لیکن ابھی ایک کمی ہے۔ میں ان سب کو چہروں سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہاں سے ان کی تصویریں حاصل کرو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مراد! تم ماروی سے حقیقت نہیں چھپانا چاہتے۔ اسے بتانا چاہتے ہو کہ کبڑی کو مراد بنا دیا گیا ہے۔ ماروی سے کہو کہ ان سب کی تصویریں میرے ای میل پر Send کرے۔ یہ مسئلہ ہو جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "میں ابھی ماروی سے بات کروں گا اور اسے اپنا رازدار بناؤں گا۔ کبڑی! تم جب تک ان سب کے چہرے اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرو گے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی باتیں یاد نہیں کرو گے اور میں جب تک برطانوی سلجھ میں انگریزی بولنا نہیں سیکھوں گا جب تک ہم پاکستان نہیں جا سکیں گے۔"

اس نے کہا۔ "میں تو بہت بڑا انتقال ہوں۔ دس بارہ دنوں میں تمام سبق یاد کروں گا۔"

"اس سے پہلے تمہیں مراد کی حیثیت سے مریدہ کا سامنا کرنا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت سی اہم باتیں تمہیں یاد کرواؤں گا اور آج رات دس بجے فون پر اس سے بات کروں گا۔"

کبڑی نے کہا۔ "وہ یہاں آنے کے لیے نکل جائے گی۔ میرا پتا مجھے کی۔"

اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "میں یہاں سے دور ایک بنگلا کرائے پر لیتا ہوگا۔ مریدہ کو بتایا جائے گا کہ مراد وہاں چھپ کر رہتا ہے۔ وہ وہیں اس سے ملنے آئے گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہاں سے بہت دور آگرہ میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے تین بچے ہیں۔ کیا آگرہ جا کر رہنا چاہو گے؟"

"چھپ کر رہنے کی خاطر آگرہ زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ اپنے دوست سے بات کریں۔"

ڈاکٹر نے فون سے رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون اٹھا کر بولا۔ "میں یہاں اٹھینڈ کرنے کے بعد اپنے دوست سے بات کروں گا۔"

مراد اور کبڑی ڈراما روم میں آگئے۔ وہ کبڑی کو مریدہ کی باتیں ابتدا سے بتانے لگا۔ مریدہ سے ہونے والی گفتگو جتنی اسے یاد تھی وہ سب اسے یاد کرانے لگا۔

اس نے وہ واقعات تفصیل سے بتائے جب مریدہ اسے گولی مار کر زخمی اور لاچار بنا کر ایک مکان میں لے آئی

تھی اور اس سے جسمانی تعلقات قائم کیے تھے۔

کبڑی نے کہا۔ "میں پھر سے تمام باتیں یاد کرتا ہوں۔ کوئی بات بھولوں گا تو تم سے پوچھ لوں گا۔"

ڈاکٹر نے آکر کہا۔ "بات ہو گئی ہے اس کے تینوں بچے خالی ہیں۔ تم دونوں کل صبح مالک مکان کے پاس جا کر ایک لاکھ روپے ایڈوائس کے طور پر ادا کرو۔"

مراد نے کہا۔ "ہم وہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ مریدہ سے ملاقات کے بعد اس سے ضرور دشمنی ہوگی۔ اس کے جاتے ہی ہم وہ بنگلا چھوڑ دیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

وہ رہائش کا انتظام کر رہا تھا۔ کبڑی کی مریدہ کو سبق کی طرح یاد کر رہا تھا۔ مراد ان سے کچھ دور ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے ماروی کے نمبر شیخ کے ماروی نے فون کی نمشی سی اسکرین پر اٹھانے نمبر پڑھے۔ مراد اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ آئندہ ہم بدل کر رابطہ کرے گا۔ اس نے مٹی دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو؟"

اس کی آواز سنائی دی۔ "ماروی! میں بول رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں پچھلی رات سے انتظار کر رہی ہوں۔ اس نے فون کو دیکھ کر کہا۔ "ہاں! اس نے دی گئی ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اوگاڈ...! اس نے تمہیں کال کی تھی؟ میں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ تمہاری طرف بھی رخ نہ کرے۔"

"وہ کب ماننے والی ہے۔ پہلے تو تمہاری موت کی جھوٹی خبر سنائی۔ پھر دوسری بار فون کر کے معافی مانگی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے بھی کسی نے تمہارے بارے میں غلط اطلاع دی تھی پھر اس نے مجھے بہن کہا اور وعدہ کیا کہ ابھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ اپنی زبان سے تمہارا نام بھی نہیں لے گی۔"

"مراد! میں کیا سمجھوں؟ وہ اچانک ہی شیطانی بلا کی طرح نازل ہو جاتی ہے۔ کیا وہ تمہارا بیچا چھوڑ سکتی ہے؟"

"وہ ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار ہے۔ وہ بھلا میرا بیچھا کیا کرے گی۔ تم اطمینان رکھو، وہ آئندہ میرے سنے بہرہ دہ میں بھی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ ماروی! میں پندرہ یا بیس دنوں میں ایک زبردست پلاننگ پر عمل کرتے ہوئے تمہارے پاس آؤں گا۔ اب میں جو کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو۔"

وہ عبداللہ کبڑی کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ وہ

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے

نحوں آنا، ٹھنڈا گرم لگنا اور

دیگر تکالیف کے لیے

10 پر اہل

MEDICAM

Dr. Atta-ur- Rehman
Dental Surgeon

مریخ کا بہروسہ ڈاکٹر

ڈاکٹر کا بہروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کلیم

ایک اور بات سنو۔ میں ہڈن کو سیکورٹی پہنچا رہا ہوں اور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں دہری چائیں چل رہا ہوں۔ ریڈارٹ سے کسی نے اسے فون پر کہا ہے۔ میرے خلاف زہر آگیا ہے کہ مراد کو دھرم داس کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

”اچھا تو ہڈن بھی آپ سے پوچھ رہا ہے کہ آپ نے مجھے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”ہاں کہتا ہے، اگر میں تمہاری خفیہ پناہ گاہ کا پتا بتا دوں تو وہ مجھے دس لاکھ ڈالر دے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”میری جان کے دشمن سودے بازی سے باز نہیں آئیں گے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”پیرافنسی ڈریس شو میں چلو۔ تفریح بھی رہے گی۔ اس دشمن سے ٹٹ بھی لو گے۔“

مراد نے کچھ سوچ کر فون پر پوچھا۔ ”دھرم جی آگیا ہڈن آپ کے ساتھ ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ابھی ایک گھنٹے بعد وائی ایم سی اے ہال میں جانے کے لیے وہ میری کار میں بہن کے ساتھ بیٹھے گا۔ آگے پیچھے گاڑیوں میں گارڈز ہوں گے۔“

”آپ جن راستوں سے گزریں گے وہاں کسی جگہ کرسس ٹائم مانیٹار جا رہا ہوگا؟“

”ہاں ٹائم مانیٹار فٹن کے پاس ہے اور وہ فون پر سنا گیا ہے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے کروہ کی صورت میں مستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔“

”آپ کوئی ایسی جگہ بتائیں جہاں ناچ گانا ہو رہا ہو۔“

”وہ من کلب کے سامنے ناچ گانے اور طرح طرح کے نمائشے ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہڈن کو وہاں مراد نظر آئے گا۔“

”کیا تم پھر اصلی روپ میں آگئے ہو؟“

”نہیں۔ وہ ایک نقلی مراد ہوگا۔ آپ کو اس کے بارے میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ جب آپ ہڈن کو لے کر نکلیں گے، تب ہم بھی یہاں سے نکل پڑیں گے۔“

مراد نے رابطہ ختم کر کے صوفے سے اٹھتے ہوئے کبڈی سے کہا۔ ”چلو، دشمنوں کے سامنے آؤ اور انہیں اپنے پیچھے دوڑاؤ۔“

مراد نے اپنے کمرے میں آکر سامتا کلاز کا ماسک اور لباس پہن لیا۔ دولوں نے اپنی اپنی کمزرواچی طرح چیک کر کے لباس کے اندر چھپاوا۔ پلٹس سے بھرے ہوئے میزین سامتا کلاز کے بیگ میں رکھے پھر وہاں سے چل پڑے۔

آدھر لیزا اور ہڈن اپنے ہنگے سے باہر آئے۔ اس وقت

جیرانی سے مسکراتے ہوئے سننے لگی کہ اب دنیا والوں کو چار فٹ کا بونا مراد علی منگی نظر آکرے گا۔

وہ بونا مراد اس سے ملنے کراچی آئے گا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان ایمان علی ہوگا۔ وہی ماروی کا اصل مراد ہوگا۔

وہاں ماروی کی کوشی میں مراد اور کبڈی کی کس طرح ہیرا پھیری سے رہیں گے، یہ باتیں ماروی کو تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں اچھی طرح سننے اور سمجھنے کے بعد

بولی۔ ”تم کہتے ہو تو میں اس بونے مراد کو سب کے سامنے اپنا مراد تسلیم کر لوں گی اور اس سے لگاؤٹ ظاہر کرتی رہوں گی لیکن تم سے کیسے ملوں گی؟“

”میں رازداری سے ملنے کے راستے نکال لوں گا۔ تم لگ نہ کرو۔ فی الحال محبوب، مصروف جلی، سمیرا چاچی، چاچا

اور میڈم روزی کی تصویریں چاہتا ہوں۔ تم یہ تمام تصویریں چاچا کو دے کر کہو کہ وہ کسی نیٹ کیفے میں جا کر میرے بتائے ہوئے ای میل ایڈریس پر انہیں بھیج دیں۔ ہماری اس

پلاننگ میں صرف چاچی اور چاچا ہی رازدار ہیں گے۔ میں یہاں کا ای میل ایڈریس Send کر رہا ہوں۔“

اس نے ماروی کو اپنے موجودہ حالات اور منصوبے سے اچھی طرح آگاہ کر دی۔ اس کے بعد مراد نے مساتھا

ڈاکٹر نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دھرم جی تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔“

مراد نے اپنی سم نکال دی تھی۔ دھرم داس کو بونا نمبر معلوم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”مراد! آج کرسس ٹائم کی بڑی دھوم

دھام ہے۔ تم فنیسی ڈریس شو کی تقریب میں آنے والے تھے۔ کیا یہاں وائی ایم سی اے ہال میں آ رہے ہو؟ میں خود کو اور ہڈن کو یہاں بھر پور سیکورٹی دے رہا ہوں۔“

اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں ایک ہڈن بھی تھا۔ مراد نے اس کی بہن لیزا کو دشمنوں سے بچایا تھا لیکن

اس کے بھائی کو زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

وہ فی الحال کبڈی کو مراد بنانے کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ ہڈن کو نظر انداز کر رہا تھا۔ سوچ رہا

تھا پھر کسی دن اسے موت کے سردخانے میں پہنچائے گا۔

اس نے دھرم داس سے کہا۔ ”میں اپنے معاملات میں بہت مصروف ہوں، گھر سے نکلتا نہیں جاتا۔ کیا آپ

میری ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟“

”ہاں تم رہتے ہو تو لگتا ہے کہ سیکورٹی کے لیے پوری فوج آگئی ہے۔ تمہارے آگے دشمن دم نہیں مارتے ہیں۔“

میں کئی کمرے خالی ہیں۔“ وہ بولتے وقت بہت ہی جذباتی ہو کر اپنے بھرے ہوئے بدن سے اس کے بدن کو سہارا ہی نہ تھی۔ مراد نے الگ ہونے کے لیے ایک زور کا جھٹکا یا تو وہ پیچھے کی طرف لوٹ کر ذاتی ہوئی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی ٹرائی پر مری۔ کئی بوتلوں اور شیشے کے نازک جام ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پریمیا کے ساتھ نیچے جا گرے۔ کتنے ہی

لوگ اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ مراد ناچنے والوں کی بھینٹ میں دوسری طرف چلا گیا۔ وہ غصے میں بول رہی تھی۔ ”یو ایڈنٹ۔ نان سنس امیں تجھے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ آئی ول۔ کل۔ یو۔۔۔“ وہ کئی ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ کئی۔ دور تک دیکھنے لگی۔ اس کا سر چکر آ رہا تھا۔ مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھرم داس نے آکر اسے سنبالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت پیہلی لی ہے۔ چلو یہاں سے۔“

وہ اس کے ساتھ تیز تری سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ وچ لیڈی نے فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے لباس کے اندر سے سائیکسٹر کا پیسٹول نکال لیا۔ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ”تھو ہے تمہارے پچاس لاکھ ڈالرز پر۔ وہ مراد علی مفتی میرے دیں میں ہے۔ اس کی رکھشا کرنا میرا کرتو (فرض) ہے۔ کوئی اسے اتھ بھگی لگے گا تو میں اسے زک میں پہنچا دوں گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر کو دبا دیا۔ جیسی آواز میں گولی

یہ کہتے ہیں اس نے ٹرگ کو دیا۔ دھیمی آواز میں گولی چلی وہ عین وقت پر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر جبکہ اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ دوسری گولی چیت پر جا کر لگی۔ یہ اہٹا بچاؤ کر رہا تھا۔ وہ زبردست لڑاکا عورت تھی۔

ہمارا دل بھی ایسا نہیں ہوا اور میں کوئی منگی ولی

بات پوری ہونے سے پہلے اس نے مراد کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا لیکن ایسی بھی تکلیف نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس نے وچ لیڈی کو دبوچ کر رکبندتے ہوئے پیچھے دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کا سر ذرا جھکا تو مراد نے اس کی گردن میں بازو کا پھندا ڈال دیا۔ ذرا زور لگا تو اس کی

کبڑی نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔ ”میں بھی اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر جاؤں گا کہ وہ کون تھی؟“ وہ کانے لگا۔ ”میں ہوں یونا بازیگر۔ میں ہوں یونا

وہ ہنسی ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ فرش پر سے اٹھتے ہوئے
 مراد کو فرست دے دیکھتے پہنچے بولی۔ ”میں موت سے کھینچ رہی
 ہوں۔ جل گولی چلا۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی مرے گا۔
 میری بیٹی اس لمحے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

اس نے وچ لیڈی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شراب کا جام ہونٹوں سے لگائے پی رہی تھی۔ مراد نے آکر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ”ارے چھوڑو۔ میں جوان لڑکی نہیں ہوں۔“

مطلب ہے کیا وہ چھوٹے قد کا تھا؟“ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”وہ تو بہت اونچا پورا لمبا چوڑا تھا۔ میں اس کی بائیک پر پیچھے بیٹھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑ کے دامن میں بیٹھی ہوں۔“

کبڈی منظر عام پر آ کر ایک دشمن کی موت اور دوسرے دشمنوں کی پریشانی بن گیا تھا۔ اب وہ مراد کے ساتھ فنیسی وریس شو میں لے گیا تھا۔ وہاں تو مختلف ماسک تیزی سے چلا ہوا آیا پھر شیطانی ماسک میں کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بوئے مراد کا ایک راز بتاتا ہوں۔“

وہ اسے ہال سے باہر ایک اسٹور روم میں لے آیا پھر بولا۔ ”تم کس کے لیے مراد کو ڈھونڈ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تم کوئی سوال نہ کرو۔ مجھے بوئے مراد کا راز بتاؤ۔“

مراد نے سائلینسز لکے ہوئے ریوالور کو اس کے سینے سے لگا کر کہا۔ ”ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فون نکالو اور اپنے پاس کو بولو۔ مراد جہارے سامنے کھڑا ہے۔“

موت پہنچنے سے آکر لگی ٹونے کی منتی ہوا ہو گئی۔ اس نے فون پر نمبر چمکے۔ اے کان سے لگا یا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”پاس! میں مراد کے نشانے پر آ گیا ہوں۔ اگر سے کسی طرح سمجھوتا کرو۔ مجھے بچاؤ۔“

اس محفل میں ہر شخص کی جلوہ نمائی تھی۔ شباب کی مگرمی سے ازکندہ ہال گرم ہو رہا تھا۔ میز پر لکڑی کی ہوئی سردی تھی۔ ایسے میں حیناؤں کی دھوپ نکل آتی تھی اور آتش کو جواں رکھنے کے لیے شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

موتوں اور مردوں نے طرح طرح کے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کوئی لومڑی بنی ہوئی تھی، کوئی بلی اور کوئی خرگوش

ہوئے۔ صلیب کو جس میں یسوع مسیح نے اپنی جان قربان کی تھی، اس کی طرف لوگ آ کر دیکھنے لگے۔ وہ اسی کے مطابق انہوں نے بڑے ہی دیدہ زیب لباس پہنے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماکس کے بغیر ایسی شکل میں آئے تھے۔ مرد اور سائیکلاز رہتا ہوا تھا۔ دھرم داس کے ساتھ آتا دیا تھا کہ بڑن ٹانگیں کے بائک میں بٹھا ہوا ہے۔ عبداللہ

جس کا دل بے پروا ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں پھر سے سوچا تو سمجھا کہ اس کا دل اب بھی اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اس نے اپنے دل میں پھر سے سوچا تو سمجھا کہ اس کا دل اب بھی اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔

تھے وہ آدمی مراد کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگر مراد سے تو یوں کیسے بن گیا؟ عقل کہہ رہی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو حرام موت مرنے منظر عام پر نہ آتا۔

وہ سب پی رہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ پیتے رہنے
سے مرنے کا خوف نہیں رہتا۔ مارنے کا حوصلہ بڑھ جاتا

ہے۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ چنے کے بعد ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ گدھا گھوڑا اور گھوڑا گدھا دکھائی دیتا ہے اور قد آور سلوکو کو بتا کر مانتے لگتا ہے۔

کہڈی کی ایک آنچ لٹا چوتھے پرچم کو گولوں کے ساتھ
 ناچ رہا تھا۔ شیطان کے مارک والا ایک شخص نشے میں مست ہو
 کر کہڈی کے پاس آنا پھر اس پر چمک کر بولا۔ ”ہیلوم ادا“

اس نے موسیقی کی دھن میں تھرکتے ہوئے کہا: ”تم نے زیادہ پی لی ہے۔ میں ارٹسٹ عبداللہ کبڈی ہی ہوں۔“ وہ بولا: ”یہ وہ نہیں سکتا۔ اسنا تانا دوتا ہمارا قد فنی پرسنٹ کیسے ہو گیا۔ تم تو ہنٹر روڈ پرسنٹ تھے۔“ کبڈی نے دور کھڑے ہوئے مراد کو آنکھ ماری: وہ

سے تعلق رکھتی ہو؟

”میں کیسے یقین کروں کہ اب سچ بول رہے ہوں؟“ وہ بڑی محبت سے بولا۔ ”تم مراد کے لیے ٹیک جذبات رکھتی ہو۔ پچاس لاکھ ڈالرز پر تھوکی ہو۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔“

اس نے جبکہ کر پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے مراد کو دیکھا پھر پستول کے فرش سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم کون ہو؟“

وہ بولا۔ ”پہلے تم اپنے بارے میں پتاؤ؟“ وہ بولی۔ ”میرا نام جگتی بائی ہے۔ میری نین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ہم نے انیائے (ناضانی) کے خلاف لڑنے کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس تنظیم کا نام گھمرا پٹن (Peticoat Army) ہے۔ یہ نام ہم نے نہیں لوگوں نے رکھا ہے کیونکہ ہماری دل (جماعت) میں صرف تعلیم یافتہ بہتر مند اور خطرناک فائٹر کھیلنے والی عورتیں ہیں۔

”ہم نے مراد علی سنگی کی ہسٹری معلوم کی ہے۔۔۔ وہ بے قصور ہے۔ پاکستانی جاسوس نہیں ہے۔ ہم اسے انصاف دلائیں گے۔ جو اس کا مدفن ہوگا اسے ہم جینے دیں گے۔“ مراد اسے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا جگتی بائی نے کہا۔ ”تم کو کون سا نام دیا جائے گا؟“ مراد کو جانے نہ ہو۔

مراد نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہاں بے چارہ مراد۔۔۔ میں تمہارے اندر انسانی ہمدردی اور مراد سے اپناتے دیکھ کر کچھ کہوں گا۔ ابھی ہم نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا ہے۔ پہلے تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم جاوٹوں کو اور کسی تاتھک مہاراج کی جاوٹی شکلیوں کو مانتی ہو؟“

”کیوں نہیں مانوں گی؟ ضرور مانتی ہوں۔ ہمارے دیس میں جاوٹوں کا بہت ہے۔“

”تو سنو؟ ابھی جو ہال میں ناچ رہا ہے اور گاربا ہے وہی مراد علی سنگی ہے۔ ایک تاتھک مہاراج نے کروہ (میں) میں آکر اسے جاوٹی شکلی سے بونا بنا دیا ہے۔“ جگتی بائی نے حیرت سے اپنا ہاتھ کھلے ہوئے منہ پر رکھ لیا۔ مراد نے کہا۔ ”بے چارہ مراد دشمنوں سے چھپنے کے لیے شیشاں گھات میں گیا تھا۔ وہاں ایک تاتھک مہاراج ایک قہال میں گیندے کے پھول ناش کی دال کا آٹا سینڈو اور تلی کا تیل رکھ کر آسن جمائے بیٹھے تھے اور کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ مراد دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ادھر سے بھاگتا ہوا جانے لگا تو مہاراج کی قہال کو ٹھوکر لگی۔ ان

کے تمام جتن منتر کا سامان دور تک بکھر گیا۔ سب ہی مٹی میں مل گیا۔

”جب تاتھک مہاراج نے کروہ میں آکر ایک منتر پڑھ کر اس پر چھوٹ کر ماری تو وہ سنگلاتا اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد گھٹ گیا اور وہ بونا بن گیا۔“

جگتی بائی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہائے۔۔۔ بے چارہ! ہم اس تاتھک مہاراج سے ملیں گے۔ اس سے پتی کریں گے۔ اس کے چروں میں گر جائیں گے تو وہ اسے واپس قہار بنا دیں گے۔“

”بے چارہ مراد نہیں جانتا کہ وہ مہاراج کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور اب وہ کہاں ہوں گے؟“ دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ”باتی! تم بڑی دیر سے یہاں ہو۔ خیریت تو ہے؟“ جگتی بائی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹی درشا آئی ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو وہاں تین جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے دو مرد اللہ کبڈی چھپا ہوا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ مراد بند کرنے سے باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟ مراد نے ہاتھ اٹھا کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں اندر آ دیں۔ جگتی بائی نے ان سے پوچھا کہ مراد کہاں ہے؟ سب نے اپنی ماں سے کہا۔ ”باتی! ابھی وہ مراد آیا ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”مراد نہیں اس کا ہم نہیں ہے۔“ تیسری نے کہا۔ ”میں شرط لگانے کو تیار ہوں مراد تو پہاڑ جیسا ہے، وہ بونا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ آپس میں بحث کرنے لگیں۔ جگتی بائی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ یہ مراد علی سنگی ہے۔“

سب نے اسے حیرانی سے دیکھا جگتی بائی نے آگے بڑھ کر کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بیٹے! ابھی تمہارے دوست نے بتایا ہے۔ تاتھک مہاراج نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم اس مہاراج کو ڈھونڈیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح تمہیں واپس قہار نہیں بنائے گا تو ہم عورتیں اسے لالچا دیں گی۔“

وہ تینوں لڑکیاں ہمدردی اور محبت سے کبڈی کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بائی اسے سینے سے لگا کر بولی۔ ”آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔ تم دشمنوں کے مقابلے میں اکیلے نہیں رہو گے۔ یہاں سے کوکھ تک گھمرا پٹن (Peticoat Army) میں دو سوا فائٹر عورتیں ہیں۔“

وہ جگتی بائی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ”میری اتنی

ماروی

وفات پا چکی ہیں۔ میں آپ کو اتنی کہوں گا۔ آپ میرے لیے فائٹ کریں۔ بھارت سرکار کو یقین دلائیں کہ میں نہ تو پاکستانی جاسوس ہوں اور نہ ہی پیشہ در بجرم ہوں۔“

”فکر نہ کرو۔ گھمرا پٹن میں چھ مانی ہوئی بیسٹر ہیں۔ پندرہ برس پر پور اور نوگر افریں۔ دور کی کوڑیاں لانے والی جاسوس ہیں۔ یہ سب کی سب تمہارے لیے فائٹ کریں گی۔“

پھر وہ اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ تینوں بہت مایوس ہو کر بونے مراد کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بائی نے کہا۔ ”مراد! ان تینوں نے تمہیں اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ ایک دوسرے سے لڑتی تھیں اور کبھی نہیں کدوہ سے شادی کریں گی۔“

ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی ماں کہہ رہی تھی۔ ”یہ میری بڑی بیٹی جیتا ہے۔ یہ دوسری ڈولی ہے اور یہ سب سے چھوٹی ورشا ہے۔“

ورشا چور نظروں سے سناٹا کلاڑ کو دیکھ رہی تھی اور انہی نے میں اصلی مراد کی طرف جاری تھی۔ وہ بونے مراد کے مقابلے میں چھ فٹ سے بھی اونچا صحت مند جوان تھا۔ لڑکیاں ایسی شخصیت کا تصور کرتی ہیں۔

مراد نے کبڈی سے کہا۔ ”میں ہال میں جاتا ہے اور دشمنوں سے ملتا ہے۔“ جگتی بائی نے کہا۔ ”اتنی! آپ اپنا کون نمبر دیں اور میرا نمبر لیں۔ میں کل آپ سے بات کروں گا اور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔“

انہوں نے ایک دوسرے کے نمبر Save کر کے کبڈی کی تینوں لڑکیوں کے سامنے آ کر بولا۔ ”نام نہ کرو۔ اگر میں تمہارا آئیڈیل تھا تو پھر ماتم کیسا؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ تم تینوں میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر روز اپنی اپنی طرف بچتی رہو گی تو لہا ہو جاؤں گا۔“

جگتی بائی نے ہنسنے لگی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر بڑے ہال میں آ گئے۔ وہاں کرس نائٹ کا جشن شباب پر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے علاوہ شراب کی ٹرائیاں بھی گردش میں تھیں۔

ریڈ اٹارٹ اور ڈسٹریس ریکٹ کے شوٹز بھی پی کر مست تھے۔ بونے مراد نے انہیں الجھایا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو کر ہیلری ہڈن کو ڈھونڈ رہے تھے۔

ڈی بلیک نے حکم دیا تھا کہ ہڈن کو گولی مار دی جائے تب ہی ڈائریکٹر جنرل مجبور ہو کر مراد کا پتا بتائے گا جبکہ MET ڈیپارٹمنٹ کی سرینہ جی اس کا موجودہ پتا نہیں جانتی تھی۔

ہڈن اپنے ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ کسی قاتل کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شراب اسے لے ڈولی۔ اس پر نشہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جوان عورت کو آغوش میں لے کر چومنے کے لیے ماسک کو چہرے سے ہٹا یا تو ایک شوٹز نے اسے دھکیلا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پیچھے آیا پھر اس کی پشت سے ریولور کی نال کو لگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر میرے کوٹ کی جیب میں ہے، کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ چپ چاپ باہر چلو۔ منہ سے ذرا آواز نکالو گے تو میں گولی مار دوں گا۔“

وہ سہم کر بولا۔ ”ہیلز گولی نہ چلاؤ۔ مجھ سے دوستی کرو۔ میں تمہارا مطالبہ کرنی کی صورت میں ادا کروں گا۔“ ”اوکے! پھر چل کر باتیں ہوں گی۔ کم آن آگے بڑھو۔“ اسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اس کے لباس کے اندر بھی ایک پستول تھا۔ سوچ رہا تھا جب جان دینی ہی ہے تو باہر جاتے جاتے پستول نکال کر اس سے مقابلہ کرے گا۔ شوٹز بھی مجبور تھا۔ اس عمارت کے اندر گولی مار کر بھاگنا چاہتا تو درجنوں سیکورٹی والے اسے گولی مار دیتے۔ وہ بڑے ہال سے باہر آ گئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گولیوں کے گرجے سنائی دے رہے تھے۔ وہ گارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔

شوٹز نے کہا۔ ”تیزی سے چلو۔“ ہڈن اس کے آگے تیزی سے چلتے چلتے اچانک پیٹھ گیا۔ اس حرکت سے پیچھے والا فوراً ہی رک نہ سکا۔ ہڈن کے اوپر سے گزرتا ہوا آگے آ کر گرا۔ اتنی ہی مہلت ملے ہی ہڈن نے لباس سے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔

دور کھڑے ہوئے گارڈز دوڑتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ مراد ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ اس نے گولی چلائی تو وہ ہڈن کے ہاتھ میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا۔ اس کی طرف آنے والے گارڈز پلٹ کر اس سے دور ہو گئے۔ جو اب گولیاں چلانے سے پہلے ادھر ادھر چھپنے لگے۔

ایسے ہی وقت ہر عورتا کی چھائی۔ کسی نے مین سوچ کو آف کر دیا تھا۔ ریڈ اٹارٹ کے شوٹز محمد ہو کر بڑی پلاننگ سے انجین میں آئے تھے۔ ان میں سے دو شوٹز مین سوچ کے پاس تھے۔ جو گارڈ اسے آن کرنے آ رہا تھا۔ اس کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ باقی شوٹز اس سے تھے جہاں ہڈن فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں

ریٹنگٹا ہوا اپنے پستول کی طرف جارہا تھا لیکن صبح سمت سے جھلک گیا تھا اور مراد کی طرف ستون کے پاس چلا آ رہا تھا۔ اندر سے میں شوٹر گولیاں چلا رہے تھے۔ فائرنگ کے لمحاتی شعلے مل بھڑے تھے۔ مراد نے ستون کے پیچھے محفوظ رہ کر ان لمحاتی شعلوں کی سمت گولیاں چلا رہی تھیں تو دور آواز کی چیخیں سنائی دیں۔ پتا نہیں وہ دشمن تھے یا گارڈز تھے؟ پھر اس نے فرش پر بیٹھ کر ڈراچنگ کر کے سانس لینے کی آواز سنی۔ پرفیوم کی مہک سے پہچانا کہ وہ ہڈن ہے۔ اس نے دھبی آواز میں کہا۔ ”فوراً لیٹ جاؤ۔ ورنہ کوئی گولی ابھی ادھر آئے گی۔“

وہ محوڈے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا آ رہا تھا فوراً ہی فرش پر اندر نہایت گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں تمہارے پرفیوم کی مہک سے پہچان رہا ہوں۔ تم ہڈن ہو۔ ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں جس نے تمہاری بہن لیزا کی جان بچائی تھی۔“

وہ بولا۔ ”جھینکس گاڈا مجھے ایک ہتھیار دو۔ مہربانی ہوگی۔“

”میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ میرا لباس تمام کر دیتے ہوئے چلو۔“

اس بات پر ہڈن نے اسے آواز دی۔ ”ابھی ایک گولی آئی۔ اس نے منہ سے آواز نکال کر نادانی کی مٹی۔ چونکہ وہ فرش پر لیٹے ہوئے تھے اس لیے بچ گئے۔ تیزی سے ریٹنگٹے ہوئے ایک سمت جانے لگے۔

مراد کی بھی جی جگہ جاتا تھا تو پہلے وہاں سے نکلنے کے راستے ذہن نشین کر لیتا تھا۔ وہ دائی الیم سی اسے کی عمارت سے بھی نکلنے کے راستے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت فرش پر پچپ چاپ ریٹنگٹا ہو ہڈن کو اپنی راہنمائی میں لے جا رہا تھا۔

وہ خطرے سے دور ہو گئے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کرائے کے شوٹرز اور سیاحیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مراد نے فون کے ذریعے کبڑی کو بتیج دیا۔ ”گاڑی کے پاس آؤ۔ میں آ رہا ہوں۔“

پچھوہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے۔ باہر شاہراہ کی روشنی کے باعث اندر گہری تاریکی نہیں رہی تھی۔ وہ دھکتے ہوئے، چھپتے ہوئے عمارت کے باہر ایک چکی کی شکل میں نکل آئے۔

وہاں کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کے پاس کبڑی کھڑا ہوا تھا۔ ہڈن اسے دیکھ کر خشک کیا۔ کبڑی نے کہا۔ ”رک کیوں گئے۔ میرے سر کی قیمت حاصل کرنے کے لیے اپنے دن رات حرام کر رہے ہو۔ آؤ میرے شانے سے سرائٹار لو۔“

ہڈن نے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں ہل میں بھی نہیں دیکھتا رہا۔ کسی پہلو سے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تمہارا قد اتنا چھوٹا ہو گیا ہے۔“

وہ سائیکلسرنگ بوار یوٹو نکال کر اس کا نشانہ بنے ہوئے بولا۔ ”میں پچاس لاکھ ڈالرز ہوں۔ گولی چلے گی تو یقین آ جائے گا لیکن یقین کرنے والے دیر ہو چکی ہوگی۔“

ہڈن نے فوراً ہی پلٹ کر مراد کو دیکھا پھر چیخ کر کہا۔ ”مجھے اپنا ریوالور دو۔“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ مار کھا کر کبڑی کی طرف ریوالور کے نشانے پر آ گیا۔ پیچھے سے مراد نے اس کی کمرے سے ریوالور لگا کر کہا۔ ”میں وہیں ہال میں تمہیں ختم کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا۔ ایک فون کال ضروری تھی۔ چلو اپنا فون نکالو اور میرے کو کال کرو۔“

اس کے آگے پیچھے موت تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ رابطہ ہونے پر دوسرے طرف موسیقی بگانے اور فہمیدوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں بھی کمرس ٹائٹ کی دھوم دھام تھی۔ مریض بھی نشے میں مست ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”دلیل ہڈن! کیا تم وہاں انجوائے کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”وہاں بہت شور ہے۔ کہیں دور آ کر بات کرو اور میری بات سنو۔ میرے آگے بڑھنا ہے۔“

”جسٹ اے منٹ! میں دوسری جگہ جا رہی ہوں۔“

ہڈن نے مراد سے پوچھا۔ ”میں مریض سے کیا بولوں؟“

”بولو کہ تم مراد کو دیکھ رہے ہو اور وہ بھونکا ہو گیا ہے۔ اس سے یہ نہ کہنا کہ مراد کے ساتھ یہ سائٹا نکلاؤ تمہارے پیچھے ہے۔“

دوسری طرف مریض کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہڈن! یہاں شور ہنگامہ نہیں ہے۔ اب بولو۔“

”میں کیا بولوں؟ ایسے وقت بولتے ہیں، پیچھے کھواس آگے کھائی۔ میں کیا کروں میری مانی؟ مراد موت بن کر آ گیا ہے۔ یہ شاید مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سے کسی طرح بچھوٹا کرو۔“

وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ ”کیا مراد وہاں ہے؟ اسے فون دو۔ ہائے، میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔“

ہڈن نے کبڑی کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مریض اتم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

کبڑی نے فون نہیں لیا۔ اُدھر منہ کر کے بولا۔ ”سوری مریض! میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ سو سوری! ابھی دشمنوں سے نمٹ رہا ہوں۔“

ادھر سے مریض نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ یہ مراد کے لب و لہجے میں بول رہا ہے لیکن آواز وہی نہیں ہے۔“

ہڈن نے کہا۔ ”اس کی آواز دب گئی ہے اور قد سکڑ گیا ہے۔ تمہارا مراد بوتا ہو گیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”کیا بکواس ہے۔ وہ پہاڑ جیسا مرد بوتا کیسے ہو جائے گا؟ اس سے بولو، مجھ سے بات کرے۔“

کبڑی نے مراد کا اشارہ پاتے ہی کوئی بات نہیں کی۔ ہڈن کو کوئی ماردی۔ وہ کراہتا ہوا فون سمیت زمین پر گر پڑا۔ مراد نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کنگ ماری۔ کبڑی ہڈن کا فون اٹھا کر پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ فون سے مریض کی آواز آرہی تھی۔ ”ہڈن! اچپ کیوں ہو گئے؟ بولتے کیوں نہیں؟“

کبڑی کی فون کومنڈ کے سامنے لا کر گانے لگا۔

”میں ہوں یوٹا بازی گر۔ مجھ سے کرو نہ اگر مگر۔ میں ہوں یوٹا بازی گر۔“

اس نے فون کو دور پھینک دیا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح انڈیا کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے باکر جسٹس نے لکھا۔ ”آج کی تاریخ خبر۔ دہلی کی کمرس ٹائٹ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں شراب پیئے والوں کے اندر لہو باہر۔ آج کی تاریخ خبر۔ آج کی تاریخ خبر۔“

اخبارات کی سرخیاں کہہ رہی تھیں۔ ”دائی الیم سی اے ہال میں جہاں کمرس ٹائٹ مٹا رہے تھے وہاں دہشت گرد گولیاں برس رہے تھے۔“

تمام کی وی جینٹلز کہہ رہے تھے وہ دہشت گرد نہیں تھے۔ برطانوی سفارت خانے کے منتظم ہیلری ہڈن کے دشمن تھے۔ اسے ہلاک کرنے آئے تھے۔ خبروں میں یہ بھی لکھا جا رہا تھا۔ ہڈن نام زمانہ قاتل ہیری دی ٹکوں سے آ رہے ہیں اور کسی مراد علی منگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ مراد علی منگی پاکستانی جاسوس ہے۔ وہ یہاں سے ایک اہم راز چرا کر فرار ہونا چاہتا تھا۔ سب ہی کے بیانات کا لب لباب یہی تھا۔

اب تک راجستھان اور یوٹی کے علاقوں میں مراد کا چرچا محدود پیمانے پر تھا۔ اس روز 25 دسمبر کو کبھی باراس کا نام پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا۔ تمام اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ اب وہ کسی علاقے میں چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔

ماروی

پھر اسی دن اخبارات کے صفحے شائع ہوئے۔ ٹی وی کی خبروں میں بتایا گیا کہ پچھلی رات مراد کو دائی الیم سی اے ہال میں دیکھا گیا تھا۔ وہ چھپنے والا سر عام آ گیا تھا اور وہاں ناچتا گا رہا تھا۔

ان خبروں میں ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات کہی گئی کہ مراد علی منگی کا قد چند فٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اب وہ گھٹ کر چار فٹ کا بوتا ہو گیا ہے۔

یہ واقعی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ لوگ ہر گلی اور محلے میں اس بونے پر تبصرے کر رہے تھے اور اس کے متعلق اپنے اپنے طور پر خیال آرائی کر رہے تھے۔

ایم این اے دھرم داس نے بیان دیا۔ ”میں نے اس بونے کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ وہ ہرگز مراد علی منگی نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا ناچنے گانے والا اور تماشے دکھا کر ہنسانے والا جو کر ہے۔ میں اسے ڈائریکٹر جزل آف پولیس اور انڈین اٹلی جنس والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی صحیح شناخت ہو جائے اور وہ بے چارہ معصوم بونا مراد علی منگی کے دھوکے میں مارا نہ جائے۔“

”اس نے مجھے کہا تھا کہ کمرس ٹائٹ کے جشن کے بعد میرے پاس آئے گا لیکن وہاں گولیاں چلی گئیں۔ میں سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں گئے۔ وہ بھی خوف زدہ ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔“

”مجھے امید ہے وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میرا فون نمبر اس کے پاس ہے۔ ایک تو مجھے اس بونے سے ہمدردی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اصل مراد علی منگی جو پاکستانی جاسوس ہے وہ بونے کا ہم شکل ہو کر فائدہ اٹھائے گا۔ وہ ہم سب کی توجہ اس بونے کی طرف لگا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم اس جاسوس کو سرحد پار نہیں کرنے دیں گے۔“

دھرم داس اتر چر دیں جھگت بن کر مراد علی خلاف بیان دے رہا تھا لیکن اپنے دل اور دھرم سے اور یقینی سچائی سے مراد کو بے قصور مانتا تھا۔ وہ اس پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا جھوٹا الزام منانیں سکتا تھا لیکن در پردہ اس کا حامی ہو کر اسے سرحد پار کر سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ کر رہا تھا۔ ایمان علی کی حیثیت سے مراد کا ناشائستگی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ آئندہ عبداللہ کبڑی کی کوآئی جی آف پولیس اور اٹلی جنس والوں کے سامنے پیش کر کے اس کا بھی ناشائستگی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے والا تھا۔

دوسرے دن چینی بائی نے کبڑی کو فون پر مخاطب

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تما جلدی بیماریوں کا موثر اور سب سے بڑا علاج

پھلہری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی ملٹری ایسولڈر بولڈر



اسلام آباد

14 فروری 27 فروری
14 جون 27 جون
14 اکتوبر 27 اکتوبر
14 دسمبر 27 دسمبر



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر
آفس نمبر: 16
فون: 0300-8566188
14 فروری 27 فروری
14 جون 27 جون
14 اکتوبر 27 اکتوبر

پیشہ ورانہ
14 فروری 27 فروری
14 جون 27 جون
14 اکتوبر 27 اکتوبر
14 دسمبر 27 دسمبر

ملتان

کراچی

پیشہ ورانہ
14 فروری 27 فروری
14 جون 27 جون
14 اکتوبر 27 اکتوبر
14 دسمبر 27 دسمبر

پیشہ ورانہ
14 فروری 27 فروری
14 جون 27 جون
14 اکتوبر 27 اکتوبر
14 دسمبر 27 دسمبر

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

دیکھا ہے پھر آدمی رات کے بعد بڈن نے مجھے فون کیا تو ہم وہاں موجود تھے۔ بڈن نے کہا تھا کہ تمہاری آواز دہکتی ہے اور قد کھڑکیا ہے۔ تم بونے ہو گئے ہو۔

”یہ کیا بچوں جیسی باتیں ہیں۔ پلیز جیج بتاؤ۔ تم کون ہو؟ میں نہیں جانتی کہ مراد یوں ہو گیا ہے؟ یہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو بھی نہیں مانوں گی۔“

”ٹھیک ہے کہ یہ نہ ماننے والی بات ہے“ کیا مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہیں مانو گی؟“

اس نے یہ کہتے ہوئے تکلیف سے کراہنے کے بعد ایک لمبی سانس لی۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا تم کسی تکلیف میں ہو؟“

”ہاں ناواش روم میں ہوں۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”یونان سنس اکیا ایسے وقت مجھ سے بات کر رہے ہو؟“

”مجبوری ہے۔ دشمنوں نے اتنا مصروف کر دیا ہے۔ تم سے کیا چھپانا۔ جب ہم بے پور میں چھپے ہوئے تھے۔ یاد کرو وہاں تم میرے ساتھ شاور لیتی تھیں۔ اسی طرح اس وقت بھی میرے تن پر کچھ نہیں ہے۔ ہائے مرینہ! آج آنا۔“

وہ حقارت سے بولی۔ ”اے بونے...! یا اشت پھر کے وجود...! ایک لکڑی کے ٹکڑے میں جا کر کرے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تو گھٹ جانے سے پیار بھی گھٹ گیا ہے۔ کیا آئندہ میرے ساتھ نہیں رہو گی؟“

”تو بے کون؟ یہ پوتا مراد کیسے بن گیا ہے؟ یہ تو بالکل ہی نامکن ہے۔ تو مراد علی منگی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”اگر میں ثابت کر دوں تو کیا مجھے گود میں لے کر میرے بچے کی ماں نہیں بنو گی؟“

مرینہ کا دکھ تازہ ہو گیا۔ وہ ماں بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اسے پھر سے مراد کی ضرورت تھی لیکن جو مراد آنے والا تھا اس کے گلے گتے کے لیے اسے گود میں اٹھانا پڑتا۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کل رات بڈن نے کہا تھا کہ مراد اس کے سامنے ہے۔ جیج یو لو کیا تم نے بڈن کو گولی ماری تھی یا وہاں اور بھی کوئی تھا؟“

”میں تنہا تھا۔ میں نے ہی اسے گولی ماری تھی۔ جب سے تم مجھے بے پور میں چھوڑ گئی ہو، جب سے بڈن اور اس کے آدمی مجھے مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کا قصہ ہی تمام کر دیا ہے۔“

”کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم ہی مراد علی منگی ہو؟“

کیا۔ وہ غیند سے بیدار ہو کر بھا ہی لیٹے ہوئے بولا۔ ”سوری افی! تمام رات بڑی بھاگ دوڑ رہی۔ اس لیے لمبی تان کر سو رہا تھا۔“

”چلو میں نے جگا دیا۔ نیند تو پوری ہو گئی ہے نا؟“

”ہاں۔ آپ اجازت دیں گی تو شاور لے کر فریش ہو کر آپ سے بات کروں گا۔“

”تم جب بھی بات کرو۔ ابھی یہ سن لو کہ اچانک ہی پورے دیس میں تمہارا نام گونجنے لگا ہے۔ ٹی وی دیکھو۔ اخبار پڑھو۔ تمہیں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ میں نے آج شام کو پریس کانفرنس بلائی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے لوگ بھی آئیں گے۔ میری گھبراہٹیں کی اہم عورتیں بھی ہوں گی۔“

”گھبراہٹیں کی طرف سے اخبارات اور ٹی وی کو بیان دیا جائے گا کہ تم مراد علی منگی نہیں ہو۔ تمہیں پاکستانی جاسوس نہ سمجھا جائے اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کہنے کے لیے تم... سے میں تنگ ضروری ہے۔ تم نہادھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں ٹھیک دو بجے گاڑی لے کر آؤں گی اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ اپنا پتا بتاؤ۔“

کبھی نے کہا۔ ”میرا جگر دوست ایمان علی بھی آج آج آپ کی کوشش کے ٹھیک میں ہے۔“

آجائیں۔

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد سو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”تم ہاتھ روم سے آ جاؤ گے تو میں جاؤں گا۔“

اس نے کہا۔ ”دو بجے اقی آنے والی ہیں۔ واقعی ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ تم پر سے یعنی مجھ پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ختم کرنا چاہتی ہیں۔“

”یار! مرینہ کل سے ہمارے فون کے انتظار میں سلگ رہی ہو گی۔ میں نے جیسا تمہیں سمجھایا ہے اسی طرح اس سے دو باتیں کر لو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“

وہ ہاتھ روم میں جاتے ہوئے بولا۔ ”آل رائٹ“ میں ابھی اسے کال کر رہا ہوں۔“

اس نے ہاتھ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر مرینہ کے نمبر پر کال کر کے اپنا لباس اتارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آواز اٹھنے لگی۔ ”ہیلو کون؟“

وہ فون کے پاس آ کر بولا۔ ”میں ہوں تمہارا مراد۔“

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”تم مراد کیسے ہو سکتے ہو؟ بڈن نے پہلے ڈاکٹر جرنل سے کہا تھا کہ اس نے ایک بونے مراد کو

☆☆☆

جنگی بانی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اپنی کار میں آئی۔ مراد اور کبڑی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ اور عبداللہ کبڑی کی ماں بیٹے بن گئے تھے لیکن اس مراد کے بونے پن نے تینوں لڑکیوں کو بہت مایوس کیا تھا۔ ان تینوں نے مراد علی منگلی کے متعلق سنا تھا کہ وہ دیسی بدیسی مجرموں کے ساتھ تھالاڑا آ رہا ہے اور دشمنوں کو ترک میں پہنچا جا رہا ہے۔ ایسی دلیری اور جان بازی کی باتیں لڑکیوں کو حاشا کرتی ہیں۔ ٹینا ورشا اور ڈولی تینوں نے اسے اپنا آئیڈل بنالیا تھا اور اس آئیڈل نے اپنا قدم کھٹا کر ان تینوں کے عشق کو اور ان کے جوش جذبات کو کھٹاکے خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ پٹری بدل کر ایمان علی کی پٹری پر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے چہرے، اپنے قد اور جسامت کے اعتبار سے بہت ہی خوب رو تھا۔ دیکھنے والیاں اس کی طرف کھینچ جاتی تھیں۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہاں ورشا آکر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ٹینا نے اس کے سامنے آکر ذرا تن کر کہا۔ ”ورشا! میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھے یہاں بیٹھنے دو۔“

ورشا نے کہا۔ ”اس صوفے پر چھوٹی بڑی عمر کا صاحبہ نہیں لگتا ہے۔ یہاں بیٹھنے کی جگہ تو ڈولی کے پاس ہے۔“ ”یہ ورشا بڑی چالاک ہے۔ جس پر چاہتی ہے اپنا قبضہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔“ پھر وہ مراد کے پاس آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”ایمان! چلو تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔“

ٹینا نے مراد کو دوسرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”یہ کسی کے پاس نہیں میرے پاس بیٹھیں گے۔“ ورشا اٹھ کر صوفے پر گھٹنے فیک کر مراد سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ ”میں بھی دیکھتی ہوں کس میں ایم ہے۔ میرے ایمان کو کون یہاں سے لے جائے گا۔“ جنگی بانی یہ تناشادیکھ کر ہنس رہی تھی۔ بڑے پیار سے بڑی ممتا سے کہہ رہی تھی۔ ”ان لڑکیوں کا بچپنا نہیں جاتا۔ جب دیکھو بچوں کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔“ ورشا تو پہلے لگ کر بیٹھی تھی۔ اب اچھی طرح لپٹ کر مراد کا دل دھڑکا رہی تھی اور ماں اسے بچی کہہ رہی تھی۔ پھر وہ بڑے پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ ”اے لڑکیو! بہت ہو چکا۔ چلو ہوا دھر آ کر بیٹھو۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے دو۔“ ماں نے اٹھ کر انہیں کھینچ کر وہاں سے ہٹایا پھر ورشا کا کان پکڑ کر کہا۔ ”چل چھوڑ ایمان کو۔ ادھر جا! یہاں

جے پور میں مراد کو جا کر پکڑے۔ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ نے میرے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے۔“ ”تم کو اس کر رہی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ہڈن کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔“ ”آپ نہ مائیں۔ اس ایک غلطی سے ہڈن ڈیجبرس ریکٹ اور ریڈارٹ والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ دشمن یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ اور ہڈن میرے وہاں سے آنے کے بعد مراد پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی خفیہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔“

”اسی لیے آپ کو فون پر دھمکی دی گئی۔ لندن پہنچتے ہی مجھ پر حملہ کیا گیا اور کل رات ہڈن کو انہوں نے مار کر ہی دم لیا ہے۔ آپ نادان نہیں ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہڈن کے بعد صرف میں ہی نہیں آپ بھی ان کے ڈتھ وارنٹ میں ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم جان بوجھ کر مراد کے ساتھ کانٹوں کے بستر پر سونے جا رہی ہو؟“

”آپ کے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اب میں مراد کو ہاں نہیں چھوڑ دوں گی، اسے یہاں لے آؤں گی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا کچھ کہہ رہی ہو؟“

”اس شہر میں ہمارے لڑکے آپ کی جاس اسٹیک حاصل کرنے کی جلدی کر رہے ہیں۔ میرے ماں بے کا انتظار کریں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک اس کے بچے کی ماں نہیں ہوگی، ہم اس کے سر کی قیمت وصول نہیں کریں گے۔ تم کسی بھی پہلی فلاح سے انڈیا چلی جاؤ۔ میں ابھی ٹکٹ او کے کرتا ہوں۔“

وہ فون بند کر کے زیر لب بولی۔ ”وہ میرا قد آور مراد ہوگا۔ اب اسے پیار سے لاؤں گی۔ بونا ہوگا تو ایسا ہاتھ ماروں گی کہ کھڑے کھڑے زمین میں دھنسن جائے گا۔“

اس نے تھوڑے لمحے میں قد آور مراد کو دیکھا پھر اس کے نمبر بچ گئے۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس باوقار آدمی کی آواز سنے گی لیکن دوسری طرف سے نیپ چل رہا تھا۔ ایک ٹرین کی آواز کہہ رہی تھی کہ کسی وجہ سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کی پھر وہی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کبھن بونا کو بھی ہوسم بدل کر بول رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر جنرل نے اسے فون پر کہا کہ اسے دوسرے دن آج صبح تین بجے کی فلاح سے جانا ہے۔ اس کی سیٹ او کے ہو گئی ہے۔

رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں گھٹ رہا تھا۔ پہاڑ کو قصور میں تنکا بنانے سے وہ تنکا نہیں بن جاتا۔ مراد قدم بلند و بالا تھا اور اس کے حواس پر چھار ہاتھ۔ وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ ”نہیں۔ وہ بونا کوئی بہرہ دیا ہے۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مراد کا ہم شکل بن گیا ہے۔“ ”اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا پھر اصلی مراد کہاں ہے؟“

اس نے ذہانت سے سوچا۔ ”وہ چہرہ بدل کر چھپا ہوا ہے۔ ایک بونے کے ذریعے دشمنوں کو دھوکا دے رہا ہے۔“ وہ مضامین سمجھ کر بڑبڑاتی۔ ”میں جاؤں گی اور اس بونے کی گردن دو بونچ کر اصل مراد کو سامنے آئے پر مجبور کروں گی۔ وہ بچ نہیں اگلے کا تو اسے گولی مار دوں گی۔“ وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ انڈیا پہنچ کر کس طرح محتاط رہنا تھا۔ محتاط رہنے کے لیے لازمی تھا کہ مراد پر بھروسہ نہ کرے۔

اگر وہ قد آور مراد سامنے آئے گا، اس سے دوستی رکھے گا تو اس کے بچے کی ماں بیٹے تک نہ اسے نقصان پہنچائے گی۔ نہ کسی کو بچپنا لے دے گی اور اگر یہ درست ثابت ہوگا کہ کسی تاتحرک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے تو وہ اس بابت بھر کے مراد کے بچے کی ماں پر کوئی شک نہیں ہے۔ اس نے بونے کو اپنے دھوکہ پر پورے یقین سے دے دی، اسے کوئی مار کے پچاس لاکھ ڈالر وصول کر لے گی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان اتھوٹی سے فون پر کہا۔ ”سرا! میں ہفتے کی چھٹی جا رہی ہوں۔“

جان اتھوٹی نے سسکا کر بڑے یقین سے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ انڈیا جاؤ گی۔ مراد کے پاس۔“

”آپ صرف مراد کے حوالے سے کیوں بول رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہڈن مارا گیا ہے۔ میں اس کے قاتلوں کو پکڑنے جا رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ہڈن کی ہلاکت کے سلسلے میں وہاں ہمارے جاسوس تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جانے کو نہیں کہا گیا ہے اور نہ ہی میں کہوں گا۔ اب سچ بول دو انڈیا کیوں جاؤ گی؟“

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی غلطی درست کرنے جاؤں گی۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“ ”آپ نے مجھے بے خبر رکھ کر ہڈن کو حکم دیا تھا کہ وہ

”ہاں تمہیں یقین کرنا چاہیے۔ ایک تاتحرک مہاراج نے مجھ سے ناراض ہو کر مجھے پورے سے آدھا کر دیا ہے۔“ وہ اسے بتانے لگا کہ ششمان گھاٹ میں تاتحرک مہاراج کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ ”میں مانتی ہوں۔ جادوؤں کے ذریعے جب ہیبت ناک قتلے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں مانوں گی کہ کسی مہاراج نے تمہیں چھوٹا کر بونا بنا دیا ہے۔“

”پھر تم کیسے یقین کرؤ گی کہ میں تمہارا مراد ہوں؟“ وہ بولی۔ ”میری اور مراد کی ایسی پرستل بات بتاؤ جسے میں اور وہ جانتا ہے۔ کوئی تیسرا جان ہی نہیں سکتا۔“ وہ بولا۔ ”رات کو تمہاری میں بند کر کے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے نہیں آتا۔ میں تیسرا نہیں ہوں۔ تمہارے ایک ایک انداز کو بیان کر رہا ہوں۔“

وہ بیان کرنے لگا تو مرینہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایسی باتیں بتا رہا تھا جسے وہ جانتی تھی اور صرف مراد جانتا تھا۔

بونے نے پوچھا۔ ”کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں؟ مجھ سے اور کوئی سوال کرنا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہماری دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ مجھے آتا ہے بونچا نہیں آجھوں سے دیکھنا ہی ہوگا۔“

”آنے سے پہلے یہ اچھی طرح سن لو۔ میں نے اب تک کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا ہے کہ میں مراد ہوں۔ یہاں میرے حمایتی مجھے ایک سیدھی سادی زندگی گزارنے والا بونا ثابت کرنے والے ہیں۔“

”یہ راز صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ تم وہاں کسی سے یہ بول کر نہیں آؤ گی کہ ایک بونے مراد سے ملنے جا رہی ہو۔ یہ کوئی کہ تمہارا مراد بونا ہو ہی نہیں سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم جانے انجانے میں دشمنوں کو ساتھ لگا کر نہیں آؤ گی۔“

”مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں کہ مجھے کس طرح محتاط رہ کر وہاں آنا چاہیے۔ اپنا پناہ بناؤ۔“ ”جب یہاں انر پورٹ کے باہر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ تم بتاؤ کب آ رہی ہو؟“

”میں ٹکٹ او کے کرانے کے بعد بتاؤں گی۔“ ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔

مرینہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے مراد کو قصور میں دیکھ رہی تھی اور دیکھنے کے دوران میں بار بار اس کا قدم کھٹا

بھٹوں کی۔

وہ بیٹی کو سنا کر مراد کے پاس بیٹھ گئی۔ یوں اس ماحول میں جو پہلے پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔

وہ جتنی بائی سے بولا۔ ”صرف آپ یہ راز جانتی ہیں کہ یہ عبداللہ کبڈی نہیں ہے مراد علی منگی ہے۔ ام ایمن اے دھرم داس بھی ہماری بھتری چاہتے ہیں۔ انہوں نے فون پر کہا ہے کہ وہ مراد کو کل قانون کے اعلیٰ جانفوں کے پاس لے جائیں گے۔ انہیں یقین دلایں گے کہ یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بے چارہ سونا می سے تیار و برباد ہو جائے والا ایک مظلوم یونا ہے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”میں بیان دوں گا کہ پچھلے برس جو سونا می آیا تھا، اس میں میرا پورا خاندان نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اس سمندر کی طوفان کے وقت میں ناگپور میں تھا۔ اس لیے ابھی زندہ سلامت نظر آ رہا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”کوئی اس کے بیان کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ اس کے ماں باپ اور رشتے دار اور دوست یا دشمن سچ بولنے کے لیے اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

جتنی بائی نے کبڈی سے کہا۔ ”مراد اتم یہی بیان ابھی پریس کانفرنس میں دو گے۔ ہم عورتیں تمہاری تائید کریں گی اور پولیس کی جگہ پر جانیں تمہارے ہوئے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں اچھا کھاتے کھاتے ہو اور اب۔۔۔ گھٹا پاشن کی چمچر چاہا میں پناہ لینے آئے ہوں۔“

وہ سوچ سمجھ کر پلاننگ کر رہے تھے۔ یہ طے کر رہے تھے کہ انہیں دینا والوں سے آئندہ کیا کہنا ہے اور کس طرح قانون کے جانفوں کا اعتماد حاصل کر کے جلد ہی یہاں سے پاکستان جانا ہے۔

مراد کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے چپت راؤ کی آواز سنا دی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ اپنی سم بدل دی ہے۔ مجھے یہ یا نمبر دھرم داس نے دیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”سوری میں مصروفیات کے باعث نیا نمبر دینا بھول گیا تھا۔ یہ بتاؤ کیسے فون کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”مرید تم سے رابطہ کرنے کے لیے مچل رہی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے بے چکن ہے کہ کل صبح آٹھ بجے کی خلافت سے آ رہی ہے۔ یہاں دہلی شام چار بجے تک پہنچ گئی۔“

پھر وہ چپتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اسے تیار ہے ہو؟ بے چاری سے دو باتیں کر لو۔“

مراد نے کہا۔ ”تم اسے بیجاری کہہ رہے ہو؟ چائیں وہ کسی آفت ڈھانے آ رہی ہے۔ میں اسے طور پر سمجھ رہا ہوں کہ وہ کیا سوچ کر آ رہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟ بہر حال میں ابھی اس سے بات کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جتنی بائی نے پوچھا۔ ”یوں بے چاری ہے جو آفت ڈھانے آ رہی ہے؟“

کبڈی نے کہا۔ ”اس کا نام مرید ہے۔ یہ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے اور مجھ پر وار بھی کرتی ہے۔ میرے ذریعے پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرنے آ رہی ہے۔“

وہ بولی۔ ”مجھ سے اس پر۔ یہاں آ تو جائے کم عورتیں اس کا یہنا حرام کر دیں گی۔“

کبڈی نے کہا۔ ”نہیں اتنی امیں اس عورت سے تنہا نمٹنا چاہتا ہوں۔ کسی ایسی جگہ اس سے ملنا چاہتا ہوں جہاں کسی کی مداخلت کے بغیر اس سے نمٹ سکوں۔“

”اس شہر کے باہر ہمارا ایک فارم ہاؤس ہے، وہاں تم اس بلا سے نمٹ سکو گے۔“

مراد نے خوش ہو کر کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ آپ کا یہ بیٹا مراد کل ہی اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دے گا یا بیشہ کے لیے ٹھکانہ کر دے گا۔“

”وہ خود کا جائے۔ تو اسے کسی جگہ نہ دے۔“

”وہ بڑی عجیب بلا ہے۔ ابھی ہم فیمل کر رہے ہیں کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔“

”نیتانے کہا۔“ ماتاجی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ دو گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔“

ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں چلو۔“

ڈولی نے کہا۔ ”ہم سب ایک کار میں کیسے سائیں گے؟ ہم چار ماں بیٹیاں ہیں اور یہ دوسرے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ یہ مراد تم لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھے گا۔ میں پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر آؤں گا۔“

ورثا یہ سننے ہی باہر چلی گئی۔ جب وہ سب باہر آئے تو انہوں نے دیکھا، وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر قبضہ جھانے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ ”میں کار میں تنگ ہو کر نہیں بیٹھوں گی۔ اس بائیک پر ہوا کھاتی ہوئی جاؤں گی۔“

نیتانے غصے سے کہا۔ ”دیکھو ماتاجی! اب کتنی چالاک ہے۔ ہم سے پہلے یہاں آ کر بیٹھ گئی ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”میں نے تم سب کو بھجایا ہے جو چالاک ہوتے ہیں وہ بازی مار لیتے ہیں۔ باقی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔“

ماروی

پھر وہ مراد سے بولی۔ ”میں نے اہم چھوٹی سی گاڑی میں ایڑی ہو کر بیٹھیں گے، تم ورثا کو بائیک پر لے چلو۔“

وہ جواب سے بغیر کبڈی کی اور دو بیٹیوں کے ساتھ کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ مراد نے پریشان ہو کر ورثا کو دیکھا۔ وہ جیسے بائیک پر نہیں اس کے سر پر بیٹھی سرکاری تھی۔

وہ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات تمہیں سمجھا دوں کہ میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔“

وہ بولی۔ ”میں بھی کسی کو مہ نہیں لگاتی۔ دوستی تو ہوتے ہوئے ہوتی ہے۔“

کار آگے چل پڑی تھی۔ اس نے کلک مار کر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔ ایک کلک اسے ماروں گا تو پیچھے لگ کر بیٹھنا بھول جائے گی۔ وہ بولا۔ ”بلیز ڈرائنگ، ہو کر بیٹھو۔“

یہ کہہ کر اس نے بائیک آگے بڑھائی تو وہ جھٹک کھا کر اس سے لپٹ گئی۔ ”ہائے میں کیا کروں؟ تمہیں کس کے نہیں پکڑوں گی تو گر پڑوں گی۔“

اس نے تو ابھی طرح کس لیا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور گر پڑو۔

بلا میں اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ بائیک تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ آگے دھمکی سرد ہوا میں تھیں۔ پیچھے جون

جولائی کی گرمی تھی۔ بھگت موم تھا۔ ورثا کے من دو عالم موم بیک وقت حکم کر رہے تھے۔ ورثا کے من کو اور اس کی صحت مندی کو متعارف کر رہے تھے۔

وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”یا اللہ! اس سے پہلے کہ میں ڈمگاؤں یہ گاڑی ڈمگا جائے۔ مجھے یہ نظر آ رہا ہے کوئی حادثہ ہو گا تب ہی یہ لگ ہوگی۔“

اس کی دعا قبول ہو گئی۔ حادثہ تو نہیں ہوا۔ کچھ اور ہو گیا۔ آگے جانے والی کار رک گئی تھی۔ وہ خود نہیں رکی تھی۔ اسے دو گن بیٹھنے لگے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

مراد ان سے کچھ دور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی روک کر ورثا سے کہا۔ ”فورا کسی دکان میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم دیکھ رہی ہو لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ابھی گولیاں چلنے والی ہیں۔“

وہ اپنے بیٹی کوٹ سے ایک پتول نکالتے ہوئے بولی۔ ”ماتاجی نے ہمیں بھاگے اور چھپنے کی نہیں مقابلہ کرنے کی تربیت دی ہے۔“

مراد نے مسکرا کر اپنا ہار والور نکال لیا۔ ادھر دو گن میں کار کی اگلی دو کھڑکیوں پر آکر جگہ جگہ اندر دیکھ رہے تھے۔ جتنی بائی ڈرائیونگ سیٹ پر تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر عبداللہ

کبڈی تھا۔ پیچھے دو بیٹیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک گن میں نے کہا۔ ”تم نے پریس کانفرنس بلائی ہے۔ کیا ارادہ ہے اس بونے مراد کا قانونی طور پر سیکرے رنی دینے کی باتیں کرنے والی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ کیا مجھے یہ نیک کام نہیں کرنا چاہیے؟“

”نصف در کرو۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ بونا ہی اصلی مراد علی منگی ہے۔ چائیں کس طرح بونا بن کر ہمیں الجھا رہا ہے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”میں مراد کا بھل ہوں کہ مراد کی صحت میں پڑ گیا ہوں۔ میں باہر آ رہا ہوں مجھے ابھی طرح دیکھ لو۔ میں نے زندگی میں بھی بددق نہیں پکڑی۔ مراد علی منگی کیسے بن جاؤں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ گویا سپاہی میدان میں اتر آیا۔ ایک گن میں نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہماری گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں لے جا کر تمہاری اصلیت معلوم کریں گے۔“

اسی وقت فائرنگ کی آواز کے ساتھ گن میں کے حلق سے کراہ نکلی، اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔

مراد انہیں اس کی بات نہ سنا۔ انہوں نے ان کے ہاتھ سے آکر ان سے سننے والے تھے۔ دوسرا گن میں مچل جگہ سے بھاگ کر کہیں چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ کبڈی نے اچھل کر اس کی ٹانگ پر ایک لات ماری تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ ادھر سے منہ پڑا۔ اسی لمحے میں ورثا نے ایک گولی ٹھونک دی۔

لڑکیاں بڑی تیز تھیں۔ جتنی بائی نے اچھی ٹریننگ دی تھی۔ کار کے پچھلے حصے میں بیٹھی ہوئی نیتا اور ڈولی دروازے کھول کر چھلانگ لگاتی ہوئی دشمنوں کے پاس آئیں۔ وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے دو چار ٹھوکریں ماریں تو وہ زمین پر ہی پڑے رہ گئے۔

پھر ہر طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگ رہا تھا کیونکہ گولیاں چلانے والے قابو میں آ گئے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔

جتنی بائی کو سب ہی جانتے تھے۔ کتنی پولیس کے افسر نے پوچھا۔ ”مالی! انہوں نے آپ پر ایک کیوں کیا تھا؟“

وہ بولی۔ ”آپ انہیں لے جائیں۔ میری پریس کانفرنس کا وقت ہو گیا ہے۔ میں دو چار گھنٹے بعد تھانے آ کر بیان دوں گی یا ہو سکے تو آپ پریس کانفرنس میں آ جائیں۔“

سایہ زخمی ہونے والے پھر محفل کو اٹھ کر اپنی گاڑی میں ڈالنے لگے۔ پیچھے چھٹنے لگی۔ جتنی باقی مراد اور کبھی اپنی گاڑیوں کی طرف آئے تو ورشا خشک گئی۔ ڈولی اس سے پہلے آکر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یک نہ خدہ دو خدہ۔ دل میں ہو رہی ہے عہد بد۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔“

ورشا نے پاؤں جھٹکتے ہوئے آکر کہا۔ ”ڈولی اب تو یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔“

ڈولی نے کہا۔ ”حکومت کرنے والے گدی چھوڑتے ہیں تو دوسری حکومت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ آئی پیٹنجیو۔ تم مجھے یہاں سے بلانیں سکوئی۔“

ماں نے اپنی کار کے پاس سے آواز دی۔ ”ورشا! یہاں آکر بیٹھو۔ تماشا نہ کرو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ورشا نے حسرت سے مراد کو دیکھا۔ پھر غصے سے پاؤں جھٹکتی ہوئی کار میں بیٹھنے چلی گئی۔ کار اور موٹر سائیکل کا قافلہ وہاں سے چل پڑا۔ مراد نے لگ مار کر بڑی سہولت سے بڑے آرام سے بائیک آگے بڑھائی۔ پھر بھی وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ کر بولی۔ ”کیسی لگتی ہوں؟“

وہ مٹھائی سے کیا بولے کہ بہت میٹھی ہو۔ مٹھائیں سے کیا بولے کہ کچھ میٹھی ہو۔ اسے یہ حالت میں تو بڑے بڑے بار سائیڈ لو بٹوڑ دیے ہیں۔ وہ بہت ہی مایوس اور رُس بھری تھی۔ تو یہ کرنے کے باوجود مراد کے ہوش اُڑ رہے تھے۔

جی میں آ رہا تھا گاڑی کو کہیں ٹکرا ہی دے۔ تب ہی نجات ملے گی۔ ویسے ایمان کی بات ہے۔ خدا اگر بچاتا ہے تو پہلے اپنے بندوں کی پارسائی کو آزماتا بھی ہے۔ مرینہ مونیکا پر پریتا لیز اور شا اور اب ڈولی وہ ہر آزمائی مرحلے سے پارسائی کا بھرم رکھتا آ رہا تھا۔

آگے ٹریفک کا اتنا جھوم تھا کہ جتنی بائی کی کار دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ ”وہ اس چوراہے سے واپس گئے ہیں یا بائیں یا ہمیں سیدھا جانا ہوگا؟“

ڈولی نے کہا۔ ”بائیں طرف چلو۔“ وہ اُدھر چل پڑا۔ آگے گاڑیاں کم تھیں۔ راستہ صاف تھا لیکن ان کی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے رک کر کہا۔ ”وہ کدھر گئے ہیں؟“

ڈولی ہنستے ہوئے بولی۔ ”انہیں تو کانفرنس اٹیئنڈ کرنا تھی۔ ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔ دیکھو ہم ٹھیک پارک کے پاس آکر رے گئے ہیں۔ بڑا خوبصورت پارک ہے۔ کئی جگہ جھاڑیوں کے درمیان لوا سپاٹ بنائے گئے ہیں۔ بہت

ہی رومانٹک جگہ ہے۔ وہاں کوئی روکتا ٹوکتا نہیں ہے۔ ہمیں بڑی آزادی ہوگی۔“

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بڑی وہ ہو۔ چلو اندر جاؤ۔ پارکنگ ایر یا میں گاڑی کا نوکرنے لے کر آتا ہوں۔“ اس نے جواب سے بغیر بائیک آگے بڑھائی۔ ڈولی کھڑی ہوئی تھی، ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”پارکنگ ادھر ہے ادھر کہاں جا رہے ہو؟ سنو تو۔ ارے کہاں جا رہے ہو؟“

وہ رفتار بڑھا تا چلا گیا۔ اس کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسکے میں ڈوبے ہوئے شباب کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ تمام راستے بھرے بھرے بدن کا تعارف پیش کرتی آ رہی تھی۔ وہ پھر بھی نہیں پکھلتا تھا۔

مراد نے ایک جگہ موٹر سائیکل روکی پھر فون پر جتنی باقی سے کہا۔ ”آپ کی بیٹیاں بڑی شوخ اور جھنجھل ہیں۔ آپ نے ورشا کو دیکھا تھا۔ اس نے کیسے میری پائیک پر قبضہ کر لیا تھا۔“

جتنی باقی ہنستے ہوئے بولی۔ ”نادان ہیں۔ ابھی ان کے ہنسنے کیلئے کی عمر ہے۔“

”جی ہاں۔ ڈولی ہنسنے کیلئے ہوئے مجھے راستے سے ہٹا کر ایک پارک میں لے گئی تھی۔ وہاں کسی بھی چیز پر رہی تھی جبکہ مجھے کانفرنس اٹیئنڈ کرنی تھی۔“

”میں ابھی ڈولی کے کان پکڑتی ہوں۔ فون اسے دو۔“

”میں اسے پارک کے سامنے چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔“

”یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ ابھی نادان ہے جتنی ہے۔ اسکی سزا ملے گی تو عقل آئے گی۔“

”وہ بچی تو راستہ جانتی ہے۔ یہ بچہ نہیں جانتا۔ یہاں اندر اردو کے فنٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔“

”انتظار کرو۔ پریشان نہ ہونا۔ ابھی کسی کو بھیج رہی ہوں۔ وہ جہیں یہاں لے آئے گا۔“

وہ انتظار کرنے لگا۔ اس نے صبح کے بعد پھر ماروی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالات اتنی فرصت ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہاں فنٹ پاتھ پر ٹریفک کے شور میں بات کرنا مناسب نہیں تھا لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسے یاد کرتے ہی رنگ ٹون بڑے پیار سے گنگنائے لگی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گزشتہ ایام کسی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے



پہلے آئیے

منصف رام رام

عجب دستور ہے چاہے آپ حقدار ہوں یا نہ ہیں، بس پہلے آئیے، پہلے پائے کے مطابق مطلوبہ چیز آپ کے حصے میں آجاتی ہے۔ یہی ضم اس کے لیے کسی ناسور سے کم نہ تھا جس کی آرزو میں وہ زندگی کے دن کم کر پاتا وہی کسی اور کی تمنا بن کر اس سے دور ہو گئی تھی فقط اسی عجب دستور کے مطابق۔

وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف

عاشق کا اگلا سفر

سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔

اس قسم کے سین ہر فلم میں ہوا کرتے ہیں جب فلمی رائٹر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں کو کس طرح ملایا جائے تو وہ ڈولی اور حزار کا سہارا لیتا ہے۔

یہ ابتدائی جوانی کی بات ہے۔

میں ایک لڑکی کے عشق میں پری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بہت شوخ قسم کی لڑکی تھی لیکن جی خوبصورت ویسے یہ

آپ نے فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا۔

ہیر اور ہیر وٹن ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں لیکن ظالم سماج و ہیر وٹن کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے پھر ہیر و دعا ملتے کسی مزار پر پہنچ جاتا ہے۔

قوالی ہو رہی ہوتی ہے جو پانچ چھ منٹ تک جاری رہتی ہے۔

ہیر وٹن دوران میں آکھیں بند کیے کوئی دعا مانگ رہا ہے۔ قوالی ختم ہونے پر جب آنکھ کھولتے ہیں تو ہیر وٹن

بھی ہر کہانی کا اپنا ایک خاص رنگ ہے کہ لوگ خوبصورت لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی کسی کہانی میں یہ نہیں پڑھا ہوگا کہ وہ بہت بد صورت لڑکی تھی اور میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

بہر حال، میں جس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا، اس کا نام صفیہ تھا اور وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جس میں اس کے ماں باپ کے علاوہ چار عدد پہلوان قسم کے بھائی بھی تھے۔ اسی لیے یہ سوچنا فضول تھا کہ میں ہمت کر کے اس سے اپنی پسند کا اظہار کروں گا۔ البتہ دوسری قسم کے طریقے آزمائے جاسکتے تھے۔ جیسے کوئی وغیرہ پڑھ لیا کہ اپنا ٹائم کی کوشش میں اپنی آنکھیں بر باد کر لیں یا کسی پتھر فیکری کی خوشامد شروع کر دی کہ وہ محبت کے لیے راستے آسان کر دے یا آخر میں مایوس ہو کر کسی مزار پر پہنچ گئے۔

میرا ایک دوست تھا بابر علی۔ میں اس قسم کے اچھے بھٹے معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ میں نے بابر علی سے کہا: ”یاد رکھیں صفیہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”کون صفیہ؟“

”ارے وہی، زمان صاحب کی بیٹی جس کے چار عدد باڈی بلڈر بھائی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن اس سے تو میں بھی محبت کرنے لگا ہوں۔“

”تو پھر فیصلہ کر لو۔“

”ہاں کر لو فیصلہ۔“

یہ ہمارا ایک خاص طریقہ تھا۔ ہم بے شمار معاملات میں اس قسم کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعنی فرض کریں ہوٹل میں چائے پئی جی ہے اب کون پلائے؟ اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا کہ ہم دونوں اپنے اپنے گھر سے قریبی ہوٹل تک کا فاصلہ قدموں سے ناپ لیا کرتے جس کا گھر پانچ قدم نزدیک ہوتا اسے چائے پلائی پڑتی تھی۔

اس معاملے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ میرا گھر اس لڑکی کے گھر سے سو قدم زیادہ قریب تھا۔ نسبت بابر علی کے گھر سے۔ اس لیے بڑی ایمانداری اور چٹائی کے ساتھ فیصلہ ہو گیا کہ اس لڑکی سے محبت کرنے کا حق میرا ہے، بابر کا نہیں۔ چلیں حق تو ان کا لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح؟ تو بابر علی نے مزار پر جانے کی ترکیب بتائی۔ اس نے کہا تھا کہ دے دو تو کہانیوں وغیرہ میں مزار کو آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن چونکہ تمہارے پاس وقت نہیں ہوگا اس لیے مزار ہی سے آغاز کرو۔

اور ہم دونوں مزار پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے بابر علی سے کہا: ”دیکھو بھائی! ایسا نہ ہو کہ تم اپنے لیے دعا مانگنا شروع کر دو ورنہ بڑی گزب ہو جائے گی۔“

”نہیں یار! جب میں پیچھے ہٹ گیا ہوں تو پھر کیوں مانگوں گا؟“

اور میں نے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دعا مانگنا شروع کر دی۔ میرا خیال تھا کہ آنکھیں کھولنے کے بعد اس حسین چہرے کو دیکھنے کا موقع ملے گا لیکن جب اس کے بجائے مجاہدوں کی صورت دکھائی دی تو میں بد دل ہو گیا۔

”یار! تم کیوں کرتا ہے؟“ بابر علی نے تسلی دی۔ ”اب اتنی جلدی تو دعا قبول نہیں ہوئی کچھ صبر تو کرنا پڑے گا۔“

بہر حال تین چار دنوں کے بعد اتنا ہوا کہ صفیہ نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا۔

لیکن پھر ایک ہفتہ اور گزر گیا جب کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے بابر علی سے پوچھا: ”یار! کیا مسئلہ ہے وہ ابھی تک میری طرف راغب کیوں نہیں ہوئی حالانکہ میں نے بہت زبردست دعا مانگی تھی۔“

”یار! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ راغب ہو چکی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا تمہاری طرف راغب ہو چکی ہے؟“

”میری ایسی قسمت کہاں؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ اپنے ٹیوٹر کی طرف راغب ہو چکی ہے۔“

”ہاں تم نے شاید دھیان نہیں دیا ایک ٹیوٹر اسے پڑھانے کے لیے آتا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا تو ٹیوٹری ہو گا نا؟“

”یہی تو اصل کہانی ہے وہ صرف ٹیوٹر نہیں ہے بلکہ میں ان دونوں کو اس ایک ہفتے میں ہی بار بار ملتے ہوئے بھی دیکھ چکا ہوں۔“

”یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”اس لیے نہیں بتایا کہ تمہارا دل ٹوٹ جاتا۔“

”تو اب کون سا سلامت رہ گیا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اچھا خاصا ٹھٹھا ہو گیا ہے۔ دعا میں ہم باتیں اور بہاریں غیر لوشیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک بار پھر مزار پر جاؤں گا اور شکایت کروں گا کہ میرے ساتھ ایسا نا انصافی کیوں ہوئی؟“

میں بابر علی کے ساتھ مزار پر پہنچ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے بہت شکوے کیے۔ ”جناب! آپ کو اپنے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے میرے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ میں نے آخری دعا میں آنکھیں اور آپ نے اس لڑکی کو محبت کی اور سے کروادی۔ اب بھی وقت ہے اس لڑکی کا رخ میری طرف پھیر دیں ورنہ انکی کہانیوں اور فلموں سے میرا اعتبار ختم ہو جائے گا۔“

جی بھر کر شکوہ کر لینے کے بعد مجھے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے بابر علی سے کہا: ”یار، جانے کیوں آج مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا ہے شاید میرا مسئلہ حل ہونے والا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو پیارے۔“

لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوا۔ پہلے تو ایک آدھ بار اس لڑکی نے مجھے مسکرا کر دیکھا مگر پھر اس شکوے کے بعد مسکراتا تو درکنار، اس نے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میری بے قراری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ ٹیوٹر کون ہوتا ہے میری محبت کے راستے میں رکاوٹ بننے والا۔

میں نے ایک بار اس ٹیوٹر کو بھی دیکھ لیا۔ اچھا خاصا

بانکا سانو جوان تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مجھ سے بہتر تھا لیکن بہتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ میری محبت کو مجھ سے چھین کر لے جائے۔ میں اور بابر علی ایک دن جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ”یار! اس ٹیوٹر کا کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ مت کرو۔ دونوں اپنی محبت میں آگے بڑھ چکے ہیں۔“ بابر علی نے کہا۔ ”اس لیے تم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”لیکن یار! میں نے جو مزار پر جا کر اتنی دعا میں مانگی ہیں ان کا کیا ہوگا؟“

”ہوسکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں غلطی نہ ہو۔“

”اب کیا غلطی چاہیے۔ آنسو تک تو نکل آئے تھے۔“

میں نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔“ بابر علی کچھ سوچ کر بولا۔ ”تم ایسا کر مزار پر ایک دیگ خیرات کر دو اور جو لوگ کھانا کھائے ان سے کہنا کہ تمہارے حق میں دعا کریں تب بات بن جائے گی۔“

”مشورہ تو معقول ہے لیکن دیگ کتنے کی ہوگی؟“

”کم از کم تین سو کی۔“ بابر علی نے بتایا۔ (اس زمانے میں تین سو بہت ہوتے تھے)

”یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“

سرمد سوم کی تحریروں
2014 کے آخری شمارے کی تقریباً

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

زمانے کی سفاکیوں اور خود غرضیوں کی تذکرہ ہوجانے والی زندگی کا زندگانی نامہ **احمد اقبال** کے قلم سے

آوارہ گرد • دکھ سکھ کے مشترکہ قصوں کی ایک نئی اور اونگھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سمارش تھا۔ ڈاکٹر عبد الباقی بھٹی کی شہریت

جواہری • احمد اقبال کے شہر قلم سے ایک جواہری کے کھیل کے نکتے انداز

مغرب کی نالی انداز • مغربی دنیا کی تہذیبی اصول کی عکاسی اور محبت کی پھر وہ ناقابل فہم کہانیاں

سروزی کی کہانیاں

پہلی کہانی • چوتھوں کا یہاں انسان سناپ سے زیادہ زبردست ہوجاتا ہے... ایک ہی چوتھوں کی کڑی ضرب... سرمد سوم کے رنگ کی پہلی خوب

دوسری کہانی • خارجی کی گلی کو پھر یہاں ہے... ایک باندی ہولناکی ہستی کا کشی خیر و حال اور بی بی دلپس باتیں... کہانیاں

اما ابوالعباس

تسليم بلگرامي

زبانوں میں تاثیر اور دعائوں میں اثر بلا جواز نہیں... اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے... اور جو لوگ ان ریاضتوں کو اپناتے ہیں گویا اپنا آرام تہج کراڑ مائنسوں سے بھرے رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی اولیائے کرام میں ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور جن کی رضا سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔

راہ حق کی عتائوں اور کرامتوں کا قصہ



مصر کے مشہور زبان صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی علم کا سمندر تھے۔ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں میں ابوالعباس واحدہ فاضل تھے جنہیں شاذلی کے علم کا دارت قرار دیا گیا۔ شاذلی نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات محفوظ ہیں اور حفاظت کا یہ کام احمد ابوالعباس مرسی نے انجام دیا اور بعد میں انہیں سید کی امام احمد ابوالعباس کہا جانے لگا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے کسی نے سوال کیا۔

... کہ وہ لڑکی اپنے ٹیوٹر سے محبت کرنے لگی ہے جو اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ اس میں نے مانگی اور فائدہ کسی اور کو ہو جائے۔

اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی ٹیوٹر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”تم؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تم آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

وہ مجھے قبر والے کمرے سے باہر لے آیا۔ احاطے میں اور بھی کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ وہ بڑی نفاست سے جا ہوا کمرہ تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ گاؤں تک لگے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ”میں نے تمہارا شکوہ تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن تم کیا ہی کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہاں یہ میرا کمرہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس حمار کے کھانے اور سنی پیت میں اس کا کھانا ہوتا ہے۔“

”لیکن تم تو ٹیوٹر ہو۔“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک مولیٰ کا بیٹا نیوز نہیں ہو سکتا!“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارا شکوہ سن لیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ صغیر مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”ظاہر ہے صاحب حمار سے تمہاری رشتہ داری جو نکل آئی ہے۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو کس کا ساتھ دیں گے؟“

”یہ بات نہیں ہے بے وقوف۔ خود اندازہ کر لو، جب میں دن رات یہاں رہتا ہوں تو میں نے اس محبت کے لیے بہت پہلے سے دعا مانگی ہوگی۔ میری درخواست صاحب حمار کے پاس بہت پہلے پہنچی ہوگی۔“

اس کی یہ بات ایک لمحے میں سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہر جگہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، میں اٹھا اور دوسری سمت قدم بڑھا دیے۔ اسی لیے شاید اللہ نے اس کا تختہ میں چاروں جانب رستے ہی رستے بنائے ہیں۔ چاہے جس جانب نکل جاؤ۔

”بھائی تمہارا مسئلہ بھی تو ایسا ہے جتنا ٹیوٹر ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔“ بابر علی نے بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے ایک دیگ غریبوں میں تقسیم کر دی۔ دو چار نے تو بہت دل کھول کر دعائیں دی تھیں جن سے یہ امید ہو گئی تھی کہ شاید میرا کام بن جائے گا۔ وہ ظالم مہربان ہو جائے گی۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ ظالم مہربان ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہوتی چلی گئی۔ خواہ وہ بابا کے مزار پر جا کر میں خوار ہو جاؤں یا تو فلوں وغیرہ میں سب جھوٹ دکھاتے ہیں یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔

اس لڑکی کا اس ٹیوٹر کے ساتھ چکر چلتا رہا۔ دونوں کو خود میں نے نئی بار ایک ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس پر تر تری ہوئے جا رہی تھی۔ بابر علی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ”بھائی میرا مشورہ ہے کہ تم اب اسے بھول جاؤ۔ تم محبت کے معاملے میں زبردستی تو نہیں کر سکتے۔“

”لیکن میں بابا کے مزار پر جا کر شکوہ ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ اتنی خوشامدوں کے باوجود مجھے کچھ نہ ملے۔“

”تمہاری مرضی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں غلطی ہوئی ہو۔“ بابر علی نے کہا۔ ”میرا اس مسئلے کے لیے کچھ نہیں تھا۔“

بابر علی نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن میں پھر دوسرے دن مزار پر پہنچ ہی گیا۔ میں صبح کے وقت گیا تھا اس وقت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ مزار پر سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ حمار کے مجاور اور نگراں حضرات بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بآواز بلند یوں شروع کر دیا۔ ”بابا بہت پریشان اور مایوس ہو کر یہ شکوہ کر رہا ہوں۔ بابا آپ لوگ تو اللہ کے بہت پیارے بندے تھے اسی لیے آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے میں نے آپ کے پاس صغیر نام کی ایک لڑکی کے لیے دعا کی تھی جس کے باپ کا نام غیاث الدین ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اس لڑکی سے میری محبت کا بندوبست کروادیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”بابا میں نے ہزاروں فلوں میں ایسی صورت حال دیکھی ہے کہ دعا ختم نہیں ہوتی کہ محبوب سامنے آ جاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟ ایک بات اور بتا دوں

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو مکاشفے میں کیا نظر آیا؟ حالانکہ میں اتنی ہی بات کا گناہ کار ہوں کہ آج جب میں دربار شاہی سے آ رہا تھا تو میں نے ایک موٹر پر بڑی حسین عورت دیکھی۔ اس کا گدرا یا ہوا شاپ اور جسم اور لباس سے اٹھتے ہوئے جوش اور مستی مجھے دعوت عصیان دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے بے اختیار خواہش کی اسے کاش یہ مجھے مل جاتی اور میں اس کو تصرف میں لاسکتا۔ پھر مرشد! اگر آپ اس کو بدکاری تصور فرماتے ہیں تو میں واقعی گناہ کار ہوں۔“

ابو العباس نے تجسس کی۔ ”اول تو اپنی نظریں نیچی رکھا کر اور جب تجھ کو اپنے آپ پر اتنا اختیار ہو جائے کہ خیالات اور تصورات بھی تیرے تابع ہو جائیں، اس وقت سرخا کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔“

کسی مرید نے آپ کو یوں سرگوشی میں باتیں کرتے جو دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ”معلوم نہیں ابو العباس اس شخص کو کیا سمجھا رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات بتا رہے ہیں تو اس اچھی بات سے دوسروں کو بھی آشنا کرنا چاہیے اور اگر کوئی بری بات کہہ رہے ہیں تو بری بات ان کو زیب نہیں دیتی۔“

آپ نے اس مرید کو آواز دی۔ ”اے معترض! ذرا میرے پاس تو آ۔“

وہ شخص آپ کے قریب چلا گیا۔ آپ نے کہا۔ ”اے شخص! خدا جتو پسند نہیں کرتا۔ اگر میں دوسروں کے راز کھولنا شروع کروں تو اس مجلس کے کتنے ہی چہرے شرم اور ندامت سے جھک جائیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ خدا سدا العیوب ہے۔ خدا نے اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی رکھ دی ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر مرشد! میں اپنی بات پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا معاف کروں گا، معاف کرنے والا تو اللہ ہے، اس سے معافی مانگ۔“

اس شخص کے ہاتھ میں بڑی سی پوتی تھی۔ اسے آپ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”حضرت! اس وقت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو چند روز کے لیے چھٹی چھلاؤں۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور میرا دل رکھنے کے لیے میرے سامنے ہی اس کو تاول فرمائیں۔“

آپ نے پوتی کھلوائی تو اس میں سے کباب، گوشت، روٹیاں اور بھجوریں نکلیں۔ آپ نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قریب موجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب تماشا دیکھا۔ ابو العباس کی پانچول انگلیاں بڑھ گئیں۔ بالکل ایسا لگا کہ وہ انگلیوں کی ساری ریں حرکت ہو رہی ہیں۔

آپ نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اگر کھانے سے پہلے میں تجھے سے چند سوال کروں گا۔ تو ان کے صحیح جواب دے گا کیونکہ تجھ میں ہی تیری نجات ہے ورنہ میں تجھ سے دست کشی اختیار کر لوں گا۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری یہ پجالی کہ میں آپ سے غلط بیانی کروں۔ میں اگر جھوٹ بول بھی دوں گا تو آپ اس جھوٹ کا بے شغف سے پتا چلا لیں گے۔ اس لیے جھوٹ کا فائدہ؟ آپ جو چاہیں پوچھیں، اللہ نے چاہا تو میں سچ ہی بولوں گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”سچ بتا، کیا یہ کھانا تیرے گھر کا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! جی بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے میری دعوت کی تھی۔ میں دعوت میں گیا لیکن کھانا نہیں کھا یا اور وہ کھانا نے کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اب آپ بتاؤ فرمائیں گے تو مجھے خوش ہوگی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اپنا یہ کھانا واپس لے جا کیونکہ درویش مشیت کھانا نہیں کھا سکتے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! مشیت کھانا کیسا؟ یہ بالکل سچ ہے۔ میں آپ کو کھانے کی پاکیزگی کا تعین کس طرح دلاؤں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر تو اس پر مصر ہے کہ میں تیرے میزبان کی ناقص کھول دوں تو سن، تیرا میزبان شراب کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کاروبار کی کمائی تجھ پر اور میرے بیٹوں پر حرام ہے لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے سعادت مند اور صالح مرید ہی میری اولاد ہیں۔“

اس شخص نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”حضرت! مجھے تو بس یہ بات بتائیے کہ آپ نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ کھانا مشیت ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قوت نے میرے ہاتھ اور انگلیوں میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی؟“

مرید نے کہا۔ ”جی ہاں، میں نے آپ کے ہاتھ، انگلیاں اور ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم اور کاٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟“

”حضرت! آپ زندگی بھر جو کچھ فرماتے رہے یا تعلیم دیتے رہے، اسے اگر تحریر بھی فرما جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اپنے پیچھے کتا نہیں چھوڑی؟“

سوال کرنے والے نے عرض کیا۔ ”اگر آپ نے کتا نہیں چھوڑا تو ان کا مجھے علم نہیں ہے اور میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں۔ براہ کرم اپنی تصانیف سے مطمح فرمائیے تاکہ ان سے مسلسل اور مستقل فیض حاصل کیا جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! میری کتا میں میرے اصحاب ہیں اور ان میں احمد ابو العباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔“

شاؤلی کی وفات کے بعد کسی مرید نے ابو العباس سے پوچھا۔ ”ابو العباس! پھر مرشد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جس طرح شیرنی کا بچہ شیرنی کی گود میں۔ آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟“

ابو العباس نے جواب دیا۔ ”اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ طمانیت اور سکون سے رہتا ہے۔ اس کو حرص و طمع، شہرت و نمود اور دوسرے نفسانی مسائل و غلاظتیں رہتے ہیں مگر اللہ اس ولی کی حفاظت کرتا ہے جس سے وہ ولی، اثر اور دنیا سے محفوظ رہتا ہے بالکل شیرنی کی طرح جو اپنے بچے کو بھی کسی دور غلاظت یا پھسلانے والے کے حوالے نہیں کرتی۔“

کسی دوسرے مرید نے پوچھا۔ ”جناب! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پیچھا نہ اس نے خود کو پیچھا، اس کا واضح مفہوم ارشاد فرمائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اس کی خوراک اور عاجزی کے ساتھ پیچھا، اس نے اپنے رب کو اس کی عزت اور قدرت کے ساتھ پیچھا۔“

ان تشریحات نے حاضرین کو جدمیں مبتلا کر دیا اور ہر طرف سے سبحان اللہ، جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

کسی اور نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایک سوال اور۔ حضرت شاؤلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کسی ولی کی حقیقت کھول دی جائے تو وہ پوچھا جائے لگتا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ولی کی پرستش جائز ہے یا یہ گھر کا کفر ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مکان پوچھا جائے۔ جسے خدا پرستش کی توفیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان میں سے فرمایا ہے کہ تم شیطان (شیطان کو مت بولو) اور اس کا وار۔ مطلب ہے کہ شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے وہ تم کو نہ دے، یہی شیطان کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ ولی کی پرستش کا مطلب ہے اس کی پیروی کرنا، اس کی اتباع کرنا۔“

انہی سوال و جواب میں عصر کا وقت آ گیا۔ نماز کی صفیں قائم ہوئیں اور ابو العباس کو امامت کے لیے کھڑا کیا گیا۔ جب وہ نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے مقتدیوں نے کسی ارادے کے بغیر ہی دیکھا کہ ابو العباس کا جسم نور سے بھر گیا اور ان پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔

نماز کے بعد لوگوں نے دلی زبان میں استفسار کیا۔ ”حضرت! یہ نور کیا تھا جس میں آپ کا وجود چھپ گیا تھا اور وہ بارش کسی تھی جو آپ پر ہو رہی تھی۔ بالکل پھوار کی طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم لوگ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو تو سنو، وہ نور جس میں میں چھپ گیا تھا اور وہ بارش جو پھوار کی طرح مجھ پر ہو رہی تھی، شرح تفسیر اور معانی و مطالب کی تھی۔ اگر ان کی تجسیم کی جائے تو میرے عزیز و! ان کی شکل یا تو نور کی طرح ہوگی یا پھر بارش یا پھوار کی طرح۔“

لوگوں نے مختلف طور پر شاؤلی کے اس قول کی تائید کی کہ میری کتا میں میرے اصحاب ہیں اور ان میں ابو العباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔

ایک دن فجر کے بعد لوگوں نے آپ کے آس پاس ہجوم کیا اور سوالات کی بھرمار کر دی۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیتے دیتے نڈھال ہو گئے۔ عین اس وقت جب آپ اٹھنے والے تھے، ایک شخص ہاتھ کا پتہ نکلس میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ”تو اس شخص کو بلاؤ۔“

ایک مرید نے اس شخص کو کٹھان سے پکڑ لیا اور عرض کیا۔ ”بھائی! تجھے ابو العباس یا فرما میں ہے، ذرا رحمت کر۔“

وہ شخص آپ کے پاس آکھڑا ہوا۔ آپ نے اس کے کان کے پاس منہ لگا کر کہا۔ ”اے شخص بتا، میں تیرا راز اپنا راز سمجھوں گا۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔“

اس شخص نے زنا کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ آخر کیا ہے؟“

امیر کے دوست نے اس پر سے واقعے سے عبرت پکڑی مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ اباس بنے زیادہ ہیں، اسنے میں نہیں جتنا ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے انہیں شہور کر رکھا ہے۔ اس کے دل میں آپ کو کیسے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ وہ اسکندر یہ سے قاہرہ پہنچا اور آپ کی مجلس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ وعظ کرتے رہے۔ آپ نے دوران وعظ فرمایا۔

”لوگو! سونٹی اچھی بات نہیں ہے۔ جب تک تم خود کسی شخص کے بارے میں ذاتی طور پر تصدیق یا تردید نہ کرو اس کے متعلق حکم نہ سوچو۔“

اس انجی کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کے لیے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے۔ ”اتفاق سے اس مجلس میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے اسکندر یہ کے امیر کو رخلا کر مجھ سے لڑا دینا چاہا تھا۔ جو میرا امتحان لیتا ہوتا تھا۔ فقراء کے منصب میں امر اکی اور بارداری شامل نہیں ہے لیکن اس شخص نے امیر اسکندر یہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھ پر یہ جبر کرے۔ چلا اپنے دربار میں طلب کر کے میرا امتحان لے۔ میں کچھ ہوں یا نہیں اس سے اس شخص یا اسکندر یہ کے امیر کو تو کوئی فائدہ پہنچتا یا اور نہ نقصان مگر یہ دونوں پھر بھی ورے آزاد تھے۔“

اب یہ شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! آپ اپنی تقریر میں جس شخص کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ میں ہی ہوں۔ میں اپنی غلطی پر تادم ہوں۔ پھر حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”لوگو! میں تصدیق کرتا ہوں کہ فیض تو خدا کی دیا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے بانی مدد کے فیض سے کہتا ہے۔ آج میں تو یہ کہہ کر آپ کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں اور اس طرح شامل ہو رہا ہوں کہ اب یہاں سے نہیں اور جانے کا میں خیال تک نہ لاؤں گا۔“

آپ کی ضرورت سے اسکندر یہ جا رہے تھے۔ راستے میں اسکندر یہ سے پہلے جس شہر میں قیام کیا، اس کے امیر نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں امراء سے نہیں ملتا۔

امیر نے کہلا دیا۔ ”جناب! میں آپ کا مداح ہوں اور آپ سے ملاقات کی دیر نہ خواہش رکھتا ہوں۔“

آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ”وہ میرا مداح ہے لیکن میں اس کا مداح نہیں ہوں۔ پھر وہ کہہ امداح ہے کہ خود تو قاہرہ میرے پاس پہنچا نہیں اس لئے میرے لئے نہ لے گا تو میرا مداح بن گیا اور ملاقات کے لیے مجھ سے مل گیا۔“

امیر کے قاصد نے کہا۔ ”حضرت! آج فجر کے بعد امیر نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”آج لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا کیونکہ فقراء کو امراء کی تحقیریں دے سکتے ہیں۔“

قاصد چلا گیا اور صبح امیر اپنے معالجین کے ساتھ جب آپ سے ملے پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ فجر سے پہلے ہی اسکندر یہ چلے گئے امیر بہت مایوس ہوا اور معالجین سے کہا۔ ”یہ فقراء بھی عجیب لوگ ہیں جو امراء سے خواہ مخواہ بدلتے رہتے ہیں۔“

☆☆☆

ایک دن آپ نے پریز گاری، بہت اور استغنا پر تقریر کی۔ پوری مجلس وجد میں آگئی اور لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ فقراء کے بعد آپ کو اپنے ایک ارادت مند کے پاس جانا پڑ گیا۔ ارادت مند نے آپ کی دعوت کی تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا آگیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کو اس پر حرم آ گیا۔ آپ نے صاحب خانہ سے کہا۔ ”ایک روٹی لاؤ تاکہ میں اس کتے کو کچھ دے دوں۔“

صاحب خانہ نے آپ کے سامنے کئی روٹیاں لا کر رکھ دیں۔ آپ نے اس میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں، یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آپ یہ سمجھ کر شاید کتے کی نظر روٹی پر پڑی نہیں ہے وہ نہ ضرور کھاتا۔ روٹی کو اٹھا کر کتے کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے روٹی پر اپنی نظر ڈالی اور منہ کھیر کر بیٹھ گیا۔

آپ نے کتے سے کہا۔ ”یہ روٹی میں نے تیرے لیے ڈالی ہے، کھاتا کیوں نہیں؟“

کتے نے آپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے روٹی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی اور کہا۔ ”یہ روٹی میں اپنے ہاتھ سے چھو کھلا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ تو شکم بھر کر کھالے تاکہ میں تیری شکم میری سے سرت حاصل کر سکوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو معلوم نہیں کہ مشہور صوفی حضرت حاجی کی کسی انگلی میں ایک ایسی رگ تھی جو انہیں مشیت کا پتہ دے پھر کہ کر باز رکھا کرتی لیکن میری انگلیوں میں ساتھ ایسی رگیں ہیں جو مشیت کھانے کو اپنے قریب دیکھ کر بے اختیار پھڑکنے لگتی ہیں۔“ وہ شخص اتنا خوف زدہ ہوا کہ کانچے لٹا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”حضرت! مجھ کو معاف فرمادیں کیونکہ میں نے یہ مشیت کھانے قعداً آپ کے سامنے رکھا تھا۔ اس طرح میں آپ کی بزرگی اور روحانیت کا امتحان لے رہا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سبحان اللہ، جس کی خدا خود حقائق کر رہا ہو، اس کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے اور خبردار جو تو نے کسی دل چلے کا امتحان لیا کیونکہ اگر اس نے تجھ کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا تو معلوم نہیں تیرا کیا حشر ہوگا۔“

اس کے بعد آپ نے دُور جوش میں اپنی ڈاڑھی پکڑ لی اور فرمایا۔ ”اگر علمائے عراق اور شام کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان بالوں کے پیچھے موجود شخص میں عظمت اور بزرگی کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا ہے تو وہ میری زیارت کو حاضر ہوں اور یہ جی منہ کے بل دی جائے۔“

آپ کا قیام قاہرہ میں ہی تھا لیکن لوگوں نے آپ کو اکثر اسکندر یہ میں دیکھا، اسکندر یہ میں ان کے پیرواؤں کی شاذی رجب تھے۔ ان کی مجلس میں شریک ہوتے، وعظ سنتے اور ختم وعظ پر قاہرہ واپس چلے جاتے۔ شاذی کی وفات کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس کمال کا دوسروں سے ذکر کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد جب یہ شہر ہوا کہ آپ مکاشفہ سے دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں تو آپ کے ایک منکر کو بہت ہنسی آئی۔

اس نے کہا۔ ”یہ مشہور باز بھی کتنے غضب کے ہوتے ہیں، کیسے کیسے کر کے دکھا کر ایک زمانے کو اپنا قائل اور معتقد بنا لیتے ہیں لیکن مجھ کو آج تک کوئی بھی متاثر نہیں کر سکا۔“ اس نے اسکندر یہ کے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ ابو العباس سے قاہرہ سے طلب کرے اور ان سے کرامتوں کا مطالعہ کرے۔

امیر نے اسی وقت ایک فرمان جاری کر دیا اور حکم دیا۔ ”ابو العباس! تم میرا فرمان وصول کرتے ہی اسکندر یہ آ جاؤ، ورنہ میں تمہیں زبردستی بھی بلوا سکتا ہوں۔“

آپ نے مختصر فرمان پڑھا اور نامہ بر کو زبانی جواب دے دیا۔ ”امیر سے کہہ دینا کہ ابو العباس کہتا ہے تو ہر صوفی اسکندر یہ کا امیر ہے اور میں جس امیر کا تابع ہوں وہاں اسکندر یہ کا امیر ہوں۔ امیر کے دیوانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔“

حاکم اسکندر یہ کو جب یہ جواب ملا تو وہ بہت تھلا یا لیکن موقع و مصلحت دیکھ کر اس نے فوراً ہی ایک دوسرا خط لکھ دیا۔ یہ خط نرم زبان میں لکھا گیا تھا اور پورے خط کا انداز دُور پائندہ اور عاجزانہ تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

”میرا سر شہداء! مجھے ایسا حس ہے کہ میری جانب سے آپ کو جو پہلا خط روانہ ہوا تھا، اس کا لب و لہجہ سخت تھا لیکن اب میں شرمندہ ہوں اور آپ سے اپنی پہلی تصویر کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسکندر یہ تشریف لے آئیں۔ میں آپ کی زیارت کروں گا اور آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ میں نے آپ کو غائبانہ اپنا پیار مان لیا ہے، اب آپ بھی مجھ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیں۔“

آپ نے خط پڑھا اور نامہ بر سے کہا۔ ”اگر تیرا حاذق درست ہے تو میرا جواب امیر تک پہنچا دینا۔ یونان کا بادشاہ جب مصر آیا تھا تو موجودہ شہر اسکندر یہ میں اتر آیا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام اسکندر یہ پڑ گیا۔ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسکندر نے اپنے ہم عصر بے غرض اور فاضل فلسفی دیوجانس سے ایک بار کہا تھا کہ دیوجانس! امیر افیض عام ہے اور میں نے بخشش اور انعام سے لوگوں کو بالامال کر دیا ہے اگر تو بھی کچھ آجائے اور اپنی خواہش کا اظہار کرے تو میں تجھ کو بالامال کر دوں گا۔“

اسکندر کی پوری بات سن کر دیوجانس نے جواب دیا تھا۔ ”اسکندر! امیر! ایک غلام ہے، میں نے اس کو کنگم کر لیا ہے لیکن اسی غلام نے تجھ کو اپنا غلام بنالیا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کچھ کیا مانگوں، مجھ کو مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔“

”چنانچہ اسے قاصد! اپنے امیر سے کہہ دینا کہ جس طبع اور ثبوت کو میں نے اپنا غلام بنالیا ہے لیکن اس غلام نے اسکندر یہ کے امیر کو اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں تعظیق پیدا کروں اور اس کے پاس کیوں پہنچوں۔ اور اپنے امیر سے سختی سے کہہ دینا کہ مجھ جیسے آدمی سے دل لگی نہیں کیا کرتے۔ ہم دونوں بھی ایک جانتے ہوں گے۔“

نامہ بر زبانی جواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد امیر نے بڑی کوشش کی کہ خود قاہرہ جائے اور آپ سے ملاقات کرے لیکن وہ ناکام رہا اور ملاقات کی خواہش لیے ہوئے اس دنیا ہی سے کوچ کر گیا۔

کتنے نے روٹی کی طرف دیکھا اور کھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔

آپ کو کتنی ہی حرکت تاگوار گزری اور کہا۔ ”کیوں کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ خدا نے تجھے رزق بھیجنا ہے تو اس کو کھالے۔ تیرے انکار کی وجہ میری بھیجش تو آئی نہیں۔“

ابھی ان کی بات پوری ہوئی تھی کہ انہوں نے محسوس کیا گویا کوئی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ ”اے ابو العباس! آج جس پر ہیز گاری، ہمت اور استغنا پر گھٹنوں وغض کیا ہے انہوں نے جب تیرے سامنے اس کی کوئی عملی شکل آئی تو تو مکمل نام نہانہ نظر آنے لگتا ہے۔“

آپ کے منہ سے چیخ نکلی گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا۔ ”اے ابو العباس! علت ہے تجھ پر کہ کتنا تجھ سے زیادہ پر ہیزگار نکلا۔“ اس کے بعد آپ نے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد آپ نے خلوت نشین اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لوگ آتے اور گھٹنوں بیٹھ کر چلا جاتے۔ انہیں پریشانی تھی کہ آخر ابو العباس کو ہو کیا گیا ہے کہ ملنا جلنا اور بولنا ہی ترک کر دیا ہے۔

آخر ایک مرید نے آپ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ آپ نے اس کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر پہنچ کر یہ محسوس کیا کہ آپ ذرا دیر پہلے شاید رو رہے تھے۔ مرید نے پوچھا۔

”حضرت! آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھ لاشعربیک ہوں۔“

مرید نے کہا۔ ”حضرت! کیا ابھی ابھی اس ناچیز کی آمد سے پہلے آپ غمگین تھے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، تو نے کس طرح سمجھ لیا؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ آگھوں کے نیچے غمگینی کے سیاہ حلقے اور پی کو آسانی دیکھ اور محسوس کر لیتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس دنیا میں خوش کون ہے؟ صرف وہ شخص جو اپنے برے کی تیز بین کر سکے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ نے چند دنوں سے جو رشتہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے مریدوں کو ہر حال میں غمگین کر دیتا ہے۔“

اور وہ اس بدی کا سبب بنانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کون ترانیوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ خاموشی میں عظمت ہے۔“

مرید نے کہا۔ ”آپ کس چیز کو کون ترانی قرار دے رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”وہ سب کون ترانی میں شمار ہوگا جو زبان سے تو نکل جائے مگر خود اس کے معیار پر پورا نہ اترے میں نے محسوس کیا ہے کہ میں نے جن باتوں کی تلقین کی ہے، میں خود ان پر پورا نہیں اترتا تھا۔“

مرید نے کہا۔ ”یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بات جانتا ہوں، وہ یہ کہ آپ اگر یوں خلوت نشین رہے اور اپنے عاشقوں اور اربابِ مندوں کو اپنے دیدار اور کلام سے محروم رکھا تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کی خلوت میں زبردستی داخل ہو جانے کی گستاخی کر بیٹھیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو ہر جا کر شائقین سے کہہ دے کہ میں نے اپنے رب کے ایما پر خلوت نشین اور سکوت اختیار کیا ہے۔ اب جب وہی یہ حکم دے گا کہ میں باہر نکلوں اور لوگوں سے کلام کروں تو ہر آ جاؤں گا۔“

مرید نے خند سے کام لیا۔ ”حضرت! بحث و دھما سے آپ کی کج خراشی تو ضرور ہوگی لیکن میں اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے طبعان کے لیے یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کو اپنے رب کے ایما کا علم کیونکر ہوا؟“

آپ نے کٹے والے واقعہ سا کفر فرمایا۔ ”اس دن میں نے پر ہیز گاری، ہمت اور استغنا پر جو کچھ کہا تھا، بعد میں مجھ کو یہ بتایا گیا کہ میں اپنے وعظ میں جو لاف گزارا رہا ہوں اور جو کون ترانیاں ہاکی ہیں، ان کے اصل مفہوم سے ایک کتا مجھ سے زیادہ واقف ہے مجھ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ چنانچہ اب میں اتنا خوف زدہ ہو چکا ہوں کہ باہر نکلنے اور بات کرنے کی ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”لیکن آپ کے مرید آپ کی یہ باتیں نہیں مانیں گے اور آپ کو اس حجرے سے باہر نکلتا اور لوگوں سے کلام کرنا پڑے گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنے رب کے حکم پر ہی نکلوں گا اور کلام کروں گا تم لوگ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ مجھ کو محاف کر دے اور مجھ کو میرے کلام کے مطابق بنا دے۔“

مرید باہر آ گیا اور اپنی گفتگو سے سب کو مطلع کر دیا۔ لوگ بہت آزرده ہوئے اور بہتوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ آپ باہر نکل کر شرفِ کلامی نہیں بخشیں گے۔

اس بات کو بہتوں نے گزر گئے۔ آپ اپنے حجرے میں مستغرق رہے۔ لوگوں کو یہ انتظار تھا کہ آخر یہ تعطل دور کس طرح ہوگا۔ آخر ایک دن حجرے میں آپ نے ایک روشنی محسوس کی۔ آپ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور غشی کے عالم میں آپ نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔

”اے ابو العباس! تجھ کو اس بات کا انتظار نہیں لینا چاہیے تھا۔“

انہوں نے کہا۔ ”میں شرمندہ اور نادام ہوں اے میرے رب! مجھ کو باہر نکلتے اور لوگوں سے کلام کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گا اور لوگوں کو تعلیم و تلقین کس طرح کروں گا؟“

آواز آئی۔ ”تجھ کو جو علم دیا گیا ہے اور جو طاقتیں ملی ہیں، ان کی نشر و اشاعت بھی تجھ کو عطا ہوئی گئی ہے۔ تو حجرے سے باہر نکل اور حسبِ سابق اپنا کام شروع کر دے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے میرے رب! میں اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری استدعا ہے کہ مجھ کو میرے کلام کے مطابق اعمال رکھنے کی توفیق بھی مرحمت ہو اور آئندہ کی پیشانیوں سے محفوظ رکھ۔“

اس بار انہیں حقیقی حکم دیا گیا۔ ”اے ابو العباس! اب زیادہ قیل و قال نہ کرو باہر نکل کر تنہا جان علم کی پیاس بجھاؤ نہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے تجھ کو کچھ دیا گیا ہے اس کو چھین لیا جائے کیونکہ جو تجھ کو بخشا جا سکتا ہے وہ سب بھی کیا جا سکتا ہے۔“

آپ کو ایک جھکا سا لگا اور آپ ہوش میں آ گئے۔ اسی وقت حجرے سے باہر نکلے اور لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! میں تم میں دوبارہ آ گیا ہوں اور اسی طرح تم میں انہوں نے حضور کا رتار ہوں گا جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔“

لوگوں نے خوشی میں اٹھ کر آگے بڑھے اور احتراماً کھڑے ہو گئے، ہر ایک کے چہرے سے یہی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ روزِ عید ہے اور وہ سب اہلِ علم و ادب اس مبارک روز میں مل جل رہے ہیں۔

☆☆☆

آپ کے پاس ایک انجمنی شخص آیا۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور نہایت دلچسپی اور محبت سے کہا۔ ”آج بھی بیٹھ جا بول، کیسے آتا ہوا؟“

اس شخص نے کہا۔ ”بعض خیالات مجھ کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں ایک چیز کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا خدا پر بیٹھ جا۔ ابھی تیری بات سنتے ہیں۔ مجھ میں اتنا یار کہاں تھا کہ صبر کر کے بیٹھ جا تا، چنانچہ میں آپ کے پاس آ گیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کچھ لوگوں کو مظاہر میں گم دیکھا ہے اور ان کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کیے خفا میں گم ہیں، میں نہیں سمجھ رہا کہ ان میں بزرگ اور برتر کون ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! جو ظہور کا بندہ ہے اور جو خفا کو دوست رکھتا ہے، وہ خفا کا بندہ ہے لیکن جو خفا کا بندہ ہے اس کے لیے ظہور اور خفا دونوں ہی برابر ہیں۔“

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ”حضرت! مجھ کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اس ڈر کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! تو یہ بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھالے کہ جس کی اللہ سے دوستی ہوگی، وہ موت سے ہرگز نہیں ڈرے گا لیکن جو خفا کو دوست ہوگا، وہ موت سے اتنا ہی خوف زدہ ہوگا جتنا خدا نے فرمایا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ کرنا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس طرح خود کو کوئی پرکس کر دیکھے کہ پتا چل جائے گا کہ اپنے دعوے میں وہ کتنا سچا ہے یا کتنا جھوٹا ہے۔“

وہ شخص مطمئن اور آسودہ ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔ ”اب میں اس در کا ہو گیا کیونکہ آسودگی اسی در سے ملتی ہے۔“

جب وہ چلا گیا تو ایک مرید نے کہا۔ ”حضرت! یوں تو ہر روز آپ کے پاس کوئی نہ کوئی انجمنی آتے جاتے ہیں لیکن آپ ان پر

کی دوسری کوئی مثال نہ ملتی مگر اس کے مغرور دل نے مجھ کو اس سے دور ہی دور رکھا۔
مریدوں کو جو اس کاظم ہوا تو اس عالم کے پاس گئے کہ اس کا تاثر معلوم کریں۔ اس عالم نے آپ کے مریدوں کو دیکھتے ہی ان کا مذاق اڑایا، کہا: ”افسوس کہ میں نے تو ابو العباس کا بڑا نام سنا تھا لیکن جب ان سے ملا تو مجھے اپنی برتری اور ان کی کسری کا محسوس ہی میں انکشاف ہو گیا۔“ بفضل خدا میں ان سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں۔
چند دنوں بعد ایک ایسا شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا جو اپنے برے افعال کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس نے آپ کے مریدوں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بھائی! میں حضرت ابو العباس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھے شرف باریابی بخشیں گے؟“
ایک مرید نے آپ سے اس کے لیے اجازت ملاقات چاہی تو ابو العباس کو اس آنے والے پر بہت پیار آیا، بولے۔ ”اس کو فوراً بلاؤ۔ میں اس سے ابھی اسی وقت ملوں گا۔“
اس آنے والے کو فوراً ہی آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ آپ نے اس کو بڑے تپاک سے لیا۔ ”ہاں بھائی کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو؟“
اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! خیریت سے تو ہوں۔ بس آپ کے پاس آتے ہوئے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے آیا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیوں، یہاں آتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہوتا تھا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ میں ایک گناہ گار انسان، آپ خاصہ خاصان، معلوم نہیں شرف باریابی ملے یا یوں ہی ناکام واپس آنا پڑے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرے دروازے پر ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا امیر کا قصر نہیں، درویش کی کتیا ہے اور وہ لوگ جنہیں اپنے گناہوں کا احساس ہے اور اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں، ان کے لیے تو میری کتیا کا درہر وقت کھلا رہتا ہے۔“
آپ نے والا آپ کی باتیں سن کر رونے لگا، بولا۔ ”حضرت! آپ میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں اپنے نامہ اعمال میں مزید گناہوں سے محفوظ رہوں اور خدا تعالیٰ میری توبہ قبول کرے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا تعالیٰ دعا مست اور پشیمانی دیکھ رہا ہے، اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔“
آپ اس کو بڑی دیر تک نصیحتیں کرتے رہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے رہے اور آخر میں کہا۔ ”اور جب تو یہ محسوس کر لے کہ خدا نے تیری توبہ قبول کر لی ہے اور خدا کی توفیق سے تو نے سیدھی راہ اختیار کر لی ہے تو ہمیں سے تو گویا ایک پل صراط پر کھڑا ہو جائے گا کیونکہ تقویٰ اور پرہیز گاری کے پہلو میں، اس سے متصل شیطان بھی آن موجود ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تقویٰ اور.....
چیز پر گاری پر غرور اور غرور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سدا کا دھرا باراد ہو جاتا ہے اور آدمی ایک ایسی دلدل میں اتر جاتا ہے کہ اس دلدل سے خدا ہی نکالے تو انسان نکل سکتا ہے ورنہ ہر راہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔“

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! میں تو آپ کے قدموں میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور ہر قدم پر آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں کیونکہ کسی راہنمائی کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔“

اس کے بعد وہ شخص آپ ہی کے پاس رہ گیا۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس شخص میں بزرگی اور عظمت کے آثار محسوس کیے جانے لگے۔ اس میں عاجزی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا تھا اور احتیاط اور عاجزی کا دامن ہر وقت پکڑے رہتا۔

☆☆☆

شہر میں ایک ایسے شخص کا بڑا چرچا تھا جو حج کر کے واپس آیا تھا اور بہت عالم مشہور تھا۔ آپ کے مرید بھی اس کی شہرت سے خاصے متاثر تھے اور آپ سے دینی زبان میں خواہش کرتے رہتے تھے کہ اس شخص سے ایک بار ملا ضرور چاہیے۔

آپ نے عاجز آکر پوچھا۔ ”تم لوگ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“
ایک مرید نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ وہ بہت عالم شخص ہے۔ اس کی طبیعت کا آس پاس کوئی جواب نہیں۔“
آپ نے پھر پوچھا۔ ”اس کے علاوہ اور کچھ؟“

اتنی جلدی تو جنہیں فرماتے جس طرح آج اس شخص پر فرمائی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کا ایک خاص سبب تھا، یہ شخص پہلے ایک دوسرے پیر کے پاس گیا تھا۔ اس پیر نے اس سے کہہ دیا کہ چند گھنٹے انتظار کر، اس کے بعد تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔ یہ شخص جس کرب اور بے چینی کا شکار تھا، اس میں چند گھنٹے انتظار کا بار نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس کی طرف فوراً ہی متوجہ ہو جانا پڑا۔“
ایک شخص نے دینی آواز میں کہا۔ ”حضرت! اس طرح تو اس پہلے پیر کی خدمت ہو گئی جس کے پاس یہ آگئی شخص آیا تھا اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دوسروں سے افضل اور برتر ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے جو بات کہی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو طمانیت اور آسودگی جہاں سے ملے، حاصل کر لے، تم لوگ میری صحبت میں ہو اور ہمیں رہو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تمہیں کوئی اور شخص پانی کا چشمہ میسر آ جائے تو وہاں نہ جاؤ، تم نہیں بھی جا سکتے ہو۔“

ایک دن ایک مرید آپ کے لیے کھانا لایا۔ وہ کھانے کو اس طرح چھپا کر لایا تھا کہ دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔
کافی رات گئے جب لوگ چلے گئے تو یہ پیشکارہ کیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”تیرا کوئی کام ہے مجھ سے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، میں تو اس لیے رکھا ہوا تھا کہ آپ کے لیے جو کچھ لایا ہوں، لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ کی خدمت میں ادب سے پیش کروں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تو کیا لایا ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”کچھ کھانا ہے جو میں آپ کو کھلا کر داپس جاؤں گا۔“
آپ نے ناگواری سے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا کہ تو کھانا چھپا کر کیوں لایا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”بس یونہی، میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہوں۔“

آپ نے افسوس کیا۔ ”تو نے بہت برا کیا۔ تیرے خیالات فاسدانہ ہیں اور میں ایسا کھانا کسی حال میں نہیں کھاؤں گا جو اس شخص نے بڑی خوشی کی روپ کھانا کھا لیا لیکن آپ نے نہیں کھایا، کھانا واپس کر دیا۔“
چند دنوں بعد ایک دوسرے شخص نے سب کے سامنے اعلان کیا۔ ”حضرت کے لیے آج میں کھانا لاؤں گا۔“

آپ نے اس شخص کو منع فرمایا۔ ”تو یہ کیسا اہمل اور بے ہودہ اعلان کر رہا ہے۔“
اعلان کرنے والے نے کہا۔ ”حضرت! اس میں بے ہودگی کبھی؟ میں واقعی کھانا لاؤں گا، میں جھوٹا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”جس طرح میں وہ کھانا نہیں کھاتا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو، اسی طرح میں وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا جس کا اس طرح اعلان کیا گیا ہو۔“
اس شخص نے بڑی منت سماجت کی لیکن آپ نہیں مانے اور وہ کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک ایسا شخص آپ کے پاس آیا جس کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی وقت کی نماز تھا نہیں ہوئی۔ اس کی آمد کا ایسا شہرہ ہوا کہ آپ کے مریدوں میں بس یہی چرچا ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے لیکن وہ شخص آیا اور آپ کے انتظار میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں نے خبر دی اور کہا۔ ”حضرت! یہ پرہیزگار شخص آپ سے ملاقات کا متنبی ہے لیکن آپ اس سے معلوم نہیں کیوں نہیں رہے ہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں! لوگ، جلدی کس بات کی ہے؟“

کسی نے کہا۔ ”وہ شخص واپس جانا چاہتا ہے۔“
آپ اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی لیکن دوسروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی کہ آپ اس عالم اور زائد سے تپاک اور جوش سے نہیں مل رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ عالم تھا کہ وہ شخص اگر کوئی بات کرتا تھا تو آپ اس کا مختصر جواب دے دیتے تھے، اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہ کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عالم چلا گیا۔
آپ نے فرمایا۔ ”افسوس کہ اگر اس شخص کے دل میں اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا غرور نہ ہوتا تو میں اس سے اس طرح ملتا کہ اس

آپ نہایت مایوس اور افسردہ اپنے حجرے میں واپس پہنچے اور مریدوں سے کہا: ”میں تم لوگوں کے کہنے پر اس شخص کے پاس چلا گیا تھا، ورنہ مجھ کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ میں جنہیں یہ باتیں پہلے ہی بتا سکتا تھا لیکن اس حجرے اور شاہدے سے پہلے تم لوگ شاید میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔“

مریدوں نے بالافتاق عرض کیا: ”ہمیں آپ کی ہر بات پر یقین ہے چنانچہ اگر آپ ہمیں یہ باتیں پہلے بتا دیتے تو ہم سب اس شخص کے پاس ہرگز نہ جاتے۔“

آپ کے مریدوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے یہ دُغم ہو گیا تھا کہ اس نے آپ سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ ابو العباس کے علاوہ کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے آپ کے پاس آنا بند کر دیا اور اس کا امیدوار ہوا کہ کوئی خود اس کے پاس پہنچے اور اسی ادب و احترام کا مظاہرہ کرے جس کا ابو العباس کی مجلسوں میں ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ ایک عرصے بعد وہ آپ کی خدمت میں آیا اور چند مسائل بھی اپنے ساتھ لایا۔ آپ نے ایک نظر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا: ”تو کہاں چلا گیا تھا؟ خیریت تو ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”حضرت! میں موجود تو اسی شہر میں تھا لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں، میں خود مستغنی ہو چکا ہوں۔“

آپ نے فرمایا: ”اے شخص! تو نے یہ کیسی بات کہہ دی؟“

اس شخص نے پوچھا: ”کیسی بات؟ کون سی بات؟ میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا؟“

آپ نے جواب دیا: ”جہاں تک استغنا کا سوال ہے، اس دنیا کا کوئی شخص بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کا تو کر رہا ہے۔“ وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا: ”اے شخص! کیا تو جانتا ہے کہ جب یہ زمین معرض وجود میں آئی تھی تو اس کا کیا حال تھا؟“

مرید نے جواب دیا: ”نہیں حضرت! آپ ہی بتائیں گے تو بات معلوم ہو جائے گی۔“

آپ نے فرمایا: ”خود میں آیت ہی زمین کا ہے یعنی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی پستی کو پہاڑوں کے پوچھ سے زیادہ بلند کر دیا۔ پس یہی حال آسمانی مٹی کا ہے، خدا نے جب مٹی کو پیدا کیا تھا تو یہی بہت بلند تھا۔ خدا نے اس کو مٹی کے عقل کے پہاڑ سے زیادہ بلند کیا۔“

آپ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپ نے ہجوم دیکھا۔ کوئی موٹا تازہ فصل وعظ کرنے میں مشغول تھا اور سامعین دین و دنیا سے بچانے اس کا وعظ سننے میں مشغول تھے۔ آپ اس کا وعظ سننے لگے۔ آپ کے پاس جو شخص کھڑا تھا، واعظ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار واعظ کو دیکھتا اور زربل کچھ کہہ کر رہ جاتا۔

آخر آپ نے پوچھا: ”اے شخص! تو کس کرب و داؤدیت میں مبتلا ہے کہ وعظ بھی غور سے نہیں سن رہا؟“

اس نے آپ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا: ”میرا خیال تھا کہ واعظ کی فریبی اور تر و تازگی میری طرح دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دے گی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہاں میرے سوا ایک بھی صاحب نظر نہیں۔“

آپ نے فرمایا: ”میں تیری بات نہیں سمجھا کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا: ”جناب! میں واعظ میں کوئی اسکا بات نہیں پاتا، جو اس کے زہد اور تقویٰ کی گواہی دیتی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔“

اس شخص نے یہ بات آجی آجی سے کہی تھی کہ کسی اور کے سننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ واعظ نے دوری سے یہ آواز بلند کیا: ”اے شخص! جو مجھے سرگوشی میں جھوٹا کہہ رہا ہے ذرا سامنے تو آتا کہ میں بھی اس سچے اور ایمان دار شخص کی شکل دیکھ لوں۔“

معرض اس لٹکار سے حیرت زدہ ہو بھی ہوا اور غمزہ بھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا: ”حضرت! اس شخص کو میرے اعتراض اور شبہ کا کس طرح علم ہو گیا؟“

اور آپ کے بجائے اس سوال کا جواب بھی اس واعظ نے دیا: ”اُدھوئے سروالے! تو نے میرے منانے پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ میں کیسا اپنے رب کا عاشق ہوں کہ میرا منا یا میرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے حالانکہ میرے دل میں

مرید نے جواب دیا: ”اور یہ کہ وہ حج کر کے آیا ہے اور وہاں سے متعلق بڑی انگیز باتیں کرتا ہے۔“

آپ نے فرمایا: ”تب پھر میں اس سے ضرورتوں کا تم سب بھی میرے ساتھ ہی چلو۔“

لوگ بھی خوشی تیار ہو گئے اور کچھ دیر بعد آپ ان سب کے ساتھ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عالم کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو بہت خوش ہوا اور پھولا نہ سہایا۔

آپ نے فرمایا: ”اے شخص! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ خانہ خدا اور دیار حبیب ﷺ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کی۔“

اس شخص نے جواب دیا: ”بڑی دشوار گزار اور اہم قصص اور راستے میں بھی رہنروں کا حذر کا لگا رہتا تھا۔“

آپ نے فرمایا: ”دیوار حبیب پہنچ کر شاید یہی کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو نہ کر پاے۔“

اس نے جواب دیا: ”میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا محروم آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی نے شہر میں جا بیٹے دل خوش ہو جاتا ہے۔“

آپ نے مزید فرمایا: ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا: ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا جھوم دیکھا کہ دم گھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے پوچھا: ”جناب کالج کیسے رہا؟“

اس نے جواب دیا: ”جناب! بڑا استاسماں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔“

آپ نے انہوں سے کہا: ”اے شخص! تو نے میری ہر بات کا عجیب بے شکا جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیوار حبیب میں آدمی غور و خیرات سے اپنے قابو ہو جاتا ہے اور اس کے پاس کچھ نہ ہو سکتا۔ ایک مدینے پر قابو ہونے میں کچھ مشکل ہے۔“

اس نے کہا: ”میں نے داخل ہو کر اس کے زمانے کا قلمبند کر لیا ہوں میں قید ہو جائے ہیں اور آدمی وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے جو حرم پاک کی تعمیر اور اس کے نشیب و فراز سے متعلق ہے لیکن تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ تجھ کو حجاج کے ہجوم سے دشت ہونے لگی تھی اور اب سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ حج کیا تھا؟ تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ بڑا استاسماں تھا۔ پانی کی بہتات تھی اور تجھ کو وہاں کی ایک ایک چیز کے نرخ ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تیرے حج میں وہ کون سا جذبہ شامل ہے جس کی میں تعریف کروں، وہ کون سا عشق تھا جس کا ہم سب احترام کریں؟“

اس شخص نے کہا: ”حج میں جذبے یا عشق کا کیا کام؟ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نے حج کر لیا جب کہ دوسرے بہت سے لوگ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی اور وجہ فخر سمجھتا ہوں۔“

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا: ”میرا خیال ہے بقیہ باتیں نماز کے بعد ہو جائیں گی، آؤ پہلے ہم سب نماز پڑھ لیں۔“

اس شخص نے فوراً جواب دیا: ”بے شک، بے شک۔ پہلے نماز پڑھ لیں۔“

وہ شخص فوراً وضو کے لیے بھاگا۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ آپ نے دیکھا وضو میں وہ بار بار ہاتھ دھو رہا ہے پھر چہرہ دھو یا تو تین کے بجائے چار مرتبہ دھو یا اور جب ایک بار زیادہ کا خیال آیا تو دوبارہ دھونے لگا اور پانچ مرتبہ دھو گیا۔ پھر غلطی کا احساس ہوا تو تیسری بار چہرے پر پانی پھیرنے لگا اس طرح مسلسل دوسوں میں جتنا رہا۔

آپ نے فرمایا: ”مغرب کا وقت تنگ ہوتا ہے، خدا کے لیے وضو سے جلد از جلد فارغ ہو جاتا کہ نماز میں تاخیر نہ ہو۔“

یہ مشکل وضو کر کے آیا اور امام کی جگہ جا کھڑا ہوا۔ آپ کسی اعتراض کے بغیر اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلی رکعت میں ہی اس نے عین سجدے کے۔ یہاں تک کہ نماز کے ختم ہوتے ہوئے اس نے کئی سجدے غلط کیے۔

آپ نے دوبارہ نماز ادا کی اور اپنے مریدوں سے فرمایا: ”تم سب اس کے کس علم کی تعریفیں کیا کرتے تھے؟ اس علم کی جو سب اور دوسوں کا شکار ہے۔ جس شخص کو وضو اور نماز کے پانچ وقتی معمولات میں دوسوں نے تنگ کر رکھا ہو، میں اس کی طہیت پر کبھی یقین نہیں کروں گا۔ اس کا علم بھی اسی طرح سہوا اور دوسوں میں مبتلا ہو گا۔“

اقوال زریں

- ☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھے سے تنہائی بہتر ہے۔
- ☆ کم بولنا عقلمندی ہے۔
- ☆ مصیبت کا شکوہ نہ کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
- ☆ علم ایک ایسا بال ہے جس سے رحمت برتی ہے۔

مرسلہ: محمد صفر معاویہ، خانپوال

چھوٹے سے ناؤں میں زلزلہ زدگان کے لیے کچھ امداد جمع کی گئی ہے۔ نکولس اس ناؤں میں میز کا انکش لڑنے والا تھا اور بہت زیادہ مقبول بھی تھا۔ اس نے امدادی مہم خود ہی منتظم کی تھی جس کے بعد لوگوں نے اسے امداد دینا شروع کر دی۔ جب امداد جمع ہوئی تو ناؤں ہال میں باضابطہ میٹنگ ہوئی اور نکولس ریکارڈ لو مسکیو نے ڈنٹ داری لی کہ تمام رقم خود پاکستان کے شانی علاقوں میں جا کر امدادی کام کرنے والوں کو دے گا۔ ناؤں ہال میں موجود لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ نکولس کی شان میں تقریریں کی گئیں جو اپنا وقت نکال کر اسلام آباد جانے کے لیے تیار تھا کہ امدادی رقم یہ ساری باتیں مجھے الفریڈ وین کا سی نے بتائیں۔ الفریڈ دیمیرا اور ادا دوست تھا۔ ہم دونوں لندن کے ایک قلیٹ میں ایک ساتھ مقیم رہے تھے۔ وہ ایک پب میں کام کرتا تھا اور میں چیئرنگ کر اس کے علاقے میں ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بirtا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہے تھے۔ وہ انکش لڑ چر پڑھنے آیا تھا اور میں موسیلا لوجی میں ماسٹر زک رہا تھا۔ ہم دونوں کی خوب جتنی تھی۔

یونانی لوگ بھی خوب مسالے دار کھانا کھاتے ہیں۔ تیز مرچیں، بہت سارا گوشت، ان کی اپنی ایک خاص قسم کی پیاز ملی ہوئی روٹی ہوتی ہے، اوپر سے شراب کے گلاس، نہیں بلکہ جار۔ الفریڈ کو میرے پکائے ہوئے چاول اور پاکستانی ہولٹوں کا نان بہت پسند تھا۔ ہم دونوں کی خوب دوستی تھی۔ دونوں ساتھ گھومے، ساتھ ہی بہت سی شراب بھی پی اور بہت سی لڑکیوں دوستیاں بھی کیں۔ میرے عشق عام طور پر ناکام ہو جاتے تھے اور الفریڈ کی تلاش میں لڑکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاہلیت تھی۔ وہ

پیدائشی عاشق تھا اور کمال کارودمان پرور۔

پاکستان واپس آنے سے چھ ماہ پہلے میں الفریڈ وکے ساتھ یونان بھی گیا، اس کے ماں باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی سے ان کے گاؤں جا کر ملا۔ وہ بڑے گرم جوش لوگ تھے، بہت پیار سے ملے اور ایسے ہی خاطر کی جیسے ایبٹ آباد میں میرے گھر والے کرتے۔

الفریڈ نے تو مجھ سے اور اپنی بہن سے کہا بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بچھیں، ڈیٹنگ کریں اور مجھ سے اس نے ہنس کر کہا کہ یونان والے مجھے داماد بنائیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی اتنا ہی پاگل ہوں جتنا کہ یونانی پاگل ہیں۔

شاید اس کی بہن کو میں نہیں جانتا اور یا خود اس کی خوب صورتی گرم جوشی دیکھی اور جاذب نظر کی گئی تھی۔ آپ کو آدہ نہیں کر سکا کہ پاکستان واپس جانے کا پروگرام ختم کر دوں اور یونان کا داماد بن جاؤں۔

وہ ایک جتنے کی دلچسپ ملاقات تھی۔ شاید ہلکا سا شعلہ دونوں طرف جلا، الفریڈ وکے ہوا پنے کی کوشش بھی کی مگر یہ شعلہ آگ نہیں بن سکا۔ میں واپس لندن پھر لندن سے ایبٹ آباد آ گیا۔ ایبٹ آباد میں ہی میں ایک تنظیم میں شامل ہو گیا اور علاقے کی ترقیاتی سرگرمیوں کے کاموں میں لگ گیا۔

الفریڈ وکے پڑوسی ملکات آباد کی ایک عورت پر ہوتی رہتی تھی۔ پھر اچانک یہ زلزلہ آ گیا۔ ہمارے علاقے میں ایسے ہنگامی حالات بھی نہیں آئے، میں نے زلزلہ کی میں ایسی افراتفری نہیں دیکھی، دیکھتے دیکھتے ایبٹ آباد ہانسرہ ہالا کوٹ، مظفر آباد، بٹام میں دنیا بھر کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پاکستانی اداروں کے علاوہ فرانس کے ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم کے ڈاکٹر، کینیڈا اور امریکا کے فوجیوں کا میڈیکل کیمپ، روس، یوکرین کے ڈاکٹر اور نرسیں، ترکی، ایران، سعودی عرب اور امارات کی ٹیم اور نہ جانے کون کون سی تنظیمیں آتی جلی گئیں۔

میں سب سے زیادہ کیوبا کی ٹیم سے متاثر ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ آگئے تھے اور انہوں نے کئی گروپوں کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر، نرس، سرجن، کارڈینر، آپریشن جینرل، فیکٹیشن، ڈسپینسر، فارماسسٹ، پلاسٹر کرنے والے، صفائی کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ کہیں بھی رہنے کو تیار تھے، کسی بھی جگہ پر اپنے ٹینٹ لگا کر گرم ٹھنڈ سے پانی کی فکر سے بے نیاز۔ خدمت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اگر کچھ کر رہے تھے تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہمارے اپنے لوگ تھے، ہم نہیں کرتے تو کون کرتا۔ کیوبا سے کا تعلق تھا ہمارا، انہیں کیوں لگتی تھی۔ ان ہنگامی حالات میں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے پاکستانی ڈاکٹر وہاں بھی کام نہیں کر سکے کہ انتظامات اچھے نہیں تھے، پانی گرم نہیں ہے، رات بڑی ٹھنڈی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور کچھ لوگ تو صرف تصویریں کھینچنے آئے اور ٹیلی ویژن پر ماہر بن کر ایسی باتیں کرتے تھے کہ مجھے غصہ کم اور ہنسی زیادہ آتی اور اپنی قوم کے بڑھے لکھے لوگوں کی حرکتوں اور ذہنی افلاس کو دیکھ کر نفوس ہوتا تھا۔

ہماری حکومتوں نے پچاس برسوں میں نہ پانی میا کیا، نہ سیوریج سسٹم اور نہ ہی پرائمری ہیلتھ کیئر۔ ہمارا علاقہ تو سیر و تفریح کی ایک ایسی جگہ تھی جسے ایک انخواستہ طوائف کی طرح لوٹا گیا ہو۔ عوام کی قسمت جیسی پہلے تھی اب بھی ویسی ہے۔ اب زلزلے کے بعد اربوں کی امداد آئی تھی اور حکومت امداد کو اپنے طریقے سے خرچ کر رہی تھی، اسی طریقے سے جیسے حکومتیں کرتی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں بلائنگ کرنے والوں سے کہتا کہ کچھ نہ کریں صرف صاف پانی اور سیوریج کا نظام بنا دیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پہنچی جلی نہیں پہنچا دیں، سبک ہیلتھ کیئر کی بندوبست نہ کریں، پانی بلڈنگوں کو ہی رحمت کی دہاں ڈاکٹر اور نرسیں کا انتظام کریں۔ مگر یہ سارے کام تو بہت ہی چھوٹے کام تھے اور حکومتیں چھوٹے کام نہیں کرتی ہیں۔ ان کے بڑے کام ہوتے ہیں، میگا پروجیکٹ، موٹر وے، اینیم بم، کالا باغ ڈیم وغیرہ وغیرہ۔

نکولس انرپورٹ پر آسانی سے مل گیا، وہ چھوٹے قد کا، مہیا سا گورا چٹا آدمی تھا، بولنا بہت تھا اور اس کی انکش بھی اچھی تھی۔ میں اسے انرپورٹ سے سیدھا مانسہرہ لے جانا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ اسے میرٹ ہوگی سے ہو کر جانا ہے۔ ہم لوگوں نے میرٹ میں جانے کی۔ نکولس نے کاؤنٹر پر کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر ہم لوگ مانسہرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات تنظیم کے دفتر کے مہمان خانے میں گزری تھی۔ نکولس نے بتایا کہ الفریڈ واکل کل بڑا سمجانی بن گیا ہے۔ اس نے اپنے شہر کے بہت سارے قصبے منائے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح سے الفریڈ وکے اسے کہا تھا کہ پاکستان کے لیے میسج جمع کرے اور اس طرح سے انکش سے پہلے ہی وہ توجہ کا مرکز بن گیا اور اب انکش میں اس کی کامیابی تھی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چھوٹے سے ساحلی شہر کے

لوگوں نے کئی طریقوں سے زلزلہ زدگان کے لیے چندہ جمع کیا۔ پورٹ کے ملازمین اور اسکول ٹیچروں نے ایک دن کی تنخواہ دی، اسکول میں بچوں نے پیسے جمع کیے، شہر کے ہر دکاندار نے ایک ایک دن کی آمدنی کا تیس فیصد دیا اور اب اس کے پاس ستانوے ہزار یورو تھے جس کو اس نے یہاں خرچ کرنا تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے ناشتے کی میز پر ہی کر لیں۔

ایک چھوٹے سے یونانی شہر میں پاکستان کے زلزلہ زدگان کے لیے اتنی رقم بھی جمع ہونا بڑی بات تھی۔ اس نے الفریڈ وکے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ سیاست میں جانے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کا کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری کڑاوش ہے کہ پرچا منظمی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بیک اسٹال کٹانم چال چرچا کتاب
- ☆ شہر اور علاقے کا نام
- ☆ ممکن ہو تو بیک اسٹال کٹانم PTCCL میں فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ ہبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-C نمبر 11 اسپنشن وٹس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوئی روزہ، کراچی

35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

چھان بین

تنویر ریاض

جس طرح ایک دنیا انسان کے اندر اور دوسری باہر آباد ہوتی ہے اسی طرح سرحدوں کے اس طرف اور اس کی دوسری جانب زندگی کا رنگ ڈھنگ بھی ذرا الگ ہوتا ہے۔ اس نے مغربی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس کی رنگینوں میں گم ہو گئی۔۔۔ اس کے باوجود کوئی ایک رنگ بھی اس کی شناخت نہ بن سکا حتیٰ کہ عاشقوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو گئی مگر کوئی ایک نام بھی آخری نہ ہو سکا۔

چون ساچی کی تلاش اور چھان بین میں جیون تمام کرنے والی ایک دوشیزہ کی سراغ رسانی

جب لیانا نے جمیری کو اس کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے باہر کھڑی ارغوانی رنگ کی وین میں سوار ہوتے دیکھا تو اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اس وین کی ڈرائیور والی سائڈ پر سفید رنگ سے میڈولارک نمبری لکھا ہوا تھا۔ یہ واقعی غور طلب بات تھی کہ جمیری اس وین میں کیوں سوار ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے اس نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کی سیدان کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیانا نے اس دین کو بھی اپنے ذہن میں موجود دوسرے سوالوں کی فہرست میں شامل



ضرورت نہیں ہے بلکہ نکولس کی مہانداری بھی بند کر دی جائے۔ یہ روایت بھی قابل قبول نہیں تھا۔

الفریڈو نے زیادہ بات نہیں کی مگر اس کے لہجے کا غصہ بتا رہا تھا کہ اسے بہت افسوس ہوا ہے۔ اسی وقت میں نکولس کو نکلیں گے۔ اس نے میرے اس یکا یک فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا مگر الفریڈو کے فون کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ فوراً ہی اسلام آباد چلا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میریٹ ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

اسے میں نے ایک ہفتے بعد میریٹ ہوٹل میں ہی دیکھا۔ میں ڈیوایچ اے کی ایک میٹنگ ختم کر کے باہر آکر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے وہ نظر آیا ایک سیٹھ ناظم کے ساتھ۔ ان کے ساتھ دو عجیب قسم کی عورتیں بھی تھیں۔ بڑے بے ڈھنگے طریقوں سے وہ سب ہنس رہے تھے، مجھے یقین تھا کہ ان سب نے چڑھائی ہوئی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آیا، ہاتھ ملایا اور بولا کہ میں نے پیسے ان لوگوں کو دے دیے ہیں۔ مجھے رسید بھی مل گئی ہے اور آج رات میں واپس جا رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کیا کہتا، گڈ لک بول کر آ گیا۔ میں اس ناظم کو جانتا تھا، اس کے بہت سے قصے مشہور تھے۔

دو ماہ بعد الفریڈو کا فون آیا، اس نے حنائی مانگ کر اسے نکولس کو پہنچانے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے اس بات اور ہے، میرے یا تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے لوگ اپنا جہم بچتا بند نہیں کریں گے۔ یہ تو چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اگر پاکستان جا کر وہ کسی طوائف کے ساتھ وقت گزارتا ہے تو کسی کو بھی تکلیف نہیں ہوتی چاہے لہذا میں نے تمہاری بات منی میں اڑادی تھی لیکن نکولس نے جو جعلی رسید کی بات کی کہ وہ قابل برداشت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم میں خیانت نہیں ہوتی چاہے۔

اس نے مجھے ہنس کر بتایا کہ مقبول ہونے کے باوجود نکولس میزکار الیکشن ہار گیا ہے۔ الفریڈو نے ہی اس کے خلاف مہم چلائی تھی، لوگ ہر بات معاف کرنے کو تیار تھے لیکن یہ انہیں منظور نہیں ہوا کہ مالی بدعنوانی میں اس کا ساتھ دیں۔ لوگوں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالا۔ وہ اپنے شہر کا میئر کی بدعنوان کو کیسے بناتے۔

مجھے نکولس کے ساتھ بیٹھا ہوا ناظم یاد آ گیا جس نے اسے جعلی رسید بھی دی، طوائفیں بھی میاں کیں اور الیکشن بھی جیت گیا تھا۔

کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کی حیثیت بہت مضبوط ہے کیونکہ اس کا نام ایک ایماندار صحافی کی طرح جانا جاتا ہے۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

اخبارات میں خبر تھی کہ مانسہرہ سے مظفر آباد کے راستوں پر بڑک روک کر زبردستی امدادی سامان چھین لیا گیا ہے۔ ایک ناظم نے سامان اپنے گھر پر اتار لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جب لاکھوں لوگ زلزلے کا شکار ہوئے ہوں، زندہ جسم لمبوں کے گھپ اندھیروں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے ہوں، انسان، انسان کو لوٹے یہ توڑا اندھیرا ہے۔

شام کو عجیب بات ہوئی، میں نے نکولس کے لیے مری بیٹر کی کچھ بوتلوں کا انتظام کر دیا تھا جنہیں اس نے اچھے یونانیوں کی طرح پانی سمجھ کر خوب پیا۔

شام کو اس نے فرمائش کر دی کہ کسی لڑکی کا بندوبست کیا جائے۔ میں سمجھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تو اس نے کہا کہ لڑکی کا مطلب ہے کہ کسی طوائف کا انتظام ہو۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے سختی سے کہا کہ وہ ایسی فرمائش نہ کرے تو بہتر ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسی وقت الفریڈو کو فون بھی کیا اور اسے نکولس کی فرمائش بتائی۔

دوسری طرف سے اس کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی اور اس نے ہنسنے ہوئے کہا کہ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔ اسے کہہ دو کہ تم طوائف کا بندوبست کر سکتے ہو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مجھے اس کے ہنسنے پر تھوڑی حیرت ہوئی۔

دوسرے دن نکولس نے مجھ اور ہی فرمائش کر ڈالی۔ اس نے کہا کہ دو دن اس نے کام نہ دیکھ لیا ہے، دو دن میں وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ جتنی رقم اس کے پاس ہے اس سے ہم لوگ مزید شیٹ خریدیں اور اس کا انتظام چلائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کسی بھی شیٹ بستی کے سامنے اس کی تصویر لے لی جائے۔ دوسری فرمائش یہ تھی کہ اسے ستانوفے ہزار یورو وصول کرنے کی رسید دی جائے جبکہ وہ ہمیں چواہیس ہزار یورو دے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے رات پھر الفریڈو کو فون کیا۔ میں نے طوائف کے سلسلے میں اس کے رویتے کی شکایت بھی کی اور نکولس کا نیا مطالبہ بھی بتایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے الفریڈو کی زبان کسی نے کاٹ دی ہے۔ تھوڑی دیر تو وقف کے بعد اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا کہ نکولس کو جعلی رسید دینے کی

کر لیا جن کے جوابات ابھی ملنا باقی تھے۔ وہ ابھی تک ججری کی بہت سی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی مثلاً جب اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں کافی کی میز پر مختلف نوعیت کے رسالوں کا ڈھیر بھی اس کی کچھ سے باہر تھا۔ وہ ان تین تصویروں کے بارے میں بھی جانتا چاہتی تھی جن میں وہ ایک چھوٹے سے طیارے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت بتاتا تھا جبکہ اس کے اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر کرائے کا تھا۔ اس کا اندازہ لینا تو اس وقت ہوا جب وہ اپنے جیشے کا کسٹا اٹھانے کے لیے فرش پر بچی تو اس کی نظر کاؤچ کے نیچے لگے ہوئے کچن کے آئینہ پر پڑی اور اب یہ زسری وین کا معاملہ سامنے آ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا کاروبار ہو لیکن ججری نے بھی اس کے بارے میں بتایا نہیں۔ ججری سے اس کی ملاقات کو دو مہینے سے بھی کم کا عرصہ ہوا تھا لیکن اس دوران ایسی بہت سی باتیں سامنے آئیں جن کی چھان بین ضروری تھی۔

جو بھی ججری کی وین روانہ ہوئی، لینا نے بھی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا پھر اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ ایک بچ کر پچاس منٹ ہو رہے تھے اور گھر اس کا تعاقب جاری رکھتی تو اسے اپنے کام پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ ویسے بھی اسے اس تعاقب کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے وین کا پیچھا کرنے کے بجائے اس کا لائسنس نمبر میٹ پر رکھے ہوئے پیڈ پر لکھ لیا۔ وہ اس نمبر کے ذریعے وین کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن فی الحال اسے یہ کاغذ اس فائل میں لگانا تھا جو اس نے مسٹر ججری جیس جونیئر کے نام سے کھولی تھی۔

☆☆☆

آٹھ مہینے پہلے اس نے ہوائے فریڈ نمبر سولہ یعنی سام کی فائل بند کر دی تھی۔ وہ چھوٹا ہونے کے علاوہ بڑا بھی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کے بعد درجہ بڑھے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ مثلاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہ پیشہ ور کارکن ہیں ڈرائیورہ چکاسے، کسی طرح بھی ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اگر اس کا دعویٰ سچ ہوتا تو وہ ڈر کے بعد کار چلا تے ہوئے ایک حادثے سے بال بال نہ بچتا۔ اگر مبین وقت پر دوسری کار کا ڈرائیور ہوشیاری نہ دکھاتا تو دونوں کاروں کا ٹکرا جانتی تھا لیکن اس وقت تک اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ پہلی ملاقات میں قائم ہونے والے تاثر پر بھروسہ کر کے کیونکہ ماضی میں

بھی اسی طرح کے تجربات ناکام ثابت ہوئے تھے۔ اگر اس میں لوگوں کو سمجھنے کی پرکھ ہوئی تو صرف چوبیس سال کی عمر میں وہ ستر حوالے تعلق قائم نہ کر رہی ہوتی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک اس نے جتنے لوگوں سے بھی دوستی کی، ان سب نے اس سے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپایا جس کی وجہ سے ہر تعلق ٹوٹا چلا گیا۔ کبھی بھی وہ سوچتی کہ کاش اس کے پاس ایسا آلہ ہوتا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے عہد جان سکتی۔ اس طرح کم از کم وہ ان بے نتیجہ تعلقات سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہوائے فریڈ نمبر چودہ یعنی جبک کی مثال سامنے تھی۔ اس نے لینا سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں لیکن لینا نے باتوں باتوں میں بہت کچھ جان لیا۔ مثلاً اس کے ایک دوسری عورت سے بھی تعلقات تھے اور اس نے وقتی طور پر سنڈی سے ملنا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ حیران تھی کہ جبک ایک جانب تو اس سے تعلق قائم کیے ہوئے تھا اور دوسری جانب دوبارہ میٹری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ اسے بعد میں کسی اور ذریعے سے معلوم ہوئی کہ اسے بلباں پسنڈ نہیں بلکہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا جبکہ لینا کو اپنی باتوں میں ”فے“ سے بہت پیار تھا اور جتنی دیر وہ گھر پر رہتی ہے اس سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہ ہوتی۔ یہ بات اگر وہ خود لینا سے کہہ دیتا تو شاید اسے زیادہ حوصلہ نہ ہوتا مبین اسوں میں وقت ہوا جب اس نے میٹری کی پارٹی میں دوسرے لوگوں سے یہ بات کہی۔ لینا جانتی تھی کہ وہ بھوت بول رہا ہے اور اس نے فیصلہ اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ جواز تلاش کیا ہے۔

کچھ اسی طرح کا معاملہ بارہویں نمبر کے ہوائے فریڈ راجر کا تھا۔ جبک کے برعکس اس کا صرف ایک ہی راز تھا اور اسی لیے لینا کو اس کی فائل دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ اسے یاد رکھ سکے۔ اس نے لینا سے یہ بات چھپائی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس ایک خانی کے علاوہ ان کا تعلق ٹھیک ٹھاک انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اور اس وقت وہ سوچا کرتی تھی کہ شاید راجر سے ملنے کے بعد اس کی تلاش ختم ہو جی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کام کی زیادتی کا بھانہ کر کے وہ ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر پاتا جس پر وہ تھا ہوجاتی۔ یہ عہد اس وقت کھلا جب راجر نے فون کر کے اسے مطلع کیا کہ وہ وعدے کے مطابق اس کے ساتھ ڈرنہیں کر سکے گا کیونکہ اسے ایک ضروری کام پر گیا ہے۔ لینا کو اپنی شام خانے ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ یوریت دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلی اور بلا ارادہ ہی شاپنگ مال کی طرف چل دی۔

جہاں اس نے راجر کو اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ سچ بیان کر دیتا تو وہ کاؤنٹی ریکارڈ آفس کا چکر لگانے سے بچ جاتی۔ جہاں اس نے راجر کی شادی کا سرٹیفکیٹ تلاش کر لیا۔ اسی طرح رجسٹرار کے دفتر سے بھی تصدیق ہوئی کہ راجر جس مکان میں رہتا تھا، وہ راجر مینٹن اور مینٹن تھامس بیٹن کی مشترکہ ملکیت ہے۔

ماضی کے انہی تجربات کی روشنی میں اس نے فیصلہ کیا کہ گھر واپس جانے سے پہلے وہ ایک چکر ساتویں اسٹریٹ پر واقع پیپولگ کے دفتر کا بھی لگالے۔ ججری کا کہنا تھا کہ وہ اسی سوئٹ ویز مینٹن میں کام کرتا ہے۔ اس نے پارکنگ لاث میں اس وین کو تلاش کیا لیکن اس کی جگہ اسے ججری کی سفید سیڈن کھڑی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید وین مینٹن کی ہو پھر اسے خیال آیا کہ ٹون کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ دفتر میں ہے یا نہیں۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سڑک کے آخری کونے پر واقع شاپنگ مال میں گئی جہاں سے اس نے اپنے فون کے ذریعے اس کا نمبر ملایا۔ اس مبین کے ساتھ کہ وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

☆☆☆

لینا ججری سے سیز حیاں جو سچی ہوئی دوسری منزل پر اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچی جو اب کے درختوں سے گھری ایک پائن ٹری کے نیچے ایک دوڑی ہوئی فائل جاتے ہوئے ایک لمبے کے لیے اپنی باتوں میں نے کے پاس رکھی جس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس نے تعجبی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں لکھنے کی میز اور ایک فائل کیبنٹ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے یہ میز ٹونگ روم میں رکھی ہوئی تھی لیکن اکثر اس کے دوست کافی پینے یا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے ساتھ چلے آتے تو اسے یہ پریشانی لاحق ہوجاتی کہ کہیں وہ ان فائلوں کو نہ پڑھ لیں جس میں اس نے ان کے بارے میں تمام تفصیلات لکھ رکھی ہیں، ویسے تو وہ اپنی فائلوں کا تعلق نہیں کرتی تھی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ میز پر کوئی کاغذ رکھا رہ جائے جس پر کسی بارے کے میں کوئی خاص بات درج ہو جیسا کہ کبھی پہلے ہوائے فریڈ نمبر سولہ یعنی سام کی آمد کے موقع پر ہوا تھا۔

وہ دفتر کے بعد اس سے معذرت کر کے ہاتھ روم تک گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ سام اس کی میز کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ایک کاغذ پر یوٹائیڈ لائن کا فون نمبر درج کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگلے روز صبح فون

کر کے وہ تصدیق کرے گی کہ آیا وہ واقعی بڑنس ٹور پر میکسیکو جا رہا ہے۔ راجر والے تجربے کے بعد وہ کسی پرانتی آسانی سے بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی سام کا رہن سہن اسے کھلتا تھا۔ اس کی تنخواہ میں جڑا ڈالرز سالانہ تھی لیکن وہ تینٹی سوٹ پہنتا اور سچ دو رو جیسی مہنگی گاڑی اس کے استعمال میں تھی۔ وہ اس معمولی تنخواہ میں یہ سب کچھ افرور کر رہا تھا۔ کیا اس کا گزراہ ادھار پر تھا یا اس کا کوئی اور بھی ذریعہ آمدنی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بوائے فریڈ کوئی غیر قانونی کام کرے۔

سام میکسیکو ضرور گیا لیکن کبھی کے کام سے نہیں جیسا کہ اس نے لینا کو بتایا تھا بلکہ وہ منشیات کی تجارت کرتا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی اور سام کے ساتھ تعلق کے نتیجے میں وہ بھی صرف پولیس ہی نہیں بلکہ ایف بی آئی کی نظروں میں بھی مشرق قرار پائی۔ وہ خود ڈیلیوری سروس میں کام کرتی تھی اس لیے پولیس کو شبہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی... آؤ کاربن کتے سے جو منشیات لے جانے اور اس کی سپلائی کا کام کرتا ہو۔ وقتی طور پر تو وہ پولیس اور ایف بی آئی کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی سام اور اس کا مختصر تعلق بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

لینا نے میز کے اوپر لگے ہوئے کچھ میں سے ایک فائل نکال کر اس کی پہلی دو صفحات پر نظر ڈالی۔ جونیئر نمبر ستر کے الفاظ لکھ دیے۔ پھر اس نے رائٹنگ پیڈ سے ایک کاغذ پھاڑا اور اس پر وین سے متعلق وہ تمام تفصیلات لکھ دیں جو اس نے اپنی کار میں رکھے ہوئے پیڈ پر درج کی تھیں پھر اس نے ججری کے دفتر جانے اور وہاں پارکنگ لاث میں وین کے بجائے اس کی میڈن کار کی موجودگی کے بارے میں بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس نے ججری سے متعلق وہ چھوٹی مونی باتیں بھی لکھ دیں جو وہ اب تک نوٹ کر لی آئی تھیں لیکن وہ اتنی اہم نہیں کہ اس کی وجہ سے ججری کی فائل کھولی جائے۔ آخری کتہ جو اس نے تحریر کیا، وہ اس فون کال کے حوالے سے تھا جو اس نے دوپہر پونے تین بجے فون سے کی تھی اور اس کے جواب میں اسٹیبلشمنٹ نے کہا تھا۔ ”نہیں، ججری جیس جونیئر نام کا کوئی شخص یہاں کام نہیں کرتا۔“

لینا کو ججری سے ملنے ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس مختصر مدت کے دوران کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے۔ رات کو اسے ججری کے ساتھ ڈر کرنا تھا۔ ججری نے بتایا تھا کہ اسے دیر تک دفتر میں کام کرنا ہوگا۔ اس لیے

بہتر ہوگا کہ وہ کسی ریسٹوران میں بیٹیں۔ لیٹا نے آخری بار آئینہ دیکھ کر اپنے سر پر نظر ڈالی۔ سیاہ جیسٹ لباس میں وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی پھر وہ دل ہی دل میں ان سوالوں کو دہرانے لگی جو وہ ڈرنکر دوران اس سے کرنے والی تھی مثلاً یہ کہ ان دنوں اس کو سوئٹ ویزر منسوب ہے پر کام کر رہا ہے۔ اس کا جہاز کہاں کھڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسے ہی وہ ریسٹوران کی پارکنگ لاٹ میں پہنچی، اسے جیمز کی سیڈ ان نظر آگئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چیلے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے سیدھا یہاں چلا آیا ہے۔ لیٹا کو دیکھ کر وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا اور گرم جوش سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر خوش ہو رہی ہے؟“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

”اوہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہیں کم از کم اتنی فرصت تول گئی کہ میرے ساتھ ڈرنکر نے چلے آئے۔“ ایک لڑکی نے انہیں ان کی میز تک پہنچا دیا۔ لیٹا اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج کا دن کیسا گزرا؟“ ”ہمیشہ کی طرح مصروف، سرکھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی اور تم کیا کرتی رہیں؟“

”میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے..... ویسے تمہاری کمپنی کیسے آگیا کرتی ہے؟“ وہ خود کھانے کے انداز میں اسے کمپنی کی مصنوعات وہاں... کام کرنے والوں کی تعداد اور... ہارڈویئر کے بارے میں بتاتے لگا، ان میں سے کچھ نام اسے جانے پہچانے لگے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ ان کے بارے میں پہلے بھی ریڈیو پرسن چکی ہے۔ وہ اپنا وہم و گم غل کر کے آیا تھا اور لیٹا دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی معترف ہوئی۔ اس نے کپیولاگ کے بارے میں مزید کچھ سوالات کیے پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کتنی بار اپنے جہاز کے ذریعے سفر کرنا ہوتا ہے؟“

”ہفتے میں ایک یا دو بار۔ جب کام سے تھوڑی فرصت مل جائے۔ تمہارے لیے کیا منگو آؤں؟“ ”ابھی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”کیا ذاتی جہاز رکھنا مزید شوق نہیں؟“

”ہاں۔ اس کے اندھن، دیکھ بھال اور پارکنگ فیس پر ہی کافی خرچ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے لیے بچے ہوئے پارے اور چھین منگو آؤں۔“

لیٹا نے سنیو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے

کہ یہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں کی ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ چونکہ جہاز رکھنا کافی مہنگا ہے اسی لیے تمہیں دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔“

جیمز کی ہموں تن گئیں اور لیٹا کو یوں لگا شاید اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جیمز کی جہاز کی ملکیت اور دیر تک کام کرنے کے بارے میں جھوٹ بولی رہا ہے لیکن اس کا مقصد اس کی دل آزاری نہیں تھا۔ اس لیے بات بناتے ہوئے بولی۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ تم کبھی مجھے اپنے ساتھ فلائنگ پر لے چلو؟“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ یقیناً میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ کیا تم نے یہاں کی سائنس چلی کبھی کبھی؟“ ”ہاں اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارا جہاز کہاں کھڑا ہوا ہے؟“

”مقامی ایئر پورٹ پر، میرے لیے وہ جگہ مناسب ہے۔“ اس نے منہ بوند کیا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”اب تم مجھے اپنے دن کے بارے میں بتاؤ۔“

کوئی جواب دینے سے پہلے لیٹا نے بقیہ سوالات پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ آج کے لیے انتہائی کافی ہے۔ باقی کے تجربات اسے کبھی نہ کھانا پھانسی میں بھی مہر کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اس ماہر آثار قدیمہ کی طرح جو مسلسل کھدائی کرتا ہے اور زمین کی تہیں صاف کر کے ماضی کے نشانات تلاش کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ حال کی حقیقت جاننے کے لیے تحقیق کر رہی تھی۔ جب وہ کھانے کا آرڈر دے چکے تو وہ اسے اپنی دہر کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ کہاں کہاں گئی اور اس نے کیا چیزیں لوگوں کو پیش کیں، وہ بڑے شوق سے سن رہا تھا۔

جب سیر ایل نے کرایا تو وہ اداں کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ اس نے ان انگوٹوں سے جیمز کے چہرے کا جائزہ لیا اور فیصلہ کر لیا کہ کل اس کی چھٹی ہے۔ اس لیے وہ اس کا جہاز دیکھنے ضرور جائے گی۔

☆☆☆

رات کو سونے سے پہلے اس نے پڑھنے کے لیے ایک کتاب کھولی۔ وہ اکثر خاتون جاسوسوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی اور ان کتابوں سے اسے بعض اوقات بڑے اچھے آئیڈیاز مل جاتے تھے مثلاً روپ بدلنے کے لیے وگ کتنی کارآمد ثابت ہوتی ہے اور کس طرح سرکاری فائلوں

سے کسی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس نے جیمز کی کافی کی میز پر بھی اس طرح کے جاسوسی ناول دیکھے تھے۔ ممکن ہے کہ اسے بھی جاسوسی کا شوق ہو۔ ویسے وہ... مطالعے کا شوقین معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے وہ اسے لائبریری میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ جب اسے یہ پرانی بات یاد آئی تو اس نے بستر پر بڑی فائل اٹھائی اور اس میں اس ملاقات کی تفصیل تلاش کرنے لگی۔

جیمز سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ لائبریری میں میکیکو کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی تھی۔ وہ اس شہر کے بارے میں جاننے کے لیے.... یہ چین تھی جہاں سام پڑا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں نقشہ پر ان راستوں پر گردش کر رہی تھیں جن کا تذکرہ اخبارات میں سام کی گرفتاری کے بعد آیا تھا۔ اس نے وہ تمام تراشے کاٹ کر سام کی فائل میں لگا دیے تھے۔ جیمز اس وقت لائبریری کے اس حصے میں تھا جہاں جغرافیہ سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس سے کئی مرتبہ گزر چکا تھا بلکہ ایک مرتبہ تو ان دونوں کا ٹکراؤ بھی ہو گیا۔ جیمز نے بڑی شگفتگی سے اس سے معذرت کی اور بولا کہ کیا وہ میکیکو کے سفر کا ارادہ رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھنے لگے اور چند دنوں بعد وہ بے وقت کی ڈرائیونگ چاہتی تھی۔

لیٹا شروع شروع میں کافی محتاط تھی۔ اس نے جیمز کو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی تفصیل بتائی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ایسے مقامات کا انتخاب کرتی جو نسبتاً محفوظ ہوں اور جہاں سے کسی خطرے کی صورت میں نکلنا آسان ہو۔ جیمز کے معاملے میں اس کی خاص طور پر یہ کوشش تھی کہ وہ پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرے۔ اس کے بعد ہی اسے بیش قدی کا مونیٹور دے گی۔ جیمز جیسے لوگ بہت آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور وہ مطمئن کی کہ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

لیٹا نے بلیک ایوی ایشن کا بورڈ دیکھا اور اپنی گاڑی مقامی انٹرپورٹ کے توسیع حصے میں واقع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ اس نے اخبار میں فلائنگ کے تربیتی کورس کا اشتہار دیکھا تھا اور اگر کوئی اس سے یہاں آنے کی وجہ پوچھتا تو وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ بھی اس کورس میں شرکت کرنا چاہتی ہے۔ کار سے باہر آنے سے پہلے لیٹا نے اپنی وگ درست کی جس نے اس کے سنہری بالوں کو چھپا

لیا تھا۔ سینٹ سے بہتے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اسے چھوٹے جہاز کھڑے ہوئے نظر آئے۔ ستائے میں اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ عام طور پر اونچی ایڑی کے جوئے نہیں پہنتی تھی لیکن اس وقت اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قد میں مزید تین انچ کا اضافہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس روپ میں جیمز بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

رن دے بالکل خالی تھا اور چند اوجھڑے کے افراد ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ وہ ان کھڑکیوں کی جانب بڑھی جہاں سے جہازوں کا نظارہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا۔ اس نے انہیں قطار در قطار دیکھنا شروع کیا۔ پہلے وہ ان جہازوں کو تلاش کرنے لگی جو سفید رنگ کے تھے اور ان پر نیلے رنگ کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں پھر اس نے ان جہازوں پر گئے نمبر پڑھنا شروع کیے۔ اسے جس نمبر کے جہاز کی تلاش تھی، وہ تیسری قطار میں نظر آ گیا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک اڈیو میٹر شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی جیکٹ پر لگے ہوئے پچ رنگھا ہوا تھا۔ ”بلیک فلائنگ سروس۔ ٹیڈ۔“

”اوہ ہاں۔“ وہ تھوڑا سا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں انگریزی کورس میں حصہ لیتا چاہتی ہوں۔ اس مسئلے میں جاننا چاہتی ہوں۔“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں تمہیں معلوماتی کتابچے دیتا ہوں۔ اس میں تمہیں ساری تفصیل مل جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ، اس نے اپنے چھوٹے سے کمین کی جانب اشارہ کیا۔

”ایک اور سوال؟“

”ہاں۔ ہاں۔ پوچھو۔“

”کیا یہ سب جہاز تربیتی مقاصد کے لیے ہیں یا ان میں کوئی ذاتی طیارہ بھی ہے؟“ اس نے رن دے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس میں دونوں طرح کے طیارے ہیں، زیادہ تر جہاز لوگوں کے ذاتی استعمال میں ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک تربیتی مقاصد کے لیے کرائے پر بھی دے دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی دیکھ بھال کے اخراجات پورے ہو سکیں۔“ ”اس جہاز کے بارے میں کیا کہو گے جس پر سفید اور نیلی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ میں یہ اس.... لیے پوچھ رہی ہوں کہ میرے ڈیڑی بھی اسی طرح کے جہاز میں مجھے

فلاننگ کے لیے لے جاتے تھے۔“

”یہ شیرون تھارن کا ذاتی جہاز ہے جسے وہ خود ہی استعمال کرتی ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ اس جہاز کو کرائے پر نہیں دے گی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ایک کھیتی کی مالک ہے لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کئی ایسے جہاز ہیں جو کرائے پر مل سکتے ہیں۔“

”کیا وہ کسی دوسرے شخص کو بھی اپنا جہاز اڑانے کی اجازت نہیں دیتی؟“ لینا نے پوچھا۔

”کبھی کبھار خاندان کے لوگوں کو یہ موقع مل جاتا ہے۔“ لینا کو یقین تھا کہ اس کے پاس جہاز کا جو نمبر ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ نمبر جیمری کے کمرے میں آویزاں تصویر پر سے ذہن نشین کیا تھا۔

جب لینا کین سے باہر آئی تو اس نے ایک عورت کو اس جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لیے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا بند گلے کا سوٹر، خاکی پتلون اور کینوز شوہ پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر لینا کو جیمری کی یاد آگئی۔ لینا نے اپنے حواس پر قابو پایا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے پرس میں جاپاں تلاش کر رہی ہو۔ جب وہ عورت اس کے قریب سے گزری تو اس کے کانوں پر آواز آئی۔

”گڈ مارننگ، ٹیڈ!“

”تم کسی ہوس تھارن؟“ ٹیڈ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر لینا نے وگ اتاری اور اپنے بال سنوارنے لگی پھر اس نے فریج سے کوڈڈ رٹنگ نکالی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ تازہ دم ہونے کے بعد وہ اپنی میز پر گئی تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا، اس کا اندراج کر سکے۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، وہ اپنی فائلوں کو ترتیب سے رکھنے کی عادی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میز کی دراز کو ایک ایچ کھلا چھوڑ دیتی تھی تاکہ اگر کسی نے اسے چھیڑا ہو تو یہاں چل جائے۔ اس نے جلدی سے فائل کی سینٹ کھولا تاکہ دیکھ سکے کہ نمبر سترہ کی فائل اکی جگہ پر ہے جہاں وہ رکھ کر گئی تھی۔

فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے اسے ایک معمولی سی شکن نظر آئی۔ وہ ایک نئی فائل تھی اور اس پر ایسے کی نشان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گزشتہ شب اس نے یہ فائل اپنے بستر پر رکھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس

کی لمبی کا پتھر اس پر پڑ گیا ہو۔ لمبی کا خیال آتی ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں چلی گئی۔ ورنہ نہ تو اسے دیکھنے ہی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ جاتی۔ اس نے فائل کو ہٹا کر بستر کے نیچے سے اس کے کھٹکے کی آواز آئی۔

لینا نے اسے پچکارا تو اس نے بستر کے نیچے سے جھانکنا شروع کیا پھر آہستہ آہستہ اس کا دھڑا ہوا آنے لگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ نے کبھی اس طرح کبھی جھپٹی تھی جب تک وہ خوفزدہ نہ ہو۔ یوں کہ یہاں نہ آیا ہو لیکن ایسا کون ہے جو ان فائلوں تک پہنچنا چاہے گا کہ کوئی بھی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔

”یہ انتہائی نامعقول حرکت ہے۔“ وہ اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولی پھر کچن میں آکر اسے رات کی بیگنی ہوئی مچھلی کھائی اور سوچنے لگی کہ ابھی اسے مزید جاہلوں کی باتیں پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ آئندہ بھی فائل کی سینٹ کو تالا لگا نہیں بھولے گی۔

اپنی میز پر وہ اپنی آکر وہ ایک بار پھر جیمری کی فائل دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیمری نے اس سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ظاہر اس کی ملکیت نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے جہاز کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ اس نے اس نمبر کو دوبارہ چیک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کیسے وہ اس کا نمبر کرنے والی بات اسے کھل کر ہی بتا سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے کام کرتا ہو اور اپنی وین کے ذریعے ان کا سامان لے جاتا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مقام پر کام کرتا ہو اور اشتباہی طور پر اسے نہ جانتی ہو یہ بات وہ آسانی سے یا

استقبالی طور پر کوڈ بارہ ون کے معلوم کر سکتی تھی۔ فائل بند کر کے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے روز جیمری کا تعاقب کرے گی۔ آکر وہ اپنے ٹرک میں گئی تو پہچان لی جائے گی۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی مفید رنگ کی چھوٹی کار استعمال کر سکتی تھی جس پر کوئی بھی توجہ نہ دیتا۔ وہ اس کار میں بیٹھ کر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر بھی انتظار کر سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہاں سے کھٹک بھی کھتی تھی۔ بہر حال اسے اگلے روز کچھ سوالات کے جوابات درکار تھے۔

☆☆☆

وہ ہیشاڑ اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے جیمری کو اپنے اپارٹمنٹ کے پارکنگ لائٹ میں اسی وین کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اسی لیے وقت سے پہلے آگئی تھی تاکہ اس کے ٹکٹے سے

پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اب اگر وہ اپنے منصوبے کے مطابق ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑی تو اسے جیمری کے سامنے سے گزرتا پڑتا اور اگر وہ اپنی وین پارکنگ لائٹ سے نکال رہا ہو تو اس سے ٹکے کا بھی امکان تھا۔

اس نے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور انتظار میں رہی کہ دائیں جانب کا ٹریفک گزر جائے تو وہ ہیشاڑ اسٹریٹ پر سیدھی چلی رہے گی۔ جیسے ہی آخری کار گزری، اس نے اپنا اسٹیمپنگ دائیں جانب کاٹا۔ عین اسی وقت ایک کار اس کے عقب میں آگئی اور اس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجانے لگا وہ بہت جلدی میں تھا اور اس سے ایک سیکنڈ بھی انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اپنی گاڑی آخری کار کے پیچھے لگائی۔ جب وہ چوراہا پار کر رہی تھی تو اس نے اسی گاڑی کے ہارن کی آواز دوبارہ سنی۔ اب وہ بے صبراً ڈرائیور اس کے بائیں ہاتھ سے گزر رہا تھا۔ عین اسی وقت لینا کی نظر جیمری پر پڑی جہاں جانب دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے پوٹن لیا اور آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئی ہیشاڑ اسٹریٹ پر آگئی۔ اسے سڑک کے کنارے کچھ جھاڑیاں نظر آئیں۔ جہاں وہ آسانی اپنی کار کھینچ کر رکھتی تھی۔ وہاں اس کے کچھ بے جانے کار مکان بہت کم تھا۔ وہ عین سے ٹکے کہہ گئی کہ جیمری نے اسے دیکھ لیا ہوگا، اس نے اپنے آپ کو فائل کرنے کی کوشش کی کہ جیمری اس وقت اس کی آمد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، لہذا اس نے اسے نہیں دیکھا ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر جیمری کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وین کی اگلی نشست پر ایک لیپ ٹاپ اور ایک سوٹ کیس رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے جینز، ہنٹ اور ٹینس شوہ پہن رکھے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کام پر نہیں بلکہ کہیں اور جا رہا ہے۔ وہ اپنے گروڈپش سے خاصا تھکا نظر آ رہا تھا اور وین کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ پارکنگ لائٹ کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے لینا کو شک گزرا کہ شاید وہ دیکھ لی گئی ہے۔

جیمری نے وین اسٹارٹ کی اور پارکنگ لائٹ سے باہر آگیا۔ لینا نے بھی اپنی کار دائیں جانب موڑی اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ جیمری کی وین اور اس کی گاڑی کے درمیان دو کاریں تھیں جو آگے چل کر دائیں جانب مڑ گئیں اور جب وہ ایک سٹریٹ پر گزری تو لینا کی کار جیمری کی وین کے بالکل پیچھے تھی۔ وہ تھوڑا سا پیچھے رہی

کھجور

☆ جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔

☆ توانائی فوری طور پر بحال کرتی ہے۔

☆ کمزوری دور کرتی ہے۔

☆ رنگ نکھارتی ہے۔

☆ خون پیدا کرتی ہے۔ دانتوں اور مٹھروں کو

مضبوط کرتی ہے۔

☆ سردی کے لیے مفید ہے۔

☆ زخموں کے لیے مفید ہے۔

☆ بطن کو خراب کرتی ہے۔

☆ دل کے امراض کو روکتی ہے۔

☆ معدے کے زخموں کے لیے مفید ہے۔

☆ قبض کا بہترین علاج ہے۔

☆ ہیٹ کے کیڑے مارتی ہے۔

☆ کھجور کھانے والے کی نظر کمزور نہیں ہوتی اور

سب سے بڑھ کر کھجور کھانا سنت رسول مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم ہے۔

☆ مریضہ رانا شاہد، سید اشرف (پجالیہ)

جانب جھک گئی اور سر پر رکھی ٹوپی آگے کر لی۔ اسے امید تھی کہ اگر جیمری نے اپنی وین میں لگے بائیں جانب کے شیشے میں دیکھا بھی وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔

وہ جیمری کی وین کا پیچھا کرتے ہوئے ساتویں اسٹریٹ پر واقع کیسولگ کے دفتر تک جا پہنچی۔ جیمری نے اپنی وین پارکنگ لائٹ میں کھڑی کی اور بھی لینا کی نظر وین کی دائیں جانب لکھی ہوئی عبارت پر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بھی میڈ ولارک نرسری کے الفاظ تحریر ہوں گے لیکن وہاں عبارت مختلف تھی۔ اوپر چلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ جیمری جس تھارن سینٹر اور اس کے نیچے چھوٹے حروف میں میڈ ولارک نرسری کے الفاظ درج تھے۔

اسے یاد آیا کہ ٹیڈ نے جہاز کی مالکن کا نام شیرون تھارن بتایا تھا۔ وین پر جیمری جس تھارن سینٹر کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ جس شخص سے ملاقات کر رہی تھی اس کا نام جیمری جس جو تیر تھا۔ اگر اس کے نام میں تھارن کا اضافہ کر دیا جائے تو ان تینوں کے بیچ ایک تعلق جتنا نظر آتا ہے۔ یہ ایک پرانی وین کی جو یقیناً ان کے باپ کی ملکیت رہی

ہوگی۔ شیرون اس کی بہن ہوگی۔ فیڈ نے بتایا تھا کہ اس کی اپنی ایک بھتیجی بھی ہے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اسے اپنے کام پر پہنچنا تھا۔ وہ گھر واپس آئی تو اسے یاد آیا کہ اب جبری سے اس کی ملاقات اگلے روز رات سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے پہلے سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یونیفارم تبدیل کرنے کے دوران اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ شام کو گھر واپس آنے کے بعد جبری کے لیے چاکلیٹ کی ایک تیار کرے گی اور اس کی بہانے آج رات ہی اس سے ملنے چلی جائے گی اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیلی فون کر کے اسے بتا دے کہ شام کو اس کے لیے چاکلیٹ لیک لے کر آئے گی۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری جانب سے ایک کسمی پنی آواز سنائی دی۔ ”یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے براہ کرم صحیح نمبر ملائیں۔“ لیٹا نے دو تین بار وہ نمبر ڈائل کیا لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا۔ یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو اس نے جبری کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت لیٹا کو کام پر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے جبری سے کہا کہ وہ اپنا نمبر بتا دے تاکہ وہ اس سے مل سکے۔ سوچا کہ وہ بج کے وقت میں اسے چیک کرے گی۔

☆☆☆

اس نے اپنا ٹرک پارکنگ لاث میں کھڑا کیا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر واقع جبری کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جس کا پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا اور وہاں کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا، پھر اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

”میں اس عمارت کا منیجر ہوں۔“ وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میں جبری جیسے سے ملنے آئی تھی۔“ وہ آج تک یہاں سے چلے گئے، انہیں اپنی ہی ملازمت پر پہنچنے کی جلدی تھی، کیا تم یہ اپارٹمنٹ لینا چاہ رہی ہو؟“

”نہیں، کیا مجھے اس کا نیا پتا معلوم ہو سکتا ہے؟“ ”نہیں۔ انہوں نے چھ ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے نیا پتا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”اوہ۔ میں سمجھ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نیچے آ گئی۔

لیٹا اپنے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں صبح کے وقت جبری کی دین گھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چھ گھنٹے پہلے جبری کو دیکھا تھا لیکن اب وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں لے گا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے ایک گھنٹہ کی سانس لی اور اپنے کام پر روانہ ہو گئی۔

جب اس نے گزشتہ چند روز میں رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید پہلی بار ایسا ہو گا جب تعلق ختم ہو جانے کے باوجود بھی اس کی چھان بین جاری رہے گی۔ اگر واقعی وہ تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھا یا کہ یہ حقیقتات جاری رہتی چاہئیں۔ وہ ایک بار پھر انٹرپورٹ جانے کی اور اس وقت تک وہاں انتظار کرے گی جب تک شیرون نہ آجائے۔ وہ اس سے اس کے جہاز اور جبری کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ یہ وہ سب کچھ تھا جس پر اس نے اپنی زندگی گزار کر تے ہوئے ہوا اور بلند بلند۔ ”میں کسی مذکی طرح مسٹر جبری جیسے جو تیزی حقیقت معلوم کر کے ہی رہوں گی۔“

پارکنگ لاث سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا جہاں جبری رہا کرتا تھا۔ اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔ جیسے کسی کی اصلیت جاننے کی خواہش اس کے دل میں جوش مار رہی ہو۔

☆☆☆

اس کی اٹارن کے جیو 747 میں دوسری قطار والی نشست پر بیٹھا جبری جیسمن تھا جن جو تیز اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لیٹا ڈون ووڈ۔۔۔ کو سام کے منشیات کے کاروبار کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ لہذا کیس نمبر 248 سرکاری طور پر بند کیا جاتا ہے۔“

جبری نے فائل کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ لیٹا کسی جرم میں شریک ہو سکتی ہے۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ

چاہتے تھا لیکن سام اور میکسیکو حکومت کے افسران کے درمیان رابطوں کا پتا چلانا بھی ضروری تھا۔ ایف بی آئی والے اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ سام اس چین کی آخری کڑی تھا۔ آج شام لیٹا کو سرکاری طور پر خط مل جائے گا جس میں اسے سرکاری طور پر اطلاع دی جائے گی کہ سام کے ساتھ اس کا کاروبار کی تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی ایک خط کے ذریعے اسے مطلع کر دے گا کہ اسے دوسرے شہر میں نئی ملازمت مل گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح لیٹا مطمئن ہو جائے گی۔

اس کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا ہو گا۔ لیٹا اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی۔ جس طرح وہ انٹرپورٹ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ اپنے کام میں بے حد مشاق ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کے گزشتہ تجربات ہوں۔ جبری گزشتہ دو برس سے ایف بی آئی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اور جب اس کے پاس لیٹا کی فائل آئی تو اس نے یہی مناسب چاہا کہ لیٹا کی حقیقت جاننے اور سام سے اس کا کاروباری تعلق معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ خود سام کی جگہ لے لے اور لیٹا کا ہواے فریڈنٹین کر دے۔ وہ اس کے بارے میں چھان بین کرے۔ اس بہانے اسے لیٹا کے ساتھ سام کے ساتھ منشیات کے کاروبار میں شامل بھی پھر اس نے ایک دن لیٹا کی غیر موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی اور وہ تمام فائیں دیکھ ڈالیں جو لیٹا نے اپنے سابق ہواے فریڈنٹین کے بارے میں بنا رکھی تھیں، سام کی فائل میں اس کی عادات والواری کے بارے میں تفصیلات، کچھ ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کے نمبر اور اس کی گرفتاری کے بعد شائع ہونے والے مضامین کے تراشوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ ملی۔ وہیں ایک فائل اس کے بارے میں بھی تھی جس سے وہ جان گیا کہ لیٹا اس کے بارے میں بھی چھان بین کر رہی ہے۔ واقعی وہ ہم جو فطرت رکھتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھا کہ اس کی کوشش کی کہ لیٹا اس کی گرل فرینڈ نہیں بلکہ ایک مشترک لڑکی تھی جس کے بارے میں چھان بین کرنے کے لیے اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ تحقیقات مکمل ہو چکی تھیں اور اب وہ اپنے میڈیکل ریکارڈ واپس جا رہا تھا۔ البتہ صبح روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی بہن کے دفتر ضرور گیا تھا تاکہ بتا سکے کہ یہاں اس کا کام ختم ہو چکا

ہے اور وہ اپنی دوسری ذمہ داری سنبھالنے والیں جا رہا ہے۔ اس نے اپنی بہن کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے اپنا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس کے کام کی نوعیت اس کی بھی کہ وہ شیرون کو بھی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ لہذا اس نے اسے ایک من محض کہانی بنا کر مطمئن کر دیا۔ اس میں ایک قاتل کے بارے میں بھی کچھ جاننے کے بعد شیرون کے دل میں لیٹا کے خلاف برائی بیجھ جاتی اور وہ اس بات پر ناراض ہو سکتی تھی کہ لیٹا اس کی فوہ لینے کے لیے انٹرپورٹ کیوں گئی جبکہ لیٹا نے پس پردہ رہ کر تمام چھان بین کی تھی۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اسے ہچکچاتا ہوا ہونے لگا۔ وہ بھی پس پردہ رہ کر لیٹا کے بارے میں چھان بین کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کر کے معلوم کر سکتا تھا کہ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے اور اس کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں گھر کی تلاشی لے کر سام اور اس کے روابط کے بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔ اس کے ہواے فریڈنٹین کا ڈیوٹنگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس طرح غائب ہو جانے پر وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی، یقیناً وہ اسے بھی دھوکے باز اور فریبی ہی سمجھے گی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے لیٹا سے مل لیتا اور اسے کوئی بھی کہانی بنا کر ذوقی طور پر مطمئن کر لیتا۔ اس طرح کہ اس کے آئندہ ملنے کی گنجائش تو باقی رہتی لیکن اس کے دل میں اس کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے واقعی وہ اس کے دل میں جگہ بنا چکی ہے لیکن تیرکان سے نکل چکا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ واپس جا کر لیٹا کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دے کیونکہ وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ لیٹا سب کچھ جاننے کے بعد اس سے نفرت کرنے لگے اور وہ بھی یہ گوارا نہ کرے کہ لیٹا جیسی خوب صورت لڑکی اس سے نفرت کرے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ اس طارے قلعے کو ایک خوب صورت خواب سمجھ کر بھلا دے۔ اس نے کئی سے سرٹکا کر آنکھیں موندیں اور اپنے سننے کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کا کام ہی نہیں بلکہ محبوب مشغلہ بھی تھا۔ وہ ہر حقیقتات کو ایک چلتی سمجھ کر قبول کرتا اور اسے عمل کے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ اب وہ لیٹا کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ چند روز بعد لیٹا کی میز پر ایک نئی فائل کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ اپنے انٹھارویں ہواے فریڈنٹین کے بارے میں چھان بین کر رہی ہوگی۔

بے ثمر مسافت

سلیم فاروقی

کہتے ہیں کہ صحبتوں سے شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن... جب شخصیت ہی بیاز کے چھلکوں کے مانند پرت پرت ڈھکی ہو تو کیسے کوئی تہ میں چھپی اصلیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ بھی اندر سے اتنا ہی گہرا تھا جیسے سمندر... اس کے احساسات میں جتنے مدوجذں جذبات میں تلاطم اور خیالات میں بہتور تھے اتنا ہی وہ سمندر کی سطح کے مانند پرسکون نظر آتا تھا... برسات کی فودوں کی طرح کسی کی خاموش چاہت میں بھیگا ہوا کچی مٹی کے گھر میں رہ کر خوابوں کا تاج محل بنانے والا جب سمت بدل کر چلا تو قدموں کی لڑش میں منزل کے گم ہو جانے کا خدشہ نمایاں تھا۔ شومنی قسمت کہ ان بدلتی رتوں میں بہکی صحبتوں نے اپنا رنگ جمایا اور اسے کسی اور ہی منزل کا راہی بنا دیا۔ پھر تو شعور کی دنیا میں جو ناممکن تھا وہ سب کچھ بہ آسانی لا شعوری طور پر رقم ہوتا چلا گیا۔ اگر اس پر ماس کی دعا کا انچل سنا یا نہ کرتا تو زمانے کی تہنی دھوپ اسے چلا کر خاک کر ڈالتی۔

جی چاہوں، ادھوری راتوں اور مل راتوں کی بولی بولان

آہستہ آہستہ میری وحشت ختم ہو گئی اور میں ٹرین میں سفر کرنے لگا۔

میں انجینئر تھا اور امریکا کی ایک معروف انڈسٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ بی ای کی ڈگری ہونے کے باوجود مجھے یہاں سے سرے سے انجینئر تک کرنا پڑی تھی، کیونکہ ہمارے ملک کی پیچلرز ڈگری وہاں کے بیشتر اداروں میں قابل قبول نہیں تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو میں اس صورت حال سے گھبرا کر وہاں سے لوٹ آتا یا پھر ان کے معیار کے مطابق وہاں کی کسی یونیورسٹی میں بی ای کرتا۔ واپس آنے کا تو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے پاؤں پیلے کے بعد تو مجھے امریکا آنے کا موقع ملا تھا۔

ایاجی نے چلتے وقت اچھی خاصی رقم میرے حوالے کر دی تھی۔ وہ پاکستان ریویوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ رقم کہاں سے قرض لی تھی۔

ریل کے پھیوں کی گز گز اہٹ سے مجھے عجیب سی وحشت، بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے اور میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا ہوں۔ مجھے یہ آواز بہت دور، ماضی کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنی اس ذہنی کمزوری پر قابو پایا۔ بے چینی اور اضطراب کا احساس اب بھی ہوتا ہے لیکن صورت حال اتنی ہولناک نہیں ہوتی۔

میں گزشتہ سات برس سے امریکا میں تھا۔ وہاں تو ٹرین میں سفر کرنا ہر شخص کی مجبوری ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا تھا لیکن ٹرین کا سفر میرے لیے خوش گوار نہیں ہوتا تھا۔ سفر کے دوران خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے پہلے اخبار اور رسائل کا سہارا لیا پھر میں نے اپنے سیل فون میں ویڈیو فری لکھا اور خاصی تیز آواز میں گانے سننے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ

”ابجی ملک ہے، ابجی جگہ ہے۔“ اباجی نے کہا۔
 ”اے میں خدا خواست نہیں کوئی ضرورت پیش آئی تو کس سے مانگو گے؟“
 ”لیکن اباجی، یہ رقم تو نورین کے لیے تھی۔ وہ.....“
 ”اللہ مالک ہے بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔ ”پھر جب تک نورین کی شادی ہوگی تم بھی انشاء اللہ وہاں سیٹ ہو چکے ہو گے۔ کیا تم اپنی بہن کی شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے؟“
 ”میں اسی لیے تو ساست سمندر پار جا رہا ہوں اباجی۔“
 میں نے کہا۔ ”تاکہ آپ لوگوں کی خدمت کر سکوں۔“ اپنی شادی کے ذکر پر نورین شرمائی گئی۔ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ عمر میں پورے دس سال چھوٹی تھی۔
 اس دن میں دفتر سے واپس آ رہا تھا اور بیٹھ فون حسب معمول میرے کانوں میں ٹھسا ہوا تھا کہ اچانک سیل فون کی تیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں اباجی کا نام تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔
 ”السلام علیکم اباجی!“ میں نے بیٹھ فون کا بٹن آف کرنے کے بعد کہا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“
 ”علیکم السلام بیٹا۔“ اباجی نے کہا لیکن ان کی آواز میں وہ اہلانتہ پن نہیں تھا جو میں سننے کا عادی تھا۔ میرا دل بھی اچانک اس سے پریشان ہو گیا۔
 ”بہر حال آیا۔“
 ”سب خیریت تو ہے اباجی؟“
 ”ہاں خیریت ہی ہے۔“ اباجی کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
 ”بس تمہاری ماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔“
 ”کیا ہوا ہے اماں کو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔
 ”بیٹا اسے بہت تھیر بخار ہو گیا تھا۔ وہ بخاری حالت میں بار بار ہمارا نام لے رہی تھی کہ صفدر کو بلاؤ۔“ میں.....
 بے چین ہو گیا۔ میرا دل ان جانے دوسو سے دھڑکنے لگا۔
 اباجی جیسے کچھ دار آدمی سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محض اماں کے بخار کی وجہ سے مجھے ٹیلی فون کر دیں گے۔ اماں جی تو اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بہت بیمار ہوئی تھیں لیکن مجھے اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب وہ صحت یاب ہو جاتی تھیں۔
 ”اباجی!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
 ”آپ مجھ سے کچھ چھپائے مت، مجھے بتائیے کہ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری بات کرائیے ان سے۔“ میں

نے کہا۔
 ”بیٹا، وہ اس وقت تو راجا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے، ابھی آئے گی تو بات بھی کرادوں گا۔“
 ”اباجی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے اباجی کا نمبر کی مرتبہ ملا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ٹیٹ ورک کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ چھوٹے سے دو کمروں کا وہ پارٹمنٹ میں نے اپنے ایک پاکستانی دوست لطیف کے ساتھ مل کر لیا تھا۔ لطیف وہاں کی ایک آئل کمپنی میں سپردا ز تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔
 ”کیا بات ہے صفدر؟“ اس نے پوچھا۔ ”تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“
 ”یار، ابجی کچھ دیر پہلے اباجی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے مزید تفصیل پوچھنا چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ اب ٹیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے۔“
 ”پریشان مت ہو یار۔“ لطیف نے کہا۔ ”ماں جی انشاء اللہ خیریت سے ہوں گی۔“ پھر وہ کمر کر بولا۔
 ”ٹیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے تو کیا ہوا۔“ ٹولینڈ لائن سے ٹیلی فون کر لے۔
 ”ہاں! پریشانی میں مجھے اس وقت پریشان جانے لگا۔“ میں نے کہا۔
 ”آیا۔“ میں نے کہا۔
 ”تو فکر مت کر۔“ میں پرسوں پاکستان جا رہا ہوں، تیرے گھر جا کر سب کی خبریت معلوم کرلوں گا۔“
 میں تو گو یا اس کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے بریف کیس صوفے پر اچھالا اور ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھدکالیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اباجی کے سیل فون پر کال کروں پھر مجھے نورین کا خیال آیا۔ نورین مجھے صحیح صورت حال بتا سکتی تھی۔
 میں نے نورین کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ٹھنکی بجنے کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب میری نورین سے بات ہو سکتی تھی۔ تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد نورین نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“
 ”ریٹو! میں صفدر بول رہا ہوں۔“
 ”السلام علیکم بھیا۔“ اس نے کہا۔ ”بڑی عمر ہے آپ کی۔ میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔“
 ”ریٹو! اماں کی طبیعت کیسی ہے؟ ذرا ان سے بات کرادو۔“ میں نے کہا۔

”بھیا! وہ اماں کی طبیعت..... ٹھیک ہے۔ وہ.....“
 ”مجھے سے جھوٹ مت پوچھو ریٹو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اماں کی طبیعت کیسی ہے؟“
 نورین اچانک روئے لگی اور بولی۔ ”بھیا..... اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں لیکن ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
 ”اماں اسپتال میں ہیں؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔
 ”ان کے ساتھ کون ہے؟“
 ”میں، اباجی اور راجا بھائی ہیں۔“ اس نے بتایا۔
 راجا ہمارا پڑوسی تھا اور وہ ہمارے گھر کا بہت خیال رکھتا تھا۔
 ”بھیا..... اباجی کو مت بتائیے گا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ وہ آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن اماں بار بار آپ کا نام لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اپنے بچے کو فوراً یہاں بلا لیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امریکا میں ہیں تو اس نے کہا کہ ٹیلی فون پر بیٹے سے ان کی بات کرادیں۔ اباجی نے آپ کا نمبر ملا یا اور آپ سے بات کر رہی رہے تھے کہ اماں جی بے ہوش ہو گئیں۔“
 ”اماں اتنی بیمار ہیں اور اباجی اسے معمولی بخار کہہ کر مجھے بھلا رہے تھے؟ میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ ٹیلی فون کرنا اور اباجی سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنا سامان پیک کر دیا تھا۔ وہ بہت فور سے میری باتیں بھی سن رہا تھا۔
 ”کیا ہوا صفدر؟“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“
 ”اماں کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”اللہ رحم کرے گا۔“ لطیف نے کہا۔ ”لیکن تو دل چھوڑ مت کر۔ تو نے تو عورتوں کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیے۔“
 اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”لطیف! میں بھی تیرے ساتھ ہی پاکستان چلوں گا۔“
 ”تو پہلے چھٹی تو لے لے۔“
 ”میں چھٹی لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس فلائٹ میں ایک سیٹ مزید پیک کروالے جس سے تو جا رہا ہے۔“
 ”یار! میں کوشش کرتا ہوں۔“ لطیف نے کہا۔ ”اس فلائٹ میں اب شاید ہی سیٹ لے۔ میں نے تو ایک بیٹے

پہلے سے سیٹ کنفرم کروائی تھی۔“
 ”تو بات تو کر۔ اس فضائی کمپنی میں تیرا کوئی دوست بھی تو ہے۔ ورنہ میں کسی دوسری فلائٹ سے جاؤں گا۔“
 لطیف نے اسی وقت اپنے دوست سے بات کی اور ٹھوڑی بحث کے بعد بالآخر وہ سیٹ کنفرم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔
 ”یار! تو پہلے چھٹی تو لے لیتا۔“ لطیف نے کہا۔ ”اگر تجھے چھٹی نہ ملے تو؟“
 ”تو پھر میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔ ملازمت تو مجھے دوسری بھی مل جائے گی لیکن ماں نہیں ملے گی۔“ میرے سیل فون کی ٹھنکی بجی تو میں چونک اٹھا۔ وہ نورین کا فون تھا۔
 ”ہاں نورین!“ میں نے کہا۔ ”کیسی ہیں اماں؟“
 ”اماں کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
 ”اماں جی سے بات کراد میری۔“ میں نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اباجی کی آواز آئی۔
 ”ہاں صفدر بیٹا! اب تمہاری ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔ یہ ریٹو تو ایسے ہی بھرا جاتی ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔“
 ”اباجی! اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے اور آپ مجھ سے پھر بے خبر رہے۔“ میں نے کہا۔
 ”دل کا دورہ کہاں، انجانا کا معمولی سا ٹھیک تھا بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔
 ”میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”تم پاکستان ضرور آؤ۔“ اباجی نے کہا۔ ”تمہیں دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ماں اب بالکل ٹھیک ہے۔“ پھر وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ میری جانب کے بارے میں بات کرتے رہے۔
 میری وہ رات بہت بے چینی اور اضطراب میں گزری۔ صبح آفس پہنچنے ہی میں نے دوامہ کی چھٹی کے لیے درخواست دے دی۔ کمپنی کا بی ایم خاصا معقول آدمی تھا۔ وہ میرے کام سے خوش بھی تھا پھر میں نے گزشتہ پانچ برس میں کوئی چھٹی بھی نہیں لی تھی۔ اس نے میری چھٹی منظور کر لی۔ اماں کی حالت بہتر ہونے کی خبر سن کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک دن تھا۔ میں نے اباجی، اماں اور ریٹو کے لیے بہت سارے تحفے خریدے۔ راجا اور اس کے گھروالوں کے لیے بھی اور خالہ، شرہ، اس

وہ ہمیشہ مجھ سے انگلیں میں بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم دوسروں سے بھی انگریزی میں بات کیا کرو۔ یہ مت سوچو کہ تم غلط بول رہے ہو یا سچ، بس بولتے رہو۔ تمہاری انگریزی رواں ہوگی تو سچ انگریزی بھی بولنے لگو گے۔

میں کان میں اپنے دوستوں سے بھی انگلیں میں بات کرتا تھا۔ وہ لوگ پہلے تو میرا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ بھی انگریزی میں بات کرنے لگے۔

فوج میں نہ جانے کا بھی اتنا صدمہ ہوا کہ میرا دل ہر کام سے اجاگت ہو گیا۔ میں سارا سارا دن آوارہ گھومتا رہتا۔ لاہور کا اسٹیشن کافی بڑا ہے۔ میں اسٹیشن پر چلا جاتا اور مختلف پلیٹ فارمز پر گھومتا رہتا۔ وہاں بیٹھے اسٹیشن والے تھے بھی مجھے پہچانتے تھے۔ میں رات گئے گھر میں داخل ہوتا اور دیر تک فلی میگزین پڑھتا رہتا یا پھر ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا اور چار چار بجے تک ٹی وی دیکھتا رہتا پھر میں دوسرے دن بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ اٹھنے کے بعد میرا پھر وہی معمول ہوتا۔ میں منہ دھو کر ناشا کرتا، بہترین کپڑے پہنتا اور آوارہ گردی کے لیے نکل جاتا۔ کبھی مال روڈ بھی اتار لیتی اور کبھی یوں ہی کسی پارک میں جا بیٹھتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ پارک میں بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے۔ میرے لیے سب سے دلچسپ وہ مالٹھے تھے جو ایک اسٹینڈ پر مختلف تیلوں کا بیج لٹائے جاتے تھے۔ ان بیجوں پر چمکے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے مالش بھی کرواتے تھے۔ پھر وہ کن میبلے تھے جو سر پر کپڑے اس انداز میں باندھتے تھے کہ ٹوٹی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے پاس سیلا سا ایک تھیلہ بھی ہوتا تھا جس میں روٹی، تیل اور چھوٹی موٹی شیشیوں میں خود ساختہ دوا بھی ہوتی تھیں وہ نہ صرف کانوں سے میل نکالتے تھے بلکہ اس شخص کو میل کی چھوٹی سی گولی دکھا کر کہتے تھے کہ آپ کے کان سے یہ میل نکلا ہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ کسی آدمی کے کان میں اتنا میل کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک دن میرے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ میں کان صاف کروانے بیٹھ گیا۔ کن میبلے نے بہت مہارت سے سلائی میرے کان میں ڈالی اور اسے اندر دھونے لگے۔ مجھے بہت اچھا لگا لیکن میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ بدظاہر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن آنکھیں بہت خفیف سی کھول کر اس کے ہاتھوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اس نے مختلف قسم کی سلائیاں میرے کانوں میں ڈال کر گھما گھما کر اس نے بہت چابک دستی سے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے ایک سلائی نکالی لیکن اس کے

ساتھ ہی میل کی ایک چھوٹی سی گولی بھی نکال لی اور بولا۔ ”دیکھیے باوجود صاحب! آپ کے کان میں کتنا میل تھا۔ آپ کو کس سے تم ہفتے دن میں ایک دفعہ کان ضرور صاف کروانا چاہئیں۔“

”جو اس کرتے ہوں تم۔“ میں پھر کر بولا۔ ”تم نے یہ میل میرے کانوں سے کیا ہے؟“

”تو کیا یہ میں نے اپنے کانوں سے نکالا ہے؟“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”جھوٹ مت بولو۔“ میں چیخ کر بولا۔ ”میں نے کل ہی ایک ای این این کی سرجن سے اپنے کانوں کی صفائی کروائی ہے۔“ میں نے بھی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”کیا تم اس ڈاکٹر سے بھی زیادہ ماہر ہو؟“

”کان صاف کروانے کے بعد آپ بہانے بنا رہے ہیں۔“ وہ تلخ لہجہ میں بولا۔ ”میرے تو تمہیں دینا ہی پڑیں گے۔“

”میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔ تم بے وقوف بناتے ہو لوگوں کو۔“

”سیدھی طرح سے پیسے نکال۔“ وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تو اس کے منہ پر چٹا رخ سے ایک ٹھنڈا رسیر کر دیا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ کر اس کے پیٹ پر گر پڑا۔

”کچھ اچھا لگا۔ وہاں سے اس کے پیٹ پر اسٹیشن والے تھے اور اس کے سب ایک دم مجھ سے لپٹ گئے۔

وہیں پارک کے ایک گوشے میں میری عمر کے کچھ لڑکے بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔ مجھے بتا دیکھ کہ وہ دوڑے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا ڈپٹ کر بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑو اسے، ایک آدمی کو ل کر اسے آدمی مار رہے ہو؟“ اس لڑکے کی آواز سن کر ان لوگوں نے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے، کلائیوں اور چہرے پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر میرا جائزہ لیا پھر درشت لہجے میں بولا۔ ”کیوں مار رہے تھے اسے؟“

”انہو بھائی! اس نے کان صاف کروائے اور پچھے بھی نہیں دے رہا ہے۔“ وہ کن سیلیا بولا جس نے میرے کان صاف کیے تھے۔

”یہ جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے میرے کانوں سے نہیں بلکہ اپنے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے میل نکالا تھا۔ اگر آپ کو نہیں نہ آئے تو اس کا

کپڑا اتار کر دیکھ لیں۔ اس میں اب بھی میل کی گولیاں ہوں گی۔“

”اپنے سر سے کپڑا اتارو۔“ انہو نے جھکمانہ لہجے میں کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سادہ لباس پولیس آفیسر ہے۔ وہ غلطی ہوئی انہو بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دیں۔“

”معافی ان صاحب سے مانگو۔“ انہو نے حکم دیا۔ ”اور ہمارے لیے گرما گرم چائے اور سوسے لے کر آؤ۔“

کن سیلیا میری طرف گھوما اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”مجھے معاف کر دیں۔“ پھر وہ تیزی سے چلا گیا۔

انہو نے مجھ سے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ وہ مجھے ایک طرف لے گیا جہاں پانی کا ٹانکا لگا ہوا تھا۔ اس نے میرا منہ دھلوا دیا، میرے کپڑے صاف کیے اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہاں اس کے چار پانچ دوست پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ وہ کسی اپنے پلیوں سے آوارہ اور غصے لگ رہے تھے۔ انہو بھائی خامے معقول لباس میں تھا۔

اس نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ ”یہ مراد ہے، یہ عقل ہے، یہ اشراف ہے لیکن ہم اسے شرف کہتے ہیں اور یہ خالد ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”میرا نام انور ہے لیکن لوگ مجھے انوکھتے ہیں۔ آپ کا کیا نام ہے؟“

”میرا نام انور ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ تو ہے میری بہن۔“ ملاقات تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لاہور کا بہت خطرناک غنڈا ہے۔ اس نے نے ہزاروں لوگوں کو مارا تھا، ان پر تشدد کیا تھا اس پر ٹکیوں کے انوار اور زیادتی کا بھی الزام تھا لیکن اب تک کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا اس لیے وہ آزادانہ شہر میں ندنا تا پھرتا تھا۔

بہت سی ٹکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنی گرل فرینڈز سے ملوایا۔ ان میں سے ایک لڑکی فوزیہ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کا تعلق اوسط درجے کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ وہ گھر سے ملازمت کرنے لگی تھی تاکہ اپنے بوڑھے والد کا ہاتھ بٹائے لیکن نہ جانے کیسے انوکھے ہتھے چڑھ گئی۔ انہو اس سے چھوٹے مولے کام لیتا تھا اور اسے خاصا معقول معاوضہ دیتا تھا پھر فوزیہ کے بعد شہناز، سہلی اور عذرا میری زندگی میں آئیں۔ ان لڑکیوں کا انوکھے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ میری دوست تھیں اور میری مراد و خواہش پر مبنی تھیں۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پہنچنے کو کہتا پھر خود بھی اسٹیشن پہنچ جاتا۔ لاہور اسٹیشن پر بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں

کوئی بھی نہیں جاتا۔ مختلف ویران جگہوں پر لوگوں کے ناکارہ ڈبے کھڑے ہوتے تھے۔ میں چونکہ انیس ایم کا بیٹا تھا اس لیے اگر کوئی مجھے اس طرف جاتے دیکھ بھی لیتا تو۔۔۔ باز نہیں نہ کرتا۔ دو چار دفعہ بوگیوں کے ناکارہ ڈبے استعمال کرنے کے بعد تو میں بے خوفی سے یہ کام کرنے لگا۔

اب اکثر انہو بھی وہیں آ جاتا تھا۔ کبھی اس کے دوست بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر بات چیت کرتے، مگر یہ سچے اور ایک دوسرے کو لڑکیوں کے قصے بچارے لے لے کر بتاتے۔ جی ہاں، انہو کی صحبت میں رہ کر میں سگریٹ بھی پینے لگا تھا اور کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا تھا۔ اب میں اس کے ساتھ مختلف دارداروں میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ میں فطرتاً نڈر تھا اور انوکھے کے ساتھ رہ کر میں لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی طاق ہو گیا تھا۔

لاہور ہی میں میری ایک خالہ بھی رہتی تھیں۔ برسوں پہلے کسی بات پر اماں کے تعلقات ان سے خراب ہو چکے تھے اس لیے اے ای ان سے ملتی نہیں تھیں۔ میں بچپن میں ایک دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کا بہت بڑا گھر تھا۔ خالو خامے دولت مند آدمی تھے۔ وہ بڑس کرتے تھے اور اس وقت ان کی آمدنی میرے اندازے کے مطابق انہو میں تھی۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ ایک تو مجھے ان کے نام یاد تھے نہ پھرے۔

ایک دن میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ اباجی بہت افسردہ اور پریشان گھر میں داخل ہوئے۔ اماں بھی انہیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔ ”کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے سیر۔“ اباجی نے افسردگی سے کہا۔ ”تم پھنڈی چلنے کی تیاری کرو۔“

”یا اللہ خیر۔“ اماں گھبرا کر بولیں۔ ”بھائی جان کے یہاں تو سب خیریت ہے؟“ پھنڈی میں میرے ماموں ٹار رہتے تھے۔ وہ اہی اور خالہ سے بڑے تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے، مجھ سے تو خاص طور پر بہت محبت کرتے تھے۔

”بھائی ٹار۔۔۔۔۔“ اباجی کہتے کہتے رک گئے۔

”کیا ہوا بھائی جان کو؟“ اماں رو دیاں ہو گئیں۔

”بھائی ٹار۔۔۔۔۔“ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ اباجی نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”ہائے میرا دیر۔“ اماں نے کہا اور پکڑا کر گرنے ہی والی تھیں کہ میں نے لپک کر انہیں تھام لیا اور اٹھا کر چار پائی پر لٹا دیا۔ خود پیرا دل بھی غم سے پچھا جا رہا تھا۔ نورین بھی غم

ہم لوگ اسی دن پٹنڈی پہنچ گئے۔ ماموں سفر آخرت کے لیے تیار تھے۔ شام تک میں اپنے بھتہ کرنے والے ماموں کو منوں مٹی تلے باکرہ واپس آ گیا۔ ماموں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر مجھے مزید اذیت ہو رہی تھی۔ وہاں خالد زینت بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی۔ خاندان کے کچھ بزرگوں نے اماں اور خالد زینت کی صلح کروادی پھر تو وہ دونوں ایک دوسرے سے لگ لگ کر یوں ہلک کر روئیں کہ وہاں موجود ہر آدمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بھائی کی جدائی کا غم تھا یا بہن سے برسوں نہ ملنے کا صدمہ..... دونوں رو رو کر نڈھال ہو گئیں تو پھر ماما نے ان دونوں کو سنبھالا۔

زینت خالہ کی دونوں بیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں لیکن
میں نے ابھی تک کسی پردھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت نہ
جانے کس کے گھر سے کھانا آگیا۔ کھانے کو بالکل دل نہیں
چاہ رہا تھا لیکن دوسروں کے اصرار پر مجھے دسترخوان پر بیٹھنا
پڑا۔ ابھی میں نے پہلا ہی قلعہ لیا تھا کہ میرے منہ میں آگ
ہی لگ گئی۔ تورے میں اتنی گرمی تھیں کہ میرے حلق سے
لے کر کانوں تک میں آگ لگ گئی۔ میں نے گھبرا کر پانی کی
تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسی وقت ایک خوب صورت
مرد میری طرف بڑھ آیا۔ میں نے پانی کی تلاش میں اسے
گھاس لے کر پانی دینے والی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جلا
کی حسین اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی بڑی بڑی
سیاہ آنکھوں میں عجیب سا سر تھا۔ اسے دیکھ کر میں پانی پینا
بھول گیا۔ وہ ایک عجیب شان بے ناز سے آگے بڑھ گئی۔
میں چند لمحوں تک گھاس لے کر ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر ایک ہی
سانس میں پورا گھاس خالی کر دیا پھر مجھ میں دوسرا قلعہ لینے کی
جرات نہ رہی اور میں نے کھانے سے ہاتھ منہ منچ لیا۔

شام تک ماموں جان کے تمام دوست احباب اور ان کی فیملیوں چلی گئیں۔ اماں نے مجھے بلا یا۔ وہ اس وقت بھی زینت خالہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ”صفدر!“ اماں نے کہا۔ ”تم نے انہیں پچا پتا؟“ انہوں نے خالہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے خالہ زینت کو برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن نہ پہچاننے کا کیا سوال تھا۔ میں نے کہا۔ ”اماں! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ خالہ زینت ہیں۔“

”ارے، یہ صفدر ہے؟“ خالہ نے کہا۔ ”ماشاء اللہ یہ تو اپنے اباجی سے بھی لمبا ہو گیا۔“

”اور وینڈس بھی۔“ میرے پیچھے سے کسی لڑکی کی

آواز آئی لیکن وہاں خاندان کی کئی لڑکیاں تھیں اس لیے مجھے علم نہ ہوا کہ یہ جملہ کس کا تھا۔

”شہزادہ“ خالہ نے کسی کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ۔“ وہی شعلہ جوالا چلتی ہوئی وہاں آگئی۔ ”یہ تیری نسیبہ خالہ کا بیٹا“ خالہ نے کہا۔ ”اور یہ میری بیٹی بیٹی شہزادہ ہے۔“ شہزادہ نے بے نیازی سے مجھے دیکھا پھر نرمی انداز میں سلام کر کے اسی ہی کے پاس بیٹھ گئی۔

”تو زمین سے تو علم ہی چلی ہو۔“ خالد نے کہا۔
 ”ای، میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔“ اچانک خوب
 صورت کی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ اس کے چہرے
 دوسرا بادلوں میں شہر کی شاہی تختی کی طرح، دکھائی
 لیکن میں شہر اس سے نہیں آگے تھی۔
 ”میں خود اپنا تعارف کروا دیتی ہوں۔“ اس نے
 سترم لیجے کر کہا۔ ”مضرب بھائی امیں آپ کی کون یعنی خالد
 اور مشا ہوں۔“ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھا۔ شہر
 میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی مجھے
 لڑکیاں کھان کر دیا تھا۔

ہم لوگ ماموں جان کے سوئم کے بعد واپس آ گئے
بہنہ اماں وہیں رک گئی تھیں۔ لاہور آنے کے بعد میری
طرز میں وہی منظر گھومتا رہتا کہ شمرہ مجھے اپنے خوب
سورت و نقول سے پانی کا گلاس پینا کر رہی ہے۔ آج وہ
ایسا دلہانہ محفل لوٹ آئیں اور نور بی بی، چندی دلوں میں وہ
بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ میں نے کچھ دن تو ماموں جان کی
بوت کا سوگ منایا پھر میرے وہی معمولات شروع
کئے۔

ایک دن رات گھنے میں گھر میں داخل ہوا تو اباجی کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہاں سے نرستے ہوئے میں اپنا نام سن کر چونک گیا۔ اباجی کہہ رہے تھے۔ ”تم کس منہ سے صفدر کا رشتہ لے کر زینت کے ہاں جاؤ گی۔“ صاحب زادے سوائے آوازہ گردی کے اور رستے بھی کیا ہیں؟ یوں بھی بھائی مشتاق کو رو باری آدمی۔۔۔ وہ بھلا یہ کھانے کا سودا کیوں کرنے لگے؟“

”آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا مفرد تو
 مومنوں میں ایک ہے۔۔۔۔۔ شہزادہ گیتا ہے بالکل۔“
 ”کوئی بھی ذی ہوش شخص کسی لکھال شہزادے کو اپنی
 باتیں دیتا۔ شہزادہ تو پھر خوب صورت ہے۔ دولت مند باپ
 (ٹائیٹن) ہے اور الیف ایس سی کر رہی ہے۔ ہاں اگر
 جزادے میرے مشورے پر عمل کرتے اور انجینئرنگ

پڑھ رہے ہوتے تو اس صورت میں شاید یہ رشتہ لے جانے پر میں بھی اعتراض نہ کرتا اور میں ممکن ہے کہ حضور کے بتائے ہوئے مستقبل کو دیکھ کر بھائی مشتاق بھی انکار نہ کرتے۔“ میں جو بچل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ رات میں نے گویا انگاروں پر گزاری۔ اباجی واقعی سچ کہہ رہے تھے۔ میں آخر تھا بھی کیا؟ ایک آوارہ اور لنگھا جو مگر یہ بتاتا تھا اور لڑکیوں کی عزت بھی پامال کرتا تھا۔ اباجی کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ ان کے علم میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ میں جراثیم کی راہ پر بھی چل پڑا ہوں اور اپنے ساتھ ہر وقت ہسپتال بھی رکھتا ہوں۔

میں رات بھر سگریٹ پھونک رہا اور صبح کے بارے میں سوچ رہا۔ اذان فجر بلند ہوئی تو میں نے برسوں بعد نماز فجر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے روبرو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر برا کام چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دوں گا اور خوشگوار عمر کے قابل بنائوں گا۔ صبح کی نماز کے بعد اباجی واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس دن میں نے اباجی کے ساتھ ہی ناشا کیا اور ان نے کہا۔ ”اباجی! کیا اسباب بھی میرا داخلہ بھجڑ تک میں ہو سکتا ہے؟“

انجام دینے چاہئے کہ مجھ کو کمالیہ کالج بھیج دیں۔ ”بیٹا ایک سال تو تم نے آوارہ گردی میں ضائع کر دیا وہ نہ تمہارے بھائی تو ایف ایس سی میں اتنے اچھے تھے کہ انھیں انجینئرنگ میں داخلہ بہت آسانی سے مل جاتا۔“

”اباجی! اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو کون سی پر تعلیم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”لیکن بیٹا! تم تو بیمار نہیں تھے۔ میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر پوچھو رسی میں اگر گھنچاں بھی ہو تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگیں گے۔ تمہیں میڈیکل سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟“

”ابا بھئی امیر سے ایک دوست کے بھائی ڈاکٹر ہیں، میں ان سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 حالانکہ میرا ایسا کوئی دوست نہیں تھا جس کے بھائی ڈاکٹر ہوں لیکن میں سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتا تھا۔
 ”وہی ہے جس میں بروقت خیال آیا ہے۔“ انجیئر نے یونیورسٹی میں داخلے شروع ہونے ہی والے ہوئے۔“

میں اسی دن یونیورسٹی چلا گیا اور جارج پریسل صاحب سے ملا۔ وہاں میرے اعتماد سے زیادہ میری انگریزی بولنے کی صلاحیت کام آئی۔ میں نے بہت اچھے نمبروں سے

پرنس صاحب نے کہا۔ ”آپ مجھے بہترین طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دے کر مجھے خوش ہوگی۔ آپ اپنی بیماری کا یہ ایکل سرٹیفکیٹ تو لا ہی سکتے ہیں؟“

”شیڈیو سر۔“ میں نے کہا۔ ”میں کل ہی آپ کو سرٹیفکیٹ لا دوں گا۔“

”قل نہیں آپ سات تاریخ کو اپنے کاغذات بنھے
لاکر دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کا ایڈیشن
ہو جائے۔“

میں نے اس روڈ انوسے کہا۔ اس نے مجھے سہرے
ایک معروف ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ لا دیا اور بولا۔ ”تو
پانچ مہینے تک بیمار رہا ہے۔ تیرے سر میں شدید درد ہوتا تھا
اور چکر بھی آتے تھے لیکن اب علاج کے بعد تو بالکل ٹھیک
ہو گیا ہے۔“

ہوں میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو گیا۔ یہ کو یا ایک مجوزہ تھا ورنہ انجینئرنگ اور میڈیکل میں تو اچھے سے اچھے طالب علم کو ایڈمیشن نہیں ملتا۔ یہ شاید میری اس دعا کا اثر تھا یا اباجی

کی روایت ازاداری کا
میں دو بارہ پھر اس مشورہ سے چرچا کیا۔ میں نے
سب آوارہ لڑکوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ میں نے کبھی بھی لڑکی کی
طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ بس ایک انوسے میری
دوستی تھی۔ وہ بھی میری مجبور تھی۔ میں اس سے دوستی ختم
کر تا تو میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہاں، اس نے
مجھ پر اتنا کر ضرور کیا کہ وہ میری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ
نہیں بنا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ اسٹیشن کی
ناکارہ بو کیوں والا ٹھکانا ختم ہو گیا تھا۔

میں اب اکثر خالہ زینت کے کھر بھی چلا جاتا تھا۔ ان کا محل نما گھراب پہلے سے زیادہ آراستہ تھا۔ خالو مشتاق کے پاس جدید ماڈل کی ہنڈ اسی تھی۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس سائیکل تھی۔ مجھے وہاں سائیکل پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے میں بسوں میں دھکے کھاتا ہوا وہاں جاتا تھا اور کچھ فاصلے پر اتار کر کسی سے لیتا تھا تاکہ وہاں رہنے والوں کو میری کم کمانچسکی کا احساس نہ ہو۔

میں چپ بھی خالہ کے گھر جاتا، شمرہ بہت کم میرے سامنے آتی تھی۔ کبھی سامنا بھی جاتا تو وہ بے نیازی سے ملام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی۔ اس کے

برعکس رمشا بہت باتونی اور شوخ لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہوئی تھی۔ میں بھی اسے بچی سمجھ کر ہی بات کرتا تھا۔ وہ اس وقت آنکھوں میں کلاں میں پڑھ رہی تھی۔

میں اس دن یونیورسٹی سے واپس آیا ہی تھا کہ خالہ زینت آئیں۔ حسب معمول رمشا ان کے ساتھ تھی، شمرہ نہیں آئی تھی۔ اماں نے بہت دالہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا پھر شکایتا بولیں۔ ”باجی! کیا شمرہ آدم بیزار ہوگئی ہے یا تم نے اسے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے؟“

”ارے نسیم! اس لڑکی پر تو پڑھائی کا بھوت سوار ہے۔ وہ کالج میں اول پوزیشن لینے کی تیاری کر رہی ہے۔“ میں خالہ زینت سے مل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رمشا میرے پیچھے پیچھے ہی آگئی۔ اس نے چمک کر کہا۔ ”ہیلو زین! کیسے ہیں آپ؟“

”رمشا! میں تم سے پورے گیارہ سال بڑا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو مجھ سے یوں بات کرتی ہو جیسے میرے برابر کی ہو۔“ میں نے کہا۔

رمشا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”آپ مجھ سے گیارہ سال بڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اور اگر آپ کو مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو میں بھی آئندہ بات نہیں کروں گی۔“

”اوہو، میرا مطلب یہ تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ سے گیارہ سال چھوٹی ہوں تو کیا ہوا۔ کیا میں بزرگوں کی طرح آپ کا احترام کروں؟“

اسی وقت نورین اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی اور بولی۔ ”تم یہاں کبھی بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں تلاش کر رہی ہوں۔“ پھر وہ مجھ سے بولی۔ ”بھیا! ذرا خالہ جان کے ڈرائیور کو بھی چائے وغیرہ دے آئیں۔“ میں خالہ کے ڈرائیور کو چائے دینے گیا تو گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ گاڑی تو نہیں تھی جو خالہ وفاق کے استعمال میں رہتی تھی۔ خالہ جان تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اماں سے بولیں۔ ”نسیم! تم بھی ہماری طرف آ جاؤ۔ میرا بھانجا تو اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔“

”میں بھی آؤں گی باجی۔“ اماں نے کہا۔ ”بس گھر کے کچھ بڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔“ میرا دل چاہا کہہ دوں کہ آپ کی طرح ہمارے گھر میں تو کہیں ہیں لیکن میں یہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد اماں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ نورین ہنسی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی۔ ”بھیا! آپ کے لیے ایک اچھی

خبر ہے۔ آپ آئیں کریم کھلانے کا وعدہ کریں تو بتاؤں گی۔“

”مجھے آئیں کریم کھانا ہے تو ویسے ہی کھائے۔ بہانے باز یاں کیوں کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس واقعی ایک خبر ہے۔ آپ سنیں گے تو اچھل پڑیں گے۔“ اس نے کہا۔

”جہل پھر تیری آئیں کریم بچی۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اگر وہ خبر تیری دوسری باتوں کی طرح فضول ہوئی تو آئیں کریم نہیں ملے گی۔“

”اماں! اور خالہ! آپ کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“ نورین مسکرا کر بولی۔

”میری شادی کی بات؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، وہ دونوں تو بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں لیکن میں اس وقت برآمدے میں تھی اس لیے ان کی باتیں سن لیں۔“

”ارے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ اماں کو تو کب سے میری شادی کی فکر ہے۔“ میں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

”تم بتاتی ہو کہ وہ دونوں آپ کی اور شمرہ باجی کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“

میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔ ”میری شادی کی بات؟“

”دیکھا، کیسے دل میں لڈو چھوٹ رہے ہیں۔“

”پوری بات بتا۔“ میں نے اس سے کہا۔

”پوری بات تو بتادی۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”مجھے تفصیل سے بتاؤ، وہ کیا باتیں کر رہی تھیں؟“

”وہ.....“ نورین سوچتے ہوئے بولی۔ ”اماں نے خالہ جان سے کہا کہ باجی، آپ کو یاد ہے میں نے شمرہ کو کچھین ہی میں صفرہ کے لیے مانگ لیا تھا۔ خالہ جان نے کہا ہاں مجھے یاد ہے۔ میں تو خود جانتی ہوں کہ شمرہ کی شادی صفرہ سے کر دوں لیکن صفرہ اپنے بیروں پر تو کھڑا ہو جائے۔ ملک صاحب کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔“ وہ خالو وفاق کو ملک صاحب کہتی تھیں۔

”صفرہ بیٹا انجینئر بن جائے گا تو وہ بھی انکار نہیں کریں گے۔ صفرہ کو نا پسند تو وہ نہیں کرتے۔“

نورین کی باتیں سن کر میرا دل گویا بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ منزل خودی میرے نزدیک آ رہی تھی۔

میں نے ریٹیکو چڑانے کے لیے کہا۔ ”یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے اور شمرہ بھی تو نہ جانے کتنی لڑکیاں یونیورسٹی میں میرے آگے پیچھے بھرتی ہیں۔“

”اب آپ اسے وعدے سے پھریں مت۔“

نورین نے کہا۔ ”ہاں اگر آپ کو شمرہ باجی پسند نہیں ہیں تو آپ اماں سے انکار کریں۔“

”اماں کی پسند ہے وہ۔ میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”خبر تو ایسی کوئی خاص نہیں ہے لیکن آئیں کریم تو مجھے کھلائی ہی پڑے گی۔“ اس دن کے بعد تو میں شمرہ کے عشق میں مزید ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میں اب لاشعوری طور پر خالہ جان کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن شمرہ کا رویہ عجیب تھا۔ وہ بھی سامنے آ جاتی تو بہت شائستہ انداز میں سلام کر لیتی ورنہ میرے سامنے نہ آتی۔ چاہے میں گھنٹوں وہاں بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کا یہ رویہ عجیب سا لگتا تھا۔ مجھے تو اپنی مردانہ وجہات پر بہت ناز تھا گوئی بھی لڑکی مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی پھر شمرہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اسے بھی علم ہو گیا تھا کہ خالہ جان اس کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں؟ کیا وہ مجھ سے شرماتی ہے یا پھر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟ اس کے برعکس رمشا ہمیشہ میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی۔ میں اس سے شمرہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ مجھے علوم پر بات کرنا پسند نہ تھا۔ شمرہ تو وہی رنگ میری پسند بھی بن جاتا۔ کریموں سے مجھے شدید چڑچڑاہٹ تھی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ قیہ اور کریم شمرہ کی پسندیدہ دُش ہے تو میں قیہ اور کریم سے بہت رنجت سے کھانے لگا۔ رمشا نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ شمرہ باجی کو سفید کاشن کا کلف دار شلوار سوٹ پسند ہے تو میں ان کے یہاں سفید راقی کاشن کی کلف دار شلوار قمیض پہن کر جانے لگا۔

میں جتنا اس کے نزدیک ہوتا چاہ رہا تھا، وہ اتنا ہی مجھ سے کڑی تھی۔ شمرہ نے بی ایس کی کیا تو واقعی اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ میں یہ خبر سننے ہی بازار کی طرف بھاگا اور اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسوں سے شمرہ کے لیے انتہائی خوب صورت اور نئی گھڑی خریدی اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

اس دن میری قسمت اچھی تھی کہ شمرہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں مجھے سلام کیا اور اندر کی طرف جانے لگی تو میں نے پہلی دفعہ اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے رک کر بیزار سی میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”جی، کیسے؟“

”شمرہ! میں تمہیں امتحان میں کامیابی کی مبارک باد دینے آیا ہوں اور تم اندر جا رہی ہو۔“

”جی بہت شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ پھر اندر جانے کے ارادے سے لپٹی۔

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا حنفہ تو لیتی جاؤ۔“ میں نے خوب صورت بینک میں لپٹا ہوا گھڑی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔

”سوری صفرہ بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”میں..... یہ گفٹ.....“ اسی وقت خالہ جان آئیں، وہ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔

میں نے خالہ جان کو سنانے کے لیے کہا۔ ”بھئی یہ تمہاری کامیابی کا انعام ہے۔ تم اسے لینے سے انکار کر رہی ہو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے گھڑی کا ڈبا میرے ہاتھوں سے لے لیا۔

”ایک منٹ۔“ میں نے پھر کہا اور اپنا لایا ہوا مضامی کا ڈبا کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”غوثی کے موقع پر تو منہ میٹھا کرتے ہی ہیں نا!“ اس نے پھر خالہ کی طرف دیکھا اور مضامی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”اوہو، مضامی! کھلائی جا رہی ہیں؟“ رمشا نے کہا۔

”میں بھی تو امتحان میں پاس ہوئی ہوں، میرا گفٹ کہاں ہے؟“ اس نے مضامی کھانے ہوئے کہا۔

”تم نے کوئی پوزیشن نہیں لی ہے۔“ خالہ جان نے اسے گھورا۔

”اچھا تو حنفہ لینے کے لیے پوزیشن لینی پڑتی ہے۔“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”غٹیک ہے، اب میں بھی آپ کو پوزیشن لے کر دکھاؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر میری پیٹھی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”عجیب اول جلول لڑکی ہے۔“ خالہ جان نے کہا۔

”شمرہ والی تو کوئی بات بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ جتنی ہردار ہے۔ یہ اتنی ہی شوخ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔“

”خالہ جان! رمشا ابھی بچی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بڑی ہوگئی تو یہ بھی شمرہ کی طرح بردبار ہو جائے گی۔“ میں پھر وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ اب میں سارا دن بھی یہاں بیٹھا رہوں تو شمرہ میرے سامنے نہیں آئے گی۔

میں نے اس دن ایک کام اور کیا تھا۔ گھڑی کے ساتھ ایک کاغذ پر ایک شعر بھی لکھ دیا تھا۔ ”مت نل تمہیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں..... تب خاک کے پردے سے

انسان نکلتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے یہ شعر شمرہ کو دے تو دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اس پر کچھ اثر ہوگا بھی یا نہیں۔ رشتا نے بتایا تھا کہ شمرہ باہمی شاعری کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اگر اسے شعر و شاعری کا شوق تھا تو یقیناً یہ شعر بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا اور میرا شکوہ بھی۔

میں ان دنوں انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں تھا اور شمرہ ماسٹر۔۔۔ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے بیرون پر کھڑا ہونے کے لیے جزیروں پر مل جائے گا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میرے امتحانات ختم ہوئے تو مختلف کمپنیوں سے ملازمت کی پیشکش ہونے لگی۔ میں سوچ بچ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ابائی نے بھی یہی کہا تھا۔ ”بیٹا! جلدی مت کرنا۔ خوب سوچ بچ کر فیصلہ کرنا۔ اپنے اساتذہ سے مشورہ بھی ضرور کرنا۔“

☆☆☆

ان ہی دنوں میرے دل پر گویا بجلی گر پڑی۔ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ وہ خبر سن کر میں زندہ کیسے رہا۔ میرے دل کی حرکت بند کیوں نہ ہوئی۔ ابھی میں نے ملازمت کی بھی نہیں تھی کہ اماں سے مہر نہ ہو سکا۔ وہ شمرہ کا رشتہ لے کر خالہ جان کے یہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے رشتے کی بات کی تو مشتاق خالو نے انتہائی رعوت سے انکار کر دیا اور بولے۔ ”معاف کرنا لیسہ اتم میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ میری بیٹیاں عیش و آرام اور ناز و نعم کی عادی ہیں۔ تمہارا بیٹا ان کے اخراجات کہاں سے پورے کرے گا؟“

”میرا بیٹا اب ماشاء اللہ انجینئر ہو جائے گا۔“ اماں نے فخر سے کہا۔

”تب بھی کتنا کمالے گا؟“ خالو مشتاق نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس کی تنخواہ سے میری بیٹی کے دو جوڑے بھی نہیں آئیں گے۔ انسان کو رشتہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی کرنا چاہیے۔ آپ بھی کسی کلرک یا انجینئر ماسٹر کی بیٹی کا رشتہ دیکھیں۔“

اماں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ خالہ جان انہیں روکتی ہی رہ گئیں لیکن اب رکے کا کیا جواز تھا؟ یہ سب تفصیل مجھے نورین نے بتائی تھی۔ وہ اماں کے ساتھ گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی

دھڑکن رک گئی ہو اور ذہن مفلوج ہو گیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے زندگی کا احساس ہوا تو مشتاق خالو کی باتیں یاد کر کے میرا خون کھولنے لگا۔ انکار کرنے کے اور بھی بہت سے مہذب طریقے ہوتے ہیں۔ انہیں اماں کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

میں اسی وقت گھر سے نکل گیا اور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں اسی دورا ہے پر آن کھڑا ہوا تھا جہاں سے شمرہ کی ایک طرف محبت کھینچ کر لے گئی تھی۔ یہ میری ایک طرف محبت ہی تو تھی ورنہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک میں اسے اپنے عشق میں گرفتار کر چکا ہوتا پھر اس کا دولت مند باپ میری ماں کی بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لڑکی تن کر اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی لیکن شمرہ نے تو یہی مجھ سے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی۔ کھل کر بات کرنا تو دور کی بات ہے، اس نے تو اس پورے عرصے میں مجھ سے صرف چند جملے ہی بولے ہوں گے۔

میں جتنا شمرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میرے تصور میں اماں کا بے بس چہرہ تھا۔ جب مشتاق خالو نے انہیں دھکا دیا ہوگا تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

میں شاید ایک اسٹیشن پر یوں ہی غمراہ ابی طور پر بیٹھا ہوا رہا وہاں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں کئی لڑکیاں بے انتہا خوب صورت تھیں لیکن ان میں شمرہ جیسی کوئی نہیں تھی۔

رات کو میں تنہا ہمارا گھر آ رہا تھا کہ انو مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک ہوٹل میں چلا گیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے صفر۔۔۔۔۔۔ تو کچھ پریشان ہے؟“

میں اپنے دل کا حال کہہ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ انو نے پوچھا تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”یار! اس سب کے بے محال۔“ خالو مشتاق سمجھتے تھے۔ انو بھی انہیں جانتا تھا۔ ان کا گاڑیوں کا ایک شوروم بھی تھا۔ انو ان سے بھٹائی کرتا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انو میرا دوست ہے ورنہ وہ بہت پہلے میرا داخلہ اپنے گھر میں بند کر چکے ہوتے۔

”یار! ہم کر بھی کیا کئے ہیں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”یار! اس حرام زادے نے دولت کے نشے میں ڈوب کر اماں کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تو ان کی بے عزتی برداشت کر لے گا؟“

”وہ تو مجھے برداشت کرنا پڑے گی۔“ میں نے

کہا۔ ”اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میں اس مشتاق کو کوئی بار دوں؟“

”اسے مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔“ انو نے کہا۔ ”ورنہ اسے تو میں کل ہی گولی مار دوں گا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہے، میں اس کے ساتھ ایسا کروں گا کہ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔“

”کیا کرے گا تو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں اس کی بیٹی کو اٹھا لوں گا۔ کیا نام بتایا تو نے شمرہ؟“

”تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔

”یار! پوری بات سنے بغیر بیچ میں مت بول۔“ انو نے کہا۔ ”کوئی بھی لڑکی ایک دو رات گھر سے باہر رہے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ تو فکر مت کر اس کی عزت پر آج بھی نہیں آئے گی۔ میں اسے صرف دو دن تک رکھنے کے بعد دوبارہ گھر چھوڑ دوں گا پھر وہ مجھاس کی شادی تجھ سے کرنے پر راضی ہوگا۔۔۔۔۔۔ میں اس کے جانے والوں میں یہ مشہور کر دوں گا کہ یہ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”لیکن یار! میرا دل نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ تو میری بیٹی ہے۔“

”اس میں شمرہ کی بے عزتی کہاں ہوگی۔“ انو نے کہا۔ ”وہ تو بہت آرام سے بڑی حفاظت میں رہے گی۔“

”انو! یہ کام بہت خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا خطرناک ہے یار؟“ انو نے حسد بنا کر کہا۔ ”تو

کیا مجھے جانتا نہیں ہے۔ کیا میں نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کئے اور اب تو میں نے پورا ایک گینگ بنالیا ہے۔ اب اس شہر پر میرے بھائی کا راج ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”کوئی لو کا پٹھا دولت کے نشے میں چور ہو کر میری ماں کی بے عزتی کر دے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تجھے دوست کہا ہے تو میری ماں میری ماں بھی تو ہوئی۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں خود اقسام کی آگ میں سلکا ہوا تھا اس لیے مجھے اس کی ہر بات صحیح لگ رہی تھی۔ ”اب تو مجھے اس کے اسکول کا پتا بتا۔“ اس نے کہا۔

”میں اسے راستے ہی سے اغوا کر لوں گا۔“

”یار! وہ اسکول میں نہیں کالج میں پڑھتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بس میں یا پیدل نہیں جاتی ہے بلکہ ان کا ڈرائیور ہوتا ہے، وہ گاڑی میں جاتی ہے۔“

”تو ڈرائیور کہاں کا رستم ہوگا۔ میں گاڑی روک کر

سرعام اسے اغوا لوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کا چھکا بھی کر دوں گا تاکہ اس سیٹھ کے دل پر دہشت طاری ہو جائے۔“

”نہیں یار۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرائیور ہی تو گھر جا کر اس کے اغوا کی خبر دے گا۔“

”چل، تو کہتا ہے تو ڈرائیور کو بخش دیتا ہوں۔“ میں نے اسے شمرہ کے کالج کا پتا بتا دیا۔ خالو مشتاق کے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور اسے بتایا کہ ان کے پاس کس میک اور ماڈل کی اور کس رنگ کی گاڑیاں ہیں۔

”بس تو اب بے فکر ہو جا۔“ انو نے کہا۔ ”نکل کا سورج اس سیٹھ کے لیے بدنامی اور رسوائی لے کر آئے گا۔“ ”لیکن یار! ایک بات کا خیال رکھنا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی عزت پر ذرا بھی آج نہیں آتی چاہیے۔“

”تو فکر مت کر یار۔“ انو نے ہنس کر کہا۔ ”وہ آخر بھائی ہے میری۔ بھائی تو بہن کی طرح ہوتی ہے۔ میں اسے بہت باعزت طریقے سے لے جاؤں گا اور انتہائی باعزت طریقے سے چھوڑ بھی دوں گا۔“

”انو! میں اسے بھلا ہونے کے لیے دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر شمرہ کی محبت انو کی بے عزتی پر اس کی محبت تو میرے دل پر نقش ہوئی لیکن اسے وقتی طور پر مایوسی کے اندھیروں نے نکل لیا تھا۔ اب انو نے امید کی کرن دکھائی تو مجھے شمرہ کا حصول اس مرتبہ ممکن نظر آنے لگا۔ بھلا ایسی لڑکی سے کون شادی کرتا جو گھر سے دو راتیں باہر گزرا کر آتی۔ وہ بھی اغوا ہو کر۔ ایسے میں جب میں اس کے لیے رشتہ بھیجتا تو اس کا مفرد باپ اسے ہی قبول کرنے میں عاقبت سمجھتا۔ شمرہ کی نظروں میں میری عزت بڑھ جاتی کہ میں سب کچھ جانتے بوجھتے اسے اپنا رہا ہوں۔ میں مطمئن ہو کر گھر آ گیا لیکن اس رات۔۔۔۔۔۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس رات مجھے بے چینی اور اضطراب تو تھا لیکن مایوسی اور بے چارگی نہیں تھی۔

میں رات کو دیر تک جاگتا رہا اس لیے دن چڑھے تک سو رہا۔ اچانک اباجی کی گھبراہٹ ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔

”تم ابھی تو رین کو لے کر فوراً باجی کے گھر چل جاؤ۔ نہ جانے بے چارگی کی کیا حالت ہوگی۔“

میں آنکھیں ملتا ہوا کرے سے باہر آیا اور اباجی سے

پوچھا۔ ”کیا ہوا باجی! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“
 ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔
 ”صفر پٹا! آج صبح کچھ لوگوں نے رمشا کو اغوا کر لیا ہے۔“
 ”رمشا کو اغوا کر لیا ہے؟“ میرے ذہن میں گویا کسی
 نے تھوڑا سید کر دیا۔ ”رمشا کو کون اغوا کر سکتا ہے باجی؟“
 ”یہاں تو اب اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں معمول کی
 بات بن کر رہ گئی ہیں پٹا۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”مجھے باجی نے خود ٹیلی فون کیا تھا۔“ باجی نے کہا۔
 ”وہ بے چاری تو صحیح طرح بات بھی نہیں کر پار ہی تھی۔ ان
 کا ڈرائیور رمشا کو اسکو لے کر جا رہا تھا آج شہرہ کی
 طبیعت خراب تھی اس لیے وہ کالج نہیں گئی تھی ورنہ دونوں
 نہیں ساتھ جاتی ہیں۔“

”اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی۔“ اماں نے
 کہا۔ ”ورنہ اغوا کرنے والے تو دونوں لڑکیوں کو لے
 جاتے۔“ ”فون بری طرح رد رہی تھی۔ اس دوران میں رمشا
 سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بھی تو اس کی بہن عمر۔
 میرا سر بری طرح پکڑا ہوا تھا۔ یہ انہوں نے کیا غضب
 کر دیا۔ اس نے رمشا کو اغوا کیوں کیا پھر مجھے خود ہی خیال
 آیا کہ اس میں ان کا بھی کیا قصور؟ وہ نہ شہرہ کو بچا جاتا تھا نہ
 رمشا کو اسکو لے کر لے گئی ہو تو وہ بھی بچتا ہوگا کہ
 یہ شہرہ ہے۔ اس نے اسی کو اغوا کر لیا۔“

”صفر پٹا! باجی نے کہا۔“ تم بھی خالہ کے پاس
 چلے جاؤ۔ انہیں اس وقت تسلی کی ضرورت ہے بیٹا۔ میرا
 اے انیں ایم آجائے تو میں بھی آتا ہوں۔“
 عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ انوکھی غلط فہمی کی
 وجہ سے میرا مقصد بھی پورا نہیں ہوا اور وہ مصحوم بن گئی بھی
 اذیت سے گزر رہی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ میں فوراً انو سے
 ملوں لیکن فی الحال اس سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ نہ
 جانے اس وقت کہاں ہوگا؟ اس وقت سیل فون اتنے عام
 نہیں ہوئے تھے۔ ہاں پاکستان میں دولت مند لوگوں نے
 سیل فون خرید لیے تھے جنہیں وہ ہاتھوں میں لے کر چلتے
 تھے۔ گویا اس کی نمائش کر رہے ہوں۔ میرا اس وقت خالہ
 جان کے گھر جانا ضروری تھا۔

میں اماں اور نورین (رینو) کو لے کر خالہ جان کے
 گھر روانہ ہو گیا۔ وہاں عجیب کھرام پچا ہوا تھا۔ ہم سے پہلے
 وہاں خالو مشتاق کے بھائی اور ان کے بیٹے موجود تھے۔
 خالو مشتاق بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں

نے بہت سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔
 میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ واقعہ کہاں پیش آیا
 خالو۔۔۔ ڈرائیور کہاں ہے؟“
 ”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔“ خالو نے سرد لہجے میں
 جواب دیا۔ ”وہ آج شام تک اغوا کرنے والوں کو ڈھونڈ
 نکالے گی۔“

”میرا ایک دوست ایس بی کرہنر ہے۔“ مشتاق
 خالو کا ایک بھتیجا بولا۔ میں اسے پہلے بھی کئی تقریبات میں
 دیکھ چکا تھا لیکن اس سے میرا تعارف نہیں تھا۔ میں نے بھی
 اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ یوں
 بھی عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس کے
 چہرے پر بھی وہی رعیت تھی جو عمو کا دولت مند لوگوں کے
 چہروں پر نمایاں ہوتی ہے۔

اجانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی تو وہاں موجود ہر
 شخص چونک کر ٹیلی فون سیٹ کو گھومنے لگا۔ خالو مشتاق نے
 آگے بڑھ کر ریسپورڈر اٹھایا اور بولے۔ ”ہیلو۔۔۔ کون۔۔۔ تم
 ڈیل آدی۔۔۔ کیا سنو؟ ہاں بولو۔۔۔ اچھا پھر۔۔۔ کیا
 کہا۔۔۔ بچہیں لاکھ روپے۔۔۔ ورنہ کیا کرو گے؟ کہاں
 پہنچاؤں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو! انہوں نے ریسپورڈر دیا۔ شاید
 دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی تھی۔

”کیا ہوا باجی جان؟“ اماں کے منہ سے پوچھا۔
 ”اسی ڈیل آدی کا ٹیلی فون تھا جس نے رمشا کو اغوا
 کیا ہے۔“ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
 میں چونک اٹھا۔ یہ تو ہمارے پلان میں شامل نہیں
 تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“
 ”کہہ رہا تھا کہ کل تک بچہیں لاکھ روپے کا انتظام کر لو
 ورنہ تمہاری بیٹی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔“ خالو مشتاق کا بھتیجا
 اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔
 ”کسے ٹیلی فون کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”میں ایس بی رضا کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ ساجد
 نے کہا۔ ”اسے ساری صورت حال بتاتا ہوں۔“
 ”اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو
 رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“

”ارے یہ اچھے اس قسم کی دھمکیاں تو دیتے ہی ہیں۔“
 ساجد نے کہا۔ ”میں رضا کو ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔“
 ”اچھی ذرا ٹھہر جائیں۔“ میں نے اچانک کہا۔
 ”کیوں؟“ ساجد نے میری طرف غوم کر پوچھا۔
 مجھے ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر شہ ہو گیا ہو۔

موٹاپا کریں کم...!!
Young!!
slim، فٹ اور
راہیں

طیبی
عرق
اوبیسول

موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا
 100 فیصد قدرتی یوڑی ہوئیوں سے تیار شدہ

- جسم سے لاکھروں جراثیم خارج کرتا ہے • ہاضمہ درست اور تیز کر دیتا ہے
- اجابت صاف لاتا ہے • آنتوں کی سوزش دور کرتا ہے
- ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند

طیبی
 دو ماہانہ (پرائیویٹ) کمپنی
 کراچی - پاکستان www.tayyebi.com.pk

1815

”وہ لوگ پھر کب ٹیلی فون کریں گے؟“
”تھیں کیسے معلوم کہ وہ پھر ٹیلی فون کریں گے؟“
ساجد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
”یہ تو سامنے کی بات ہے ساجد صاحب۔“ میں نے
کہا۔ ”ابھی انہوں نے صرف رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا
کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ یہ بات تو کوئی کم قوت آدمی
بھی بتا سکتا ہے۔“ ساجد نے مشتاق خالو کی طرف دیکھا۔
”ہاں، مفرد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی
صرف یہی بتایا ہے کہ رمشا ان کے قبضے میں ہے اور پچیس
لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ بعد میں ٹیلی
فون کریں گے۔“
”تو کیا اس وقت تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے
رہیں؟“ ساجد نے کہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہا تھا۔
”تو پھر کیا کریں گے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
مجھے تو اس سے پہلے بھی چڑھی۔ ”نکل جائیں رمشا کی تلاش
میں اور لے آئیں اسے۔“
”میں نے رضا کو ٹیلی فون کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
”تھیں جلدی کیا تھی؟“ خالو مشتاق نے اسے
جھڑک دیا۔۔۔ ”رضا بھی کیا کر لے گا؟ کیا تم پولیس کی
کارکردگی سے واقف نہیں ہو؟ ان لوگوں کا دوسرا ٹیلی فون
آئے دو چکر چھ سوچیں گے۔ اسی وقت ڈرائنگ روم میں
ایک باوردی ایس بی داخل ہوا۔ اس نے کمرے میں موجود
ہر شخص کا جائزہ اس انداز سے لیا جیسے انھیں لکھنے والے ہی لوگوں
میں سے کوئی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص اس کے احترام میں نہ
جانے کیوں کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ پولیس کا
ایک افسر تھا، کوئی صدر مملکت یا وزیراعظم نہیں تھا کہ لوگ
اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ خالو مشتاق البتہ پہلے
ہی کھڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ایس بی ہے
جس پر ساجد اچھل رہا ہے۔
”کچھ معلوم ہوا؟“ اس نے ساجد سے پوچھا۔
”معلوم کرتا تو آپ کا کام ہے ایس بی صاحب۔“
میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے کھم کرتا گواری سے مجھے
دیکھا۔ وہ چہرے سے ہرگز ایس بی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس
کے جسم پر وردی نہ ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ وہ پولیس کا کوئی
معمولی حوالدار یا ایس آئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہ
وقار نہیں تھا جو افسروں کے چہروں پر ہوتا ہے، چہرے پر
یوں بھی خباثت پریں رہی تھی۔
اس نے تلخ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کی

تعریف؟“
”میں مشتاق ملک صاحب کا بھانجا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”ساجد اتم نے رضا کو یہاں کیوں بلایا ہے؟“ خالو
مشتاق نے کہا۔ ”وہ بھی وردی میں۔“ انھوں نے والے۔۔۔
گھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم
ہو گیا کہ ہم نے پولیس سے رابطہ کر لیا ہے تو وہ رمشا کو کوئی
نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“
”تو کیا آپ انہیں پچیس لاکھ روپے دے دیں
گے؟“ ساجد نے بھی تلخ انداز میں کہا۔
”پچیس لاکھ؟“ رضا نے پوچھا۔
”ہاں، انھوں نے والوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے
فون کر کے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
”انہوں نے یہ بھی بھیج دی ہے کہ اس بارے میں پولیس کو
اطلاع نہ دی جائے ورنہ رمشا ہمیں زندہ نہیں لے گی۔“
”یہ تو کسی پیشہ ور گینگ کا کام ہے۔“ رضا نے
راز دارانہ انداز میں کہا۔ ”ایسے لوگوں کی ہسٹری پولیس کے
پاس بھی ہوتی ہے۔ میں ابھی آفس جا کر معلوم کرتا ہوں کہ
اس قسم کی وارداتوں میں کون سے گروہ ملوث ہیں۔ آپ فکر
مت کریں مشتاق صاحب، میں ان لوگوں تک جلد ہی پہنچ
جاؤں گا۔“ وہ اپنی چڑی پر اتار دیا۔
مجھے اب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ میں وہ لوگ انوکھ پہنچ
ہی نہ جاؤں۔ اس کا بھی تو پولیس ریکارڈ ہوگا پھر میں نے یہ
سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ انہوں آج تک بھی گرفتار ہی نہیں
ہوا، ابھی جیل میں گیا۔ اس کا ریکارڈ پولیس کے پاس کب
ہوگا؟ پولیس والوں نے ایک ظلم یہ کیا تھا کہ ڈرائیور کو اپنی
تحویل میں لے لیا تھا۔ ورنہ میں اس سے کچھ معلومات
حاصل کرتا کہ انھوں نے والے کتنے آدمی تھے؟ ان کے
جلبے کیسے تھے؟ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کا روالہ میں
انوکھی موجود تھا یا نہیں؟ خالو مشتاق تو کچھ بتانے کے سہو میں
نہیں تھے۔
میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر انوکھی تلاش میں نکل کھڑا
ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ اس کے
تو کوئی ٹھکانے تھے۔ میں اس کے ایک ٹھکانے کی طرف
جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس نے
مجھ ایس اور کیسے تھے ان کے حوالے تو وہ اس وقت اپنے کسی
بھی ٹھکانے پر نہیں ہوگا۔ وہ کسی ایسی جگہ ہوگا جہاں اس نے
رمشا کو رکھا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی میں نے اپنا ارادہ ملتوی
کر دیا اور ایک ریسٹوران میں جا بیٹھا۔

میں نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ
میری نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا
تھا۔ اس نے شلوار میں اور پٹاوری چپل پہن رکھی تھی اور
چہرے ہی سے اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ
اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اسے گھورتے ہوئے پایا۔
مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی جوابی طور پر اسے گھورتے لگا۔
وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔
میں نے بے اختیار اپنے نیچے پر ہاتھ مارا لیکن عرصہ ہوا میں
پستول رکھنا چھوڑ چکا تھا، اس لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس حرکت چہرے والے نے کرسی چھٹی اور میرے سامنے
بیٹھ گیا پھر وہ انتہائی بے تکلفی سے بولا۔ ”کیا حال ہے؟“
”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”ارے یار، ایسی بھی کیا ہے مروتی؟“ اس نے مکرورہ
انداز میں کہا۔ ”تم انوکھی کی دوست ہو نا؟“
”کون انوکھی؟“ میں نے پوچھا۔
”تم انوکھی کو نہیں جانتے؟“ اس نے جبر سے
کہا۔ ”تمہاری یادداشت تو بہت کمزور ہے۔“
”مطلب کی بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”یار ایک دفعہ انوکھی تم سے ملنے پونہرونی گئے
تھے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اس کے گویا مجھے یاد والے
کی کوشش کی۔“ میں بھی اس دن ان کے ساتھ تھا۔
مجھے یاد آ گیا کہ پونہرونی یونین کے انکیشن کے موقع
پر انوکھی سے پاس آیا تھا۔ میں نے خود انکیشن میں حصہ نہیں
لیا تھا لیکن میں اپنے ایک دوست کے پستول کو سپورٹ کر رہا
تھا۔ انوکھی سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ مجھے اس کی مدد
کی ضرورت تو نہیں ہے؟
اچانک پولیس کا ایک اے ایس آئی وہاں آ گیا اور
بولا۔ ”بائے لیل، ڈرامیرے ساتھ تھانے چل۔“
”کیوں جناب، اب میں نے کیا کر دیا ہے؟“
”یہ تو تھانے چل کر ہی معلوم ہوگا۔“ اے ایس آئی
نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
”تھیں بھی چلنا پڑے گا۔“
”مجھے کیوں؟“
”یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا۔“ اس نے کہا۔
”تم ہوش میں تو ہو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔
”مجھے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟“
”آپ بالے کے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے۔۔۔“

”تم سے کس نے کہا تھا کہ پولیس کو اس معاملے میں انوا لو کرو۔ اب وہ لوگ پچاس لاکھ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں پچاس لاکھ بھی دے دوں گا لیکن اب وہ ہمیں دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اب پولیس نے مداخلت کی تو وہ رمشا کو قتل کر کے اس کی لاش ہمارے گھر کے سامنے چھینک دیں گے۔“

”لیکن چچا جان میں نے تو.....“

”رہنے دو۔“ انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ ”تم نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے اسلحہ بی رمشا کو اس کیس میں انوا لو کر لیا۔ اب اگر رمشا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کسی معاف نہیں کروں گا۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مشتاق۔“ ان کے بھائی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ساجد تمہارا دشمن نہیں ہے، یہ اسے رمشا سے کوئی دشمنی ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کی۔“

”یہ بھلائی ہو رہی ہے میرے ساتھ؟“ خالو مشتاق نے درشت لہجے میں کہا۔ ”رمشا کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ ٹکرائیں گی تو بہت دیر سے کر کے کیا تھا کہ وہ شام تک ان لوگوں تک پہنچ جائے گا پھر اب کیا ہوا؟“

”وہ تو اپنی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت بھی آپ کا ٹیلی فون آواز دہکائی ہوئی ہے۔“

”گفتگو اسلحہ کی آواز میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔“ ساجد نے کہا۔ ”رمشا بہت ذہین پولیس افسر ہے اور.....“

”تم نے کس کی اجازت سے میرا ٹیلی فون آواز روک دیا؟“ خالو مشتاق گرج کر بولے۔ ”تم کیا چاہتے ہو کہ وہ لوگ رمشا کو قتل کر دیں؟“

”تم اس وقت پاگل ہو چکے ہو۔“ ان کے بھائی نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ تو بھلائی کرنا ہی نہیں چاہیے۔ پھر وہ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ ”رمشا کو ابھی اور اس وقت مع کرو کہ وہ کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔ اس سے کہو کہ وہ مشتاق کے فون کو آواز روک دینے سے ہٹا دے۔“

”ڈیڈی! اس سے تو رمشا کی جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔“ ساجد نے کہا۔

”تو رمشا کا باپ نہیں ہے۔“ اس کے باپ نے گرج کر کہا۔ ”کیا تو چاہتا ہے کہ مشتاق تجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اس دور میں تو کسی کے ساتھ بھی ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی رمشا کو ٹیلی فون کر اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کر۔“

”بھائی جان! آپ فضول میں بات بڑھا رہے ہیں۔“

خالو مشتاق نے کہا۔

”میں بات کو بڑھا رہا ہوں۔“ وہ گرج کر بولے۔

”تم نے دس آدمیوں کے سامنے میرے بیٹے کی تذلیل کر دی۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے، تمہیں بچل کا باپ ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

ساجد نے ٹیلی فون پر کسی کے نمبر ڈائل کیے اور بولا۔

”ہیلو رضا! میں ساجد بول رہا ہوں۔ یاد چچا جان نہیں چاہتے کہ پولیس اس کیس میں مداخلت کرے۔ سارا سیٹ اپ ختم کر دو، ریکارڈنگ روک دو اور ان کے ٹیلی فون سے آواز روک دینا۔ یاد چچا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“

”ہاں، جب انہیں احساس نہیں ہے تو میں کیوں سرکھپاؤں۔ تم بھی صبح سے مصروف ہو گھر جا کر آرام کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ ”میں نے رضا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مزید کوئی کارروائی نہ کرے۔ اب آپ جا سکتے ہیں اور آرام کریں۔“

”اب چلو یہاں سے۔“ اشتیاق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

”پلیز ایسے موقع پر آپ میں تو تعلقات خراب مت کریں۔“ میں نے کہا۔ ”ساجد صاحب نے تو اپنے طور پر بالکل درست فیصلہ کیا تھا لیکن.....“

”میں نے تمہاری رائے نہیں لی تھی۔“ خالو مشتاق نے انتہائی حقارت سے کہا۔ ”ابا جی بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔“

ان کے بھائی اپنے بیٹے کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ ابا جی نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ چند منٹ بعد ابا جی بھی باہر آ گئے اور مجھے لان کے ایک سنان گوشے میں لے گئے۔ میں حیران تھا کہ ابا جی مجھ سے کیا بات کرنے والے ہیں۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”صفر! تجھے اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو نے دیکھا بھائی مشتاق نے تجھے کس طرح ذلیل کر دیا۔“

”وہ تو اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہیں ابا جی۔ انہوں نے تو اپنے بھائی اور مجھے کو بھی ناراض کر دیا۔ میں نے تو ان کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ آپ فکرمات کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

وہ واپس اندر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر خود کو لامنت کرنے لگا۔ میرے باپ کو میری عزت کا اتنا خیال تھا کہ وہ مشتاق کی درشت کلامی بھی برداشت نہیں کر سکے۔ کل جب انہیں یہ علم ہوا کہ ان کا بیٹا اس انوکھا ڈسے دار ہے تو

ان کا کیا حال ہوگا۔ میں نے دل سے دعا کی۔ ”یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرما دے اور میری عزت رکھ لے۔ میں اپنے کے پر مشر مندہ ہوں۔ رمشا کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھنا میرے لاک۔“ دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”یا اللہ! تو ہم سب پر رحم فرما۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

اسی وقت مجھے خالو مشتاق کی آواز سنائی دی۔

”صفر! تم دور رہو؟“

”مجھے رمشا کی طرف سے بہت پریشانی ہے خالو۔“

میں نے کہا۔ ”وہ محسوس ہوتی ہے نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔“

”چلو، اندر چلو۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔ میں نادم سا ان کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ وہ تو شکر ہے کہ دعا کے ابتدائی جملے میں نے بلند آواز میں نہیں کہے تھے ورنہ خالو مشتاق مجھے ابھی پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اندر اب صرف خالو مشتاق کے ایک بڑی اور ابا جی بیٹھے تھے۔ باقی لوگ دھشت ہو چکے تھے۔ خالو شاید ابا جی کو رخصت کرنے باہر آئے تھے۔ وہ مجھے لان میں روک دیا کچھ کمری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ میں ایک منٹ پھر جان بوجھ کر اسٹارٹ جاری ہو گیا۔ صرف دیوار گیر گھڑی کی ٹنگ ٹنگ سنائی دے رہی تھی۔

”میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اب ان بد بختوں نے پچاس لاکھ کا مطالبہ کر دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ کل تک اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟“ پچاس لاکھ اس دور میں آج کے کم سے کم پانچ کروڑ کے برابر تھے۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بھی انہیں رقم نہیں دیں گے۔ میں ابھی مارکیٹ جا کر نوٹوں کے سائز کے کاغذ کٹوا لیتا ہوں۔ ہم ان کاغذوں کی گڈیاں نوٹوں کی طرح بنائیں گے پس ان کے اوپر اور نیچے جڑا روپے کا صرف ایک نوٹ ہوگا۔“

”وہ لوگ پریشان ہیں بیٹا۔“ خالو مشتاق نے نرم لہجے میں کہا تو ابا جی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”پہلے وہ اپنی ٹنگی کریں گے۔“

”ایسی وارداتوں میں انوکھا کرنے والوں کے پاس اتنا وقار نہیں ہوتا کہ وہ نوٹ کٹنے بیٹھے جائیں۔“

اسی وقت فون کی ٹنگی بجنے لگی۔ خالو مشتاق نے

اسی وقت فون کی ٹنگی بجنے لگی۔ خالو مشتاق نے

ریسیور اٹھایا اور بولے۔ ”ہیلو! ہاں میں سن رہا ہوں..... اچھا..... پھر..... لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد تم لوگ مجھ سے دھوکا نہیں کرو گے۔ اچھا..... لیکن مجھے ایک دن کی مہلت اور دے دو..... میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اتنی ہی رقم مزید جمع کرنے میں مجھے کچھ تو وقت لگے گا..... کیا..... ہاں، وہ تو ابھی دے سکتا ہوں..... کہاں..... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا پھر ابا جی سے بولے۔ ”میں نے کہا تھا کہ جڑا روپے پیشہ لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اب صرف پچیس لاکھ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ مجھے رقم کا بریف کیس لے کر مال روڈ پر جانا ہوگا۔ وہیں ان کا کوئی آدمی مجھ سے بریف کیس لے لے گا۔“

شاید انہوں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مزید رقم کا مطالبہ نہ کریں۔

”لیکن بھائی مشتاق۔“ ابا جی نے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد وہ رمشا کو بہ حفاظت ہمارے حوالے کر دیں گے؟“

”میں نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا۔“ خالو مشتاق نے کہا۔ ”انہوں نے کہا کہ بھائی ضمانت ہماری زبان پر ہے۔“

”آپ کو اس پر اعتماد کرنا ہوگا۔“ ابا جی نے پوچھا۔

”میں انہوں سے کب مافی ہے؟“ ابا جی نے پوچھا۔

”وہ کل کیا رہے ہیں مجھے بتائیں گے کہ مجھے کس وقت گھر سے نکلتا ہوگا اور مال روڈ پر کس طرف پیدل چلنا ہوگا۔ انہوں نے انتہائی سختی سے کہا ہے کہ اگر پولیس کا یا کوئی مشتبہ شخص میرے آس پاس بھی ہوا تو وہ مجھ سے رقم لیے بغیر لوٹ جائیں گے۔“

”اس کے لیے مال روڈ کا علاقہ تو مناسب نہیں ہے۔“ ابا جی نے کہا۔ ”وہ صرف دھوکا دے رہے ہیں۔ کل وہ کسی ایسے مقام کا تعین کریں گے جہاں عام لوگوں کا گزر نہ ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رقم ملنے ہی آدھے گھنٹے کے بعد رمشا گھر پہنچ جائے گی۔“

خالو مشتاق کے بڑی منظور صاحب نے کہا۔ ”اب ان کی طرف سے کوئی ٹنگی فون نہیں آئے گا۔ آپ صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔“

”آرام کیسے کروں منظور صاحب۔“ خالو مشتاق کے لہجے میں عجیب سا کرب تھا۔ ”میری بیٹی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ آپ بھی کوئی کٹھنوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں۔“

”میں نے کہا تھا۔“

”میں نے کہا تھا۔“

”میں نے کہا تھا۔“

TSR Watermark - Unregistered version

پیشینہ ڈائجسٹ 272 جنوری 2015ء

حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میرا حساب جرم اور احساسِ عداوت مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میں خالو مشتاق سے پلٹ کر اس بری طرح رویہ کا بڑا حال ہو گیا۔ یہ رمشا کی موت سے زیادہ بچھتاوے کے آنسو تھے۔

پولیس نے رمشا کی لاش وہاں سے اٹھائی تھی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا پھر مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اسٹیشن کے دورِ افتادہ گوشے میں آخری پلیٹ فارم پر پولیس کو تین لاشیں مڑی تھیں۔ انہیں کوئی مار کے قتل کیا گیا تھا۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش انوکھی بھی تھی۔ پھر ساری صورت حال میری سمجھ میں آ گئی۔

انہوں نے ان لوگوں پر زور دیا ہوا کہ وہ رمشا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیں۔ ان لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ وہ دونوں آدمی انوکھی گولیوں سے ہلاک ہوئے ہوں گے پھر ان کے کسی آدمی نے ان کو گولیاں باردی ہوں گی۔ ان کے آپس کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر رمشا وہاں سے بھاگ نکلی ہوگی۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ پنجیس لاکھ روپے کا چیک ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر رمشانے پل کے جھنگے پر کیوں کھلاک کر ان کا پیچھا کیا؟ وہ رمشا کی طرف سے تھیں۔ میں کامیاب بھی ہو جائے تو تب بھی وہ اس کا پیچھا لگاؤ نہیں سکتے تھے۔ پل پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے رمشا کو نہیں لے جاسکتے تھے پھر میں بھی اس پل پر موجود تھا۔ اس نے آخر کیا کیوں کیا؟

جب انو اور دوسرے لوگوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں اس ریو اور سے ہلاک ہوئے تھے جو انوکھے ہاتھ میں تھا۔ ان پر جس ریو اور سے گولیاں چلائی گئی تھیں، پولیس کو وہ ریو اور نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انوکھے فائر ان دونوں ہی نے کیے تھے جو رمشا کا تعاقب کر رہے تھے۔

☆☆☆

رمشا کی موت کے بعد میں بالکل نوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کہ ایک معصوم لڑکی میری خواہشات کی بیخست چڑھ گئی۔ مجھے ہر لمحہ رمشا کی کٹی ہوئی لاش کا خیال رہتا تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے نزدیک تھا اس لیے رات دن وہاں

ٹریوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔ رمشا کے تعاقب میں جو آدمی تھے، وہ میرے لیے اجنبی تھے لیکن ان کے چہرے میرے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف رمشا کے قاتل تھے بلکہ انوکھے قاتل بھی تھے۔ میں ان سے رمشا کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

میں انوکھے کے ساتھ رہ کے اس کے کئی ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ ایک دن میں انوکھے کے ایک ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ بے غار چھوٹا سا جائے کا ایک ہوٹل تھا۔ اس کا مالک دلاور تھا۔ اس نے ہوٹل کے عقی جسے میں ایک ہال بنا رکھا تھا جہاں لوگ کیرم اور تاش وغیرہ کھیلتے تھے۔ اس ہال کی دائیں جانب دو کمرے تھے جہاں انوکھے اور اس کے ساتھی بیٹھتے تھے۔ وہ لوگ عموماً اس جگہ کسی واردات کی منصوبہ بندی کرتے تھے اور وہیں ہونے والے مال کا بھارا بھی ہوتا تھا۔ زیورات اور قیمتی اشیاء اور خرید لیتا تھا اور اس کے بدلے میں نقد رقم ادا کر دیتا تھا۔ انوکھے دو تین ٹھکانے اور بھی تھے لیکن میں نے سب سے پہلے اس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا۔

کاؤنٹر پر اس وقت دلاور کے بجائے ایک نو عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ میں اس لڑکے کو بھی پہچانتا تھا۔ دلاور کی عدم موجودگی میں وہی کاؤنٹر بیٹھا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، میں بے نیازی سے ہوٹل کے عقی جسے کی طرف بڑھ گیا۔

ہال میں اس وقت کچھ لوگ کیرم کھیل رہے تھے اور ایک طرف تاش کی بازی بھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہاں کیرم پر بھی جوا ہوتا ہے اور تاش پر بھی لیکن نقد رقم بھی سامنے نہیں ہوتی تھی۔

وہاں اس وقت مجھے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ میں مایوس ہو کر باہر آ گیا اور ایک طرف بیٹھ کر انوکھے کے آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے یکے بعد دیگرے تین مگریت پھونک ڈالے۔

میں مایوس ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے دروازے پر ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اس کی عقی سیٹ پر ساجد بیٹھا تھا۔ لوگ اسے بوجھتے تھے۔ وہ اس گینگ کا آدمی تھا جو انوکھے اور دیکھنے کی وارداتیں کرتا تھا۔ انوکھے میں اسی گینگ میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے جو کو ایک دوسرے انوکھے کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ انتہائی دانا تھا اور بات بات پر پتول نکال لیتا تھا۔ پھر موٹر سائیکل سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ موٹر سائیکل والا اسے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ ممکن

ہے وہ بھی اسی گینگ کا آدمی ہو لیکن میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے اب بے تابی سے جوا کا انتظار تھا۔ وہ ضرور ان بد معاشرلوں کو جانتا ہوگا جو انوکھے اور رمشا کی موت کے ذمے دار تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن یہاں موجود نہیں تھا۔ میں تو بار بار اس طرف آ گیا تھا۔

مجھے آدھ گھنٹا حریف انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے جوا باہر آتا دکھائی دیا۔ باہر آ کر اس نے مگریت سلگایا اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں کچھ فاصلے سے بکے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا رخ پرانے لاہور کی طرف تھا۔ میں بہت محتاط انداز میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بھائی گیت سے وہ اندر ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہو گیا۔ دو تین گلیاں طے کرنے کے بعد جو ایک پرانے اور پوسیدہ سے مکان کے سامنے رکا۔ مکان کا دروازہ مقفل تھا۔ جوتے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے جوتی کرخت آواز سنائی دی۔ ”سبجو، دروازہ کھول یار!“ میں نے آواز بدل کر کہا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ جوتے ہوگا، اس کے باوجود میں نے نہ خطرہ مول لیا تھا۔ دروازے کے دروازے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“ ”اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اس وقت خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ جوتے وقت خیال اور دھوتی میں تھا اور شاید سونے کی تیار کر رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کون ہے تو؟“ اچانک اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی اور وہ حیرت سے بولا۔ ”اوتے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے جوتے!“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا پھل چار پائی پر تلنے کے ساتھ ہڑا تھا۔

وہ اچانک پلٹا اور ایک کمرے میں اٹھانا چاہا لیکن میں نے اسے موقع نہ دیا اور اس کی پشت پر لات رسید کر دی۔ وہ لڑھک کر فرسٹر پر گر گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا پھل اٹھا لیا اور اس کا رخ جوتے کی طرف کر دیا پھر میں درشت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا جو روتہ میں کھو پڑی اڑا دوں گا۔“

جوتے ساکت ہو گیا اور بولا۔ ”تو آخر چاہتا کیا ہے؟“ ”میں جو کچھ پوچھوں سچ بتانا۔“ میں نے کہا۔ ”انوکھے“

کون سے قاتل کیا ہے؟“

”اوتے تو کیا دلاور کے گینگ میں شامل ہو گیا ہے؟“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے پر زور دیا۔ ”ماری اور بولا۔“ ”مجھ سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، وہ بتا۔“ پھر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”ہاں، میں دلاور کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ بس اب کوئی سوال مت کرنا۔ بتاؤ انوکھے کس نے قاتل کیا ہے؟“

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ کسی نے پشت سے مجھ پر ڈنڈے سے وار کیا تھا۔ وہ ڈنڈا میرے بجائے جوتے کے سینے پر پڑا اور حملہ آور اپنی ہی جھونک میں جو پر گر پڑا۔ پھل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گیا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا اب سنبھل گیا تھا اور دوبارہ ڈنڈا سنبھل رہا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے پر لات رسید کر دی۔ وہ انٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے جھک کر اسے دیوچ لیا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اس کے بڑے بڑے ہال مٹی میں جگڑ کر اس کا سر فرش پر دے مارا۔

اچانک پشت سے مجھے جوتی غراہٹ سنائی دی۔ ”بس کرو اوتے ہر دور نہ میری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

میں نے جوتے کو دیکھا۔ وہ پھل میں جھک کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پھل شخص دھکا دے گا تو نہیں نکلتا بلکہ فائر بھی کر دیتا ہے۔ میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب بتا، تجھے دلاور نے میرے پیچھے کیوں بھیجا ہے؟“ ”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟“ میں نے بے ساختہ اس کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بہت پرانی چال تھی لیکن وہ دھوکا کھا گیا اور اچانک پلٹ کر دیکھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا روتہ میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ہی جست میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ گیا اور اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ میں بھاگنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے وہاں سے رکشا پکڑا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اب دلاور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک دوسرے انوکھے دلاور کا نام سنا تھا لیکن ابھی اسے

دیکھا نہیں تھا۔ جو کے لیے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ دلاور سے خوف زدہ ہے۔ شاید وہ اتنا ہی بڑا بد معاش تھا۔

ہاسل پتھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا رزلٹ آچکا ہے اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ عام حالات میں مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس خبر سے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ میرا دوست وحید بھی پاس ہو گیا تھا۔ وہ اب ہاسل چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب میرا بھی ہاسل میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں گھر آ گیا۔ اباجی اس وقت آفس میں تھے۔ اماں اور رینو گھر میں موجود تھیں۔ جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے تو خوشی کے مارے وہ زار و قطار رونے لگیں، پھر اسی وقت وضو کر کے شکرانے کے نفل ادا کرنے کھڑی ہو گئیں۔ اباجی گھر لوٹے تو وہ بھی خبر سن کر خوش ہو گئے۔

ہمارا گھر ریلوے لائن کے بالکل نزدیک ہی تھا۔ اچانک ٹرین کی گزراہٹ شروع ہو گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ ہو گیا۔ اباجی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کیے اور گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر میں شاید چیخنے لگا۔ اس کے بدلے مجھے کچھ ہوش نہیں آیا۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ اباجی، اماں اور رینو وہاں موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اماں نے کہا۔ ”یالہ تیرا شکر ہے۔“ وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”اب کسی طبیعت ہے پتر؟“ اباجی نے پوچھا۔

”مجھے کیا ہوا تھا اباجی؟“ میں نے پوچھا۔

”تو کسی چیز سے ڈر گیا تھا یا؟“ اماں نے کہا۔ ”میں آج ہی شاہ جی سے تیرے لیے تعویذ لے کر آؤں گی۔ تجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“

مجھے سب یاد آ گیا کہ میں ٹرین کی آواز سن کر وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو خود اپنی ہی نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش نے ایک معصوم لڑکی کو نفل لیا تھا۔ میں گھرواپس آیا تو پھر وہی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے گھر تو ریلوے لائن کے نزدیک ہی تھا۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کانوں میں روٹی ٹھوس کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو اباجی آفس جا چکے تھے۔ میں ناشتا کر کے گھر سے نکل گیا۔ میں نے سگریٹ پیتا چھوڑ دی

تھی لیکن اب کئی دنوں سے پینے لگا تھا۔ میں سگریٹ ہمیشہ اسٹیشن کے ایک مخصوص اسٹال سے لیتا تھا کیونکہ وہاں ادھر اسگریٹ، بان وغیرہ مل جاتا تھا۔

میں سگریٹ سلگا کر مڑا ہی تھا کہ میری نظر ایک شاسا چہرے پر پڑی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے اسے اکثر انوکے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس سمت سے آ رہا تھا جہاں ریلوے کی پرانی بوگیاں کھڑی تھیں۔ میں انوکے ساتھ اکثر ان ہی بوگیوں میں سے ایک بوگی میں جا بیٹھتا تھا۔ وہ آدی تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے آواز دی۔ ”سنو!“

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور رک گیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے پوچھا۔ شاید وہ مجھے پہچانتا تھا یا پھر جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”یار! مجھے پہچانا؟“

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرن کے تاثرات تھے۔ واقعی وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔

”تم انوکے دوست ہوتا؟“ میں نے اچانک کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں شاسائی کی جھلک دکھائی دی۔ ”ہاں..... میں انوکا دوست ہوں۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے انوکے ساتھ کبھی کبھی کچھ بات کی ہے۔“

”کہیں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں یہاں اپنے ایک دوست کو ریسیو کرنے آیا تھا۔ وہ کراچی سے آنے والا ہے لیکن ابھی تک آیا نہیں ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے مجھ سے نظریں نہیں ملایا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی ٹرین کراچی سے نہیں آتی ہے۔ میری تو عمر اس پبلٹ فارم پر گزری تھی لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آؤ یار، چائے پیتے ہیں۔“ میں نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تمام لیا اور اسے پبلٹ فارم سے باہر ایک ہوٹل پر لے گیا۔ میں نے چائے کے ساتھ سوسے بھی منگوالیے۔

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر میں نے اچانک پوچھا۔ ”تم جو کوجانتے ہو؟“

”اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار دکھائی دیے۔ ”انوکے موت میں اس کا ہی ہاتھ ہے۔“

”یار! میں نے تو سنا ہے کہ انوکہ کی اور نے مارا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا قاتل ایک مرتبہ مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا۔“

”انوکہ عابد نے مارا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔

”میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ وہ اس دن کے بعد سے نظر نہیں آیا ہے۔ عابد جو کا آدمی ہے۔ جو، انوکے ساتھ شامل ضرور تھا لیکن اس کی بھی انوکے ہی نہیں۔“

”معاف کرنا یار! میں نے کہا۔“ میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”تو میں نے کب پوچھا ہے۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میرا نام اکمل ہے۔“

”میں صغیر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اکمل! تم عابد کا حلیہ دیکھتے ہو، ممکن ہے میں نے بھی اسے دیکھا ہو؟“

”وہ گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا گورا چٹا آدمی ہے۔“

مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ مرشا کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ میں نے اسل سے پوچھا۔ ”یار، کچھ اندازہ ہے کہ یہ عابد اس وقت کہاں ہوگا؟“

”اندازہ ہوتا تو میں وہاں جا کر اس کا کام تمام کر دیتا۔“

میں اس کے ساتھ مزید کچھ دیر بیٹھا، پھر اس سے آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے اٹھ گیا۔

دوسرے دن میرا ہاسل والا دوست وحید واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ میں نے وہ رات ہاسل میں گھر کے قریب فیصلہ کیا اور ایک بی بی او سے اباجی کو فون کر دیا کہ میں آج رات اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں رات گئے تک باہمی کی باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو کر لااری اڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچا تو رینو نے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ مجھے دیا اور بولی۔ ”بھئی! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہے۔“

لفافے پر کراچی کی ایک ٹیلی ویژن کھلی کپا چھپا ہوا تھا۔ اس میں میرا اپنا ٹیٹلڈ لپٹا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ امتحانات کے بعد میں نے اور وحید نے اس ٹیٹلڈ میں ملازمت کی درخواست بھیج دی تھی۔ بڑے بڑے ادارے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کو اپنے طور پر بھی پیشکش کرتے ہیں۔

”کس کا خط ہے بھئی؟“ رینو نے پوچھا۔

”مجھے کراچی کی ایک فرم میں جاب مل گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا کراچی جانے کا

کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رینو نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے جو کاتھوں چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر آیا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ میں دباؤ کر بولا۔

اس نے ایک دم اپنا ہاسل نکال لیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر رینو نے فلک شگاف چیخ ماری۔

اچانک کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا اباجی وہی تھا جو مرشا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی گتھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بے اختیار جیب پر ہاتھ مارا لیکن میرا ہاسل موجود نہیں تھا۔

”آواز نکالی تو اباجی چھپتی کر دوں گا۔“ عابد نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”تجھے میری تلاش تھی نا۔ اب میں تیری بہن کو لے جاؤں گا، پھر میرے ساتھ ساتھ اسے بھی تلاش کرتے رہتا۔“

رینو ایک دم وحشت زدہ ہو کر کھڑکی کی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ گھر میں بد معاش دیکھ کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ”انگرتو نے میری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھا بھی تو میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔“

”اچھا! عابد نے کہا۔ ”چل پھر کر دے ٹکڑے!“ وہ رینو کی طرف بڑھا تو میں بھی گن کی پروا کیے بغیر اس پر چھپنا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے رخص کرنے لگے اور میں دھڑام سے زمین پہ جا کر۔

میں پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ مجھے رینو کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس کی چیخیں معدوم ہو گئیں۔

میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا تا کہ اپنا ہاسل لے لوں۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں ہاسل اٹھانے کے لیے جھکا تو مجھے پکڑا آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے سر پر ہاتھ لگا یا تو مجھے علم ہوا کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔

میں نے اماں کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا اور خود دیوانہ وار

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیکس فیس

ٹی ٹی کی فیکس فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد گھٹے، چہرے اور گردن کی چمکیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کیساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ انہیں اور کرکٹیں ملنے پھرنے لیکن فیکس فیس کمانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

f www.facebook.com/top.treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیٹھک دوا ہے جو معجز اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماتروپون (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور دھماکے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں تیز اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

HELP LINE ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیٹھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145&6,0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

II

وہ پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔ اباجی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایس ایم صاحب! آپ کی بیٹی کا بیان بھی لیتا ہوں گا۔“

”ضرور بیان لو لیکن اسے ذرا سنبھلے تو دو۔ ابھی تو اس کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہے۔“

”بیان میں نہیں لوں گا بلکہ متعلقہ تھانے کا کوئی افسر لے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

”زیو بیٹا! سب کچھ سچ سچ پولیس کو بتادینا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“ اباجی نے کہا۔ ”گھبراہمت۔“

اکمل کو پولیس نے پھسکاری ڈال دی تھی اور اب اسے وہاں سے لے جا رہے تھے۔

”صغیر! تم گھر سے مت نکلا، میں ابھی آتا ہوں۔“

اباجی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

”یہ کون لوگ تھے بیٹا؟“ اماں نے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے انہیں گرفتار کیا؟“

اماں کو معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے گھر میں داخل ہونے والے تینوں بد معاش مرچکے ہیں۔

آدھے گھنٹے بعد خالو مشتاق اور خالہ زینت بھی وہاں پہنچ گئے۔ اماں جی نے انہیں ٹیلی فون کر کے بلایا تھا۔

انہوں نے ہم سے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ چلو۔ میں نے سرور علی صاحب سے کہا کہ انہیں گاڑی میں بھی ریوینا کا بیان لیتے آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں۔“

وہ اصرار کر کے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ان کے تعلقات تھے اس لیے ہمیں بالکل پریشانی نہیں ہوئی۔ اکمل نے بیان دیا تھا کہ مرنے والوں سے اس کی دشمنی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ اس کی نظر ان تینوں بد معاشوں پہ پڑی۔ وہ ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ پوری طرح سناٹے میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھ پر فائر کر دیا۔ اپنے دفاع کے لیے مجھے بھی فائرنگ کرنا پڑی اور وہ تینوں مارے گئے۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ریوینا بھائی اس سے پہلے ان سے الٹھا کر رہا تھا کہ میری بہن کو چھوڑ دو۔

اس کے بیان کی تائید محلے والوں نے بھی کی۔ یوں کسی جھگڑے میں پڑے بغیر ہماری جان چھوٹ گئی۔ جو، عابد اور ان کے ساتھی کی موت کے بعد مجھے کسی حد تک سکون مل گیا تھا اور میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں کراچی چلا

گھر سے باہر نکلا۔

ریوینا مزاحمت کے باعث وہ لوگ زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ عابد نے ریوینا کو کندھے پر اٹھایا تھا۔ بجوار دوسرا بد معاش آگے آگے گن لیے چل رہے تھے۔

میں نے سچ کر کہا۔ ”میری بہن کو چھوڑ دے کیسے!“

اچانک مجھ نے پٹیل کی نال میری طرف کی اور فائر کر دیا۔

میں نے گولی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ میرے بجائے گولی جو کوئی بھی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ فوراً ہی دوسرا فائر ہوا اور عابد کا ساتھی کرب ناک انداز میں چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔

عابد نے گھبرا کر ریوینا کو نیچے پیٹھک دیا اور بولکھلا کر مجھ پر فائر کرنا چاہا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی ایک اور فائر ہوا۔ گولی اس کے سینے میں بیوست ہوئی اور وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔

پھر ایک دیواری اوٹ سے اکمل نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کی نال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ اس دوران میں ریوینا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

وہاں ارد گرد لوگوں کا جمع لگتا جا رہا تھا۔ اکمل دوڑ کر میرے نزدیک آیا اور ریوینا کو مجھ کے پیچھے لٹا کر لے کر بھاگ جاتا۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہمیں بھی شے میں گرفتار کر لے۔“

وہ تینوں میرے سامنے مردہ پڑے تھے۔ میرے سینے میں ٹھنڈی پڑی۔ آخر اکمل نے انوار اور رشما کے قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

پھر وہاں پولیس اور ریلوے کا دوسرا عملہ ایک ساتھ پہنچا۔ میں ریوینا کو گھر میں چلا آیا تھا اور میں نے اپنا منسل بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا دیا تھا۔

ریلوے کے محلے کے ساتھ اباجی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ بد معاشوں نے ریوینا کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ حواس باختہ سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک اماں بھی ہوش میں آچکی تھیں۔ وہ بھی بری طرح بھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بری طرح روتی ہوئی ریوینا سے لپٹ گئیں اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے پولیس۔ ”تو ٹھیک تو ہے بیٹی؟“

”یہ بالکل ٹھیک ہے اماں!“ میں نے جواب دیا۔

دروازے پر ایک مرتبہ پھر دیکھ ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھ سے پہلے ہی اباجی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ لوگ بہت جگت میں وہاں سے بھاگے لیکن میں اپنا بیگ اٹھاتا نہیں بھولی۔ اس مرتبہ پھر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹنی باندھ دی اور سز شروع ہو گیا۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح کچھ اور ڈاکو بھی وہاں چھپے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہی لوگوں کے لیے آئے تھے۔ جب پولیس اور ان ڈاکوؤں کا مقابلہ ہو رہا تھا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں میں ان کا ایک آدمی شامل تھا۔ اسی خوف سے وہ فرار ہو گئے تھے۔

اس مرتبہ وہ مجھے کسی ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ میری آنکھوں پر پٹنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے مجھے برقع پہنا کر اوپر سے نقاب بھی ڈال دیا تاکہ کوئی میری آنکھوں پر ہندسی ہوئی پٹنی نظر نہ آ سکے۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں اندر کی طرح ان کے ساتھ چل دی۔ دس منٹ تک چلنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹرین میں سوار ہونے کو کہا۔ لگتا تھا اب وہ ٹرین کے ذریعہ مجھے کہیں لے جا رہے ہیں۔

بوگی میں پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں سے پٹنی ہٹا دی۔ میں اس انتظار میں تھی کہ ان کے ہاتھ مجھے معلوم ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ ڈیڑے کی گھنٹیاں بندھیں لیکن میں ان سے کہہ کر انہیں کھلا سکتی تھی۔ ان سب لوگوں میں وہی مجھے سب سے زیادہ شریف اور ہمدرد لگتا تھا۔ وہ بوگی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بہت ہی بعد میں مجھے احساس ہو گیا کہ یہ بوگی بھی نہیں چلے گی۔ مجھے ٹرین کے انجن کا ہارن اور چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن وہ دوسری ٹرینیں ہوتی تھیں۔

جب ایک دن اسی طرح گزر گیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ بوگی بھی نہیں چلے گی کیونکہ یہ بالکل الگ تھلک کھڑی ہے۔ ”انہو بھائی!“ میرے منہ سے بے اختیار اس کے لیے بھائی کا لفظ نکل گیا۔ ”آپ مجھے گھر تک پہنچائیں گے؟“ ”تم پریشان مت ہو گڑیا، ہم آج ہی تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔“ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ بوگی میں تھوڑی دیر بعد کچھ اندھیرا چھا گیا۔ اچانک مجھے بوگی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اگر ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہ باندھے ہوتے تو میں کب کی وہاں سے نکل کر بھاگ چکی ہوتی۔ کوئی بہت آگے سے اندر آ گیا۔

کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ وہ لوگ بار بار کسی مفرد کا نام لے رہے تھے۔ یہ نام تو میرے دل کی دھڑکن تھا۔ مجھے اس پر مفرد بھائی یاد آتے تھے۔ وہ کہتے ڈھنگ اور پیٹم ہیں۔ میں عمر میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے دل کی بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو وہ سمجھتے ہی نہیں تھے، عجیب بدھوتے۔ شاید انہیں بھی کسی لڑکی سے محبت ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں ان سے کل کر اپنی محبت کا اظہار کر دوں لیکن ہر بار میری زبان گنگ ہو جاتی اور میں ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ میں نے اکثر یہ بھی سوچا کہ میں ریٹو سے اپنے جذبات کا اظہار کر دوں لیکن اس کے سامنے بھی مفرد بھائی کا نام لینے ہوئے میری زبان گنگ ہو جاتی۔

پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ مفرد بھائی مجھ میں کم اور باجی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ باجی شاید انہیں ناپسند کرتی تھیں یا ممکن ہے وہ بھی انہیں پسند کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ باجی اپنے دل کی بات نہ کہی مجھے بتائیں گی نہ مفرد بھائی کو بتائیں گی۔ کاش اس وقت مفرد بھائی یہاں آجائیں تو وہ ان بد محاشوں کو سیدھا کر دیں۔ روتے دھوتے پورا دن گزر گیا۔ میں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں حالانکہ اس انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں کچھ کھالوں، کم سے کم کچھ کھالوں لیکن میں نے ان سے انکار کر دیا۔ رات کو بہت مشکل سے میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس اور دو دھ کا ایک گلاس پیا۔ دپے مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بیگ میں کچ باجی بھی تو ہوگا۔ میرا بیگ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میں نے جلدی سے بیگ کھولا اور لٹچ باکس نکال لیا۔ اس میں سینڈوچز، فریج، فرائز اور مایونیز تھا۔ میں نے خوب ڈسٹ کر سینڈوچز کھائے اور جب چاکر میری جان میں جان آئی۔ لیکن یہ میں کیا لکھ گئی۔ مفرد بھائی کو معلوم ہوگا تو کتنی شرمندگی ہوگی اور شرہ باجی تو مجھے پھڑ مار دیں گی۔ مار دیں..... کم سے کم میں نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا اور اگر یہ تحریر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو..... تو بھی کیا ہے جب مفرد بھائی کو معلوم ہوگا، باجی کو معلوم ہوگا، ماما اور بابا کو معلوم ہوگا تو پولیس والوں سے کیا شرمانا لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ یا پتا تو خالہ نسیم کو اتنا ہے عزت کر چکے ہیں۔ اب تو شاید مفرد بھائی بھی ہمارے گھر بھی نہ آئیں لیکن انہیں معلوم تو ہو جائے گا کہ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو ان کے لیے جان تک دے سکتا ہے۔ رات کو اچانک

”کون ہے؟“ میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

”ڈروست۔“ مجھے آؤ کی آواز سنائی دی۔ اس کی زبان بری طرح لڑکھاری تھی۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر میرے بالکل نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔ ”رمشا! یہی نام ہے نا تمہارا؟“ تم نے بھی سوچا ہے کہ تم قتی حسین ہو۔ اتنی حسین کہ تمہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ تم میلی نہ ہو جاؤ۔“ وہ لڑکھائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ تم کیسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تو بھائی کہاں ہیں؟“ ”بھائز میں گئے انہو بھائی۔“ وہ ہنسنے لگا اور میرے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھ گیا۔ ”تم بس یہاں آج رات کی مہمان ہو۔ کل تمہیں تمہارا گھر پہنچا دیں گے۔“ ”کچ کدھر ہے ہو تم؟“

”ہاں، انکو بھی جھوٹ نہیں بولنا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ میرے ہاتھ ہیر بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اسے اتنی آسانی سے اپنے نزدیک نہیں آنے دیتی پھر..... پھر اس نے..... میری عزت..... مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا آدمی آگیا اور بولا۔ ”واہ! اکو! اسکے ہی اسکے۔“ ارے بار بار سے بدن میں کیا کانٹے ہیں۔ لیکن تم نے بہت فطرت کیا، انہو بھائی کو معلوم ہوگا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اس انو سے میں خود نمٹ لوں گا۔ میں خود بھی اس سے الگ ہونے کا ہانا ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”ارے یار تو پھر ہم کیوں پیاسے رہیں۔“ اس نے کہا پھر اس نے آؤ کے ساتھ مل کر میرے ساتھ..... میرا دل جا رہا تھا کہ میں مرجاؤں، رورو کر میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ میں تو اب کسی قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ ان لوگوں نے مجھے میری ہی نظروں میں کر دیا تھا۔

ان دونوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے انہو بھائی کو کچھ بتایا تو یا ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھے پانی پلایا اور بوگی سے باہر نکل گئے پھر وہاں انہو بھائی بھی آ گئے۔ وہ لوگ بوگی کے باہر تھے اور کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

انہو بھائی نے کہا۔ ”بچیں! لاکھ کافی ہیں۔ اب زیادہ

لاچ مت کرو۔ پچاس لاکھ اکٹھے کرنے میں اس کا باپ ایک اور دن لگا دے گا۔ یہاں ہر طرف خطرہ ہے۔ اس دوران میں یہاں پولیس بھی پہنچ سکتی ہے۔“ کافی بحث کے بعد وہ لوگ بچیں لاکھ پر راضی ہوئے۔ انہوں نے میری رہائی کے لیے بچیں لاکھ روپے مانگے تھے۔ صبح وہ لوگ مجھے ڈیڑے بجے کے حوالے کرنے والے تھے۔

انہو بھائی نے بوگی میں آکر میرے ہاتھ کھولے اور مجھے کھانے کو دیا اور خود باہر چلے گئے۔

صبح ہوتے ہی میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی یہ سارے واقعات لکھ دیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں انہو بھائی کو بھی سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ لوگ شاید مجھے کوئی مار دیں گے۔ میں اب بے آبرو ہو کر مزید جینا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس سے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید رمشا کو مزید کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بیگ کی ایک کتاب میں رکھ کر بیگ کو سیٹ کے نیچے ڈھکیل دیا ہوگا۔ مجھے خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے انکو بھی سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

اسی بات پر انو سے ان لوگوں کا جھگڑا ہوا ہوگا اور بات فائرنگ تک پہنچ گئی ہوگی۔ رمشا کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے۔ میں نے میری جگہ پر ہونے والی باتوں کی نقل کر رکھی ہوگی تاکہ وہ اسے گولی مار دیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لوگ گولی مارنے کے بجائے اسے زندہ بچڑا چاہتے تھے تو اس نے ریلوے کے پل پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔

”صاحب چائے۔“

یہ سن کر میں بری طری اچھل پڑا۔ وہ ویننگ روم کا حیران تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”مفرد صاحب! آپ رو رہے ہیں؟“ خط پڑھتے ہوئے بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے تھے۔

اچانک مجھے کسی ٹرین کا ہارن سنائی دیا اور اس کے بپوں کی گونگواہٹ کانوں تک پہنچی تو میں وحشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میرا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

میں یوں وہاں سے بھاگا تھا جیسے فرشتہ اجل میرے پیچھے لگا ہو۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک عیسی پکڑی اور اس سے اتار رکھی جانے کو کہا۔ میں فوری طور پر ان آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا ورنہ نارنگلی میں اس وقت کیا ہوتا رمشا کا باگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے اتار لی ہے پہلے ہی چھوڑ دی اور پیدل
ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں اس بیگ کو کھکانے لگانا
چاہتا تھا ورنہ وہاں سے میرے حامیوں نے ناؤں ہی جاتا۔
وہاں ایک جگہ مجھے کچھ انگارے نظر آئے۔ سردی
بہت شدید تھی۔ شاید وہاں چوکیدار نے الاؤ روشن کیا تھا جو
اب تقریباً بجھ چکا تھا۔ میں نے پہلے بیگ سے ایک کاپی
نکال کر رکھ کے اس ڈیسک میں بیٹھ لی۔ رکھ کے نیچے اب بھی
چنگاریاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں کاپی سلگنے لگی۔ میں نے
دوسری کاپی نکال کر اس سے منگے کا کام لیا اور اس سے آگ
کو بجھ کر مزید آگ بجھادی پھر میں ایک کے بعد دوسری
کاپی اور کتاب اس الاؤ میں ڈالتا رہا اور خود اس پتھر پر بیٹھ
گیا جو شاید چوکیدار نے اپنے لیے رکھا تھا۔
اب آگ خوب بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے ایک ساتھ
اس میں پٹی ہوئی کتابیں اور کاپیاں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر
بعد وہ سب جل کر خاکستر ہو گئیں۔ اب مسئلہ اس بیگ کا تھا۔
وہ خالص چمڑے کا بیگ تھا اور جلنے میں کافی وقت لیتا۔ میں
نے وہ بیگ بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔
تھوڑی دیر بعد اس نے بھی آگ پکڑ لی۔ جلد ہی وہ بیگ
نا قابل شناخت ہو گیا۔ اب یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ اس الاؤ
میں بیگ جل رہا ہے لیکن اب وہ نا قابل شناخت ہو چکا تھا۔
وہ سخت اللہ ہے اب تک میری جگہ میں تھوڑے سا
آخری وقت میں لکھے تھے۔ میں نے وہ سخت احتیاط سے
اپنی جیب میں رکھ لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔
رات خاصی ہو چکی تھی لیکن مجھے وہاں سے ماڈل
ناؤں کے لیے ٹیکسی مل گئی۔ وہ شادی کا گھر تھا۔ ابھی تک
وہاں سب جاگ رہے تھے۔ شمرہ کی چچا زاد، رینو، اماں اور
خالہ جان بھی وہاں موجود تھیں۔ ابابھی، خالو مشتاق اور ان
کے کوئی اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔
”صفدر بیٹا! خالو مشتاق نے کہا۔“ کہاں چلے گئے
تھے؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“
”میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے چلا گیا
تھا۔“ مجھے اچانک رمشا کا کٹنا پھانسا اور اس کے ہاتھ کا لکھا
ہوا آخری خط یاد آ گیا۔ میرا دل بھرا یا اور میں خود پر ضبط نہ
کر سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
”ارے، ارے..... کیا وہ صفدر بیٹا؟“ خالو نے پوچھا۔
”خالو، میرا وہ دوست ایک حادثے میں مر گیا۔“
میں نے زارہ بھر کر روئے ہوئے کہا۔ خالو نے بے اختیار
مجھے سینے سے لگایا اور دلاسا دینے لگے۔

”میر کو بیٹا۔ رونے کے بجائے اپنے اس دوست
کے لیے دعا کرو۔“
اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میری وہ دوست رمشا تھی۔
وہ پاگل لڑکی مجھے اتنا چاہتی تھی۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا تو شاید
میں اسے پیار سے سمجھاتا لیکن اب تو وہ مجھے سمجھانے کی
حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔
☆☆☆
اس کے بعد کئی شادیوں میں، خاندان کی دوسری
تقریبات میں شمرہ سے میرا سامنا ہوا۔ وہ شادی کے بعد کچھ
اور گھر آئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی ایم ڈی سے اترتی تو وہاں
موجود تمام خواتین کا حسن باند پڑ جاتا۔ وہ کسی مہارانی کی
طرح نے سکہ قدم رکھتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور خالہ جان
یا اماں کے پاس جا بیٹھی۔ وہ مجھے پہلے کی طرح سلام بھی
کرتی تھی لیکن اب فرق یہ پڑا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگتی
نہیں تھی بلکہ مجھے اسے اچھی خاصی باتیں بھی کر سکتی تھی۔ اسے
دیکھ کر مجھے شدید احساس کمتری ہوتا تھا۔ میں نے بھی سوچ
لیا کہ اب میں بھی خالو مشتاق اور شمرہ کو ان کے ہم پلہ ہو کر
دکھاؤں گا مگر جاؤ نظر آتے۔
اس دوران میں شمرہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔
میں اس دن آؤں سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی
فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے فون اٹھا کر دیکھا۔ مجھے
سیمن تھا کہ یہ کافی صاحب کا بیٹا تھا۔ وہاں آکر وہ مجھے کوری
طور پر بلارہے ہوں گے۔ کافی صاحب میرے پاس تھے
اور اکثر ضروری پروڈکٹس پر بات چیت کرنے کے لیے
انہیں یہی وقت ملتا تھا۔ میں نے ریفلیکس رکھ کر ریسپور
اٹھالیا اور آہستہ سے بولا۔ ”ہیلو۔“
”السلام علیکم؟“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ وہ آواز
سن کر میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ میں اس آواز کو کیسے
بھول سکتا تھا۔ وہ شمرہ کی معزوم آواز تھی۔
”شمرہ تم.....؟“ میں نے کہا۔ ”خیریت تو ہے، اس
وقت کیسے فون کیا؟“
”کیوں صفدر بھائی! کیا میں آپ کو فون نہیں کر سکتی؟“
اس کے منہ سے بھائی کا لفظ سن کر مجھے شاک سالگا۔
میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں کر تو سکتی ہو لیکن کرتی نہیں
ہو اس لیے کہہ رہا ہوں۔“
”وہ اگلے مہینے کی چند تاریخ کو میرے بیٹے دانیال
کا عقیقہ ہے اور آپ کو ضرور آنا ہے۔“
”ماشاء اللہ! دانیال بیٹا ایک سال کا ہو گیا؟ بہت

مبارک ہو۔“
”خیر مبارک لیکن آپ آرہے ہیں؟“
”لیکن تمہیں میرا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملا؟“ میں
نے پوچھا۔
”آپ کا نمبر کیا ذخیرہ ہے؟“ وہ مسکرائی۔ ”ارے بھی
خالہ نسیم سے ملا ہے اور کہاں سے لے گا۔ آپ آئیے گا
ضرور، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں بہت دیر تک ریسپور ہاتھ میں پکڑے اسے
گھورتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ہاتھ میں سے اس کی
سانسوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ یقیناً اماں نے اس سے کہا ہوگا
کہ تم خود فون کرلو۔ ہمارے کہنے سے تو وہ شاید نہ آئے۔
شمرہ کے بیٹے دانیال کے حقیقی میں اتنا اہتمام تھا کہ
کسی شادی یا ویسے کی تقریب میں بھی گیا ہوگا۔ خالہ کا پورا
گھرانہ بہت بندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اس تقریب میں شمرہ
کے شوہر جہانگیر سے بھی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ خاصا عظیم
المرتب شخص تھا اور دن رات پیسا کمانے اور کاروبار کو
دست دینے میں مصروف رہتا تھا۔ شمرہ کی شادی کے بعد
میں آج اسے دیکھ رہا تھا ورنہ خاندان میں کئی تقاریب ہوتی
تھیں جن میں صرف شمرہ ہی شریک ہوتی تھی، وہ یا تو ملک
سے باہر ہوتا تھا یا پھر شمرہ سے باہر۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس
شمرہ کے ساتھ میرے بیٹے دانیال کا کاروباری مصروفیت
ترک کر دی تھیں۔
اس سے بات کر کے مجھے مزید احساس کمتری ہوا۔
اگر اس کی روزانہ کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو وہ بھی میری
ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھا۔ میں جس فرم میں کام کرتا
تھا، اس کے چیئرمین سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ ان کے
بارے میں پوچھتا رہا اور میں جھوٹی باتیں بتاتا رہا۔
حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی اس کی فیصلہ مبنی کسی ای او سے
میری دو چار ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ میں اس کے بارے
میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بھی جہانگیر کی طرح ایک کر دھڑپتی
شخص ہے اور نہیں۔
پھر جہانگیر مجھے اپنے غیر ملکی دوروں اور بزنس کی
مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ میرے پاس اتنی
دولت تو نہیں تھی لیکن معلومات اس سے کہیں زیادہ تھیں، پھر
مجھ میں دوسروں کی باتیں سننے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ
یوتارہا اور میں دل ہی دل میں مرعوب ہوتا رہا اور سوچتا رہا
کہ چوبیس گھنٹوں میں سے شمرہ کے لیے وہ کتنا وقت نکال
پاتا ہوگا۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ بھی لیا۔
”جہانگیر صاحب! آپ اتنی بڑی لائف میں سے عموماً انوں
کے لیے وقت کیسے نکال پاتے ہیں؟“ میری بات پر وہ مسکرا
کر رہ گیا۔
اس تقریب کے بعد میرا احساس محرومی مزید بڑھ
گیا۔ انتہائی تنگ ترین علاقے میں جہانگیر کا وسیع و عریض
بنگلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ دو ایکڑ سے زیادہ ہی ہوگا۔
وسیع و عریض لان اتنا بڑا تھا کہ وہاں دو ہزار سے زیادہ
کرسیاں آسکتی تھیں۔ اس کا کارپورس بھی اتنا بڑا تھا۔ اسے
دیکھ کر کسی پارکنگ لائٹ کا گمان ہوتا تھا۔ مہمانوں کی روانگی
کے بعد شمرہ نے خند کر کے ہم لوگوں کو روک لیا۔ یوں بھی
رات کافی ہو چکی تھی اور دانیال جانے میں خاصی وقت
ہوتی۔ اس رات مجھے اس کا مکمل ٹما ٹھکاندر سے بھی دیکھنے کا
موقع ملا۔ اس میں اوپر پہنچے آراستہ بیڈروم تھے۔ مہمانوں
کے لیے علاحدہ سے ایک ہی لیکن وہاں جہانگیر کے کاروباری
اور غیر ملکی مہمان ٹھہرتے تھے۔
دس پندرہ روومز کے علاوہ وسیع و عریض اور جدید
ترین اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔
جہانگیر کا بیڈروم بھی شاندار تھا۔ اس کے علاوہ اس محل میں
ایک اسٹڈی روم بھی تھا۔ یہ موضوع کا پورٹن علاحدہ تھا۔ اس
کتابوں میں مارکیٹنگ، انکسائٹ، مالیات، تاریخ، ادب اور
اور انگریزی ادب پر ایسی کتابیں تھیں کہ انہیں دیکھ کر مجھے
رشتک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔
میں نے شمرہ سے پوچھا۔ ”کیا جہانگیر صاحب کو
مطلالعے کا بہت شوق ہے؟“ شمرہ عجیب سے انداز میں
مسکرائی۔
”جہاں تک مجھے علم ہے، مطالعے کا شوق تمہیں تھا۔
خاص طور پر اردو ادب سے لگاؤ تھا تمہیں؟“ میں نے کہا۔
”وہ تو اب بھی ہے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔
”مجھے تو لکھنے کا شوق بھی تھا لیکن زندگی نے مہلت ہی نہیں
دی کہ میں اپنے لیے بھی کچھ وقت پس انداز کر سکوں۔“
میں نے سوچا کہ جہانگیر اتنی دولت کا کر کیا کرے
گا؟ جہاں تک مجھے علم ہے شادی کے بعد اس نے صرف
پہلے پندرہ دن شمرہ کے ساتھ ہی مون منایا تھا اور شمرہ کو
سوسٹریلینڈ، اٹلی، لندن اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کروائی
تھی۔ اس کے بعد شاید کئی دن اس کی شمرہ سے ملاقات نہ
ہوئی ہوگی۔ اس کی مصروفیات تو کچھ ایسی ہی تھیں۔
میں نے کراچی آ کر نہ صرف امریکا کی کئی کمپنیوں

اپہنل میں رکھیں گے۔

”تم اس وقت اپہنل میں ہو؟“

”جی ہیا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا اماں سے میری بات کرواؤ۔“

”اماں..... تو اس وقت سو رہی ہیں ہیا۔“ اس نے کہا۔

”اچھا میں تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں جہلم پہنچ گیا ہوں۔

میں اسے سر پر اڑ دیتا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ سارا

سامان گھر میں چھوڑ کر اسی رکنے میں واپس جہلم چلا جاؤں

گا۔ گھر کی چابی راجا کے گھر والوں کے پاس تو ہوگی۔ چابی

نہ بھی ہوئی تو میں سامان راجا کے گھر رکھ دوں گا۔

میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو مجھے گھر کی حالت

دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اباجی نے اسے شاید نئے سرے

سے بنوایا تھا یا پھر اس میں کچھ ردوبدل کروایا تھا۔

راجا کے گھر میں صرف خالد اپنے گھر۔ وہ مجھے دیکھ کر

بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میرا سامان

رکھ لیں، میں اباجی جہلم واپس جا رہا ہوں۔ میں سامان وہاں

رکھ کر اسی ٹیکسی سے جہلم کے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچا۔

ریٹو ایکٹ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ اباجی کی بیٹی تھی۔ اباجی نے اسے اپنی بیٹی کی طرح

خوب صورت دھو کر رکھی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے

پٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔

”تم رو کیوں رہی ہو ریٹو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اماں تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں ہیا! اماں بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

”اب آنسو بہانا چھوڑو مونی۔“ میں نے فس کر کہا۔

اسی وقت اباجی بھی آگئے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں

بہت کمزور ہو گئے تھے اور خاصے بوڑھے بوڑھے لگ رہے

تھے۔ میں والہانہ انداز میں ان سے پٹ گیا اور میری آنکھوں

سے آنسو بہنے لگے۔ اباجی میری پشت سہلاتے رہے۔

”اب آپ کیوں رو رہے ہیں موئے آلو؟“ ریٹو

نے منہ بنا کر کہا تو بے اختیار مجھے ہنسی آگئی پھر راجا مجھ سے

گلے ملا۔

میں نے کہا۔ ”راجا! تیرا شکر ہے میں کس منہ سے ادا

کروں۔ تو نے میرے ماں باپ کی بہت خدمت کی ہے۔“

”صنڈ! اگر تو ایسی باتیں کرے گا تو میں تیرے گھر

آتا چھوڑ دوں گا۔“

لگاؤں گا اور کچھ پیسے کا کرپے ملک لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا!“ اباجی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے

کہا۔ ”تو نے جانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو ہم تجھے کیسے روک

سکتے ہیں؟“ ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ”جی جی یہ

خوابش بھی پوری کر لے۔“

”صنڈ! تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟“

اماں نے کہا۔

”آپ لوگ تو عیش کریں گے عیش!“ میں نے

موضوع بدلنا چاہا۔

”نہیں چائیں ہمیں عیش!“ اماں نے کہا۔

”اسے مت روکو بیٹا!“ اباجی نے کہا۔ ”اس نے

جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم جھلا اسے روکنے والے کون

ہوتے ہیں۔ جا ڈینا، خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔“

☆☆☆

امریکا پہنچ کر شروع شروع میں تو مجھے خاصی تکلیف

ہوئی۔ پھر میں نے بھی خود کو اس اجنبی ماحول میں ڈھال لیا۔

وہیں میری ملاقات لطیف سے ہوئی۔ اس کا تعلق بھی پاکستان

میں جہلم سے تھا۔ جلد ہی ہم دونوں میں گہری دوستی ہوئی۔

لطیف کسی آئل فیلڈ پر کام کر رہا تھا۔ میرے پاس خاصا بڑا

اپارٹمنٹ تھا اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔

اجا تک مجھے کسی نے چھوڑا تو میں چونک اٹھا۔ لطیف

مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے ہیڈ فون کا نول سے

نکالتے ہوئے کہا۔

”اب اترو، ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔“ میں جلدی سے

نیچے اتر آیا پھر ہم کوچ کے ذریعے اپنے اپنے گاؤں کی طرف

روانہ ہو گئے۔ اباجی گاؤں منتقل ہو چکے تھے۔ گاؤں کی

حالت بھی بدل چکی تھی۔ وہاں پختہ سڑک بن گئی تھی اور اس

سڑک پر تانگوں کے ساتھ ساتھ رکشا بھی چلتے لگے تھے۔

میں نے بھی رکشا ہی لیا تھا۔

کچھ دور چلتے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اماں تو جہلم

کے اسپتال میں ہوں گی یا لیکن ہے گھر چلی گئی ہوں۔

میں نے ہیل فون نکال کر ریٹو کا نمبر ملایا تو اس نے

فوراً ہی کال ریسیور کر لی۔ ”السلام علیکم ہیا!“

”علیکم السلام۔“ میں نے کہا۔ ”ریٹو! اب اماں کی

طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے ہیا۔ اباجی ڈاکٹر انیس دو تین روز مزید

میں ملازمت کے لیے درخواست بھی بھیجی بلکہ مختلف

یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ کر لیا۔ ان دنوں کمپیوٹر پاکستان

میں آچکا تھا لیکن اباجی وہ صرف دفتروں اور دولت مند

گھرانوں تک ہی پہنچا تھا۔

میں نے کمپیوٹر کے ذریعے ہی امریکا اور یورپ کی

دوسری کمپنیوں کو ملازمت کے سلسلے میں ای میل کی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں ایک سال گزر گیا۔ میں ہر مہینے

پابندی سے اماں اور اباجی سے ملنے بھی جاتا تھا۔ ریٹو نے

ایف اے کر لیا تھا اور اب وہ اے میں پڑھ رہی تھی۔۔۔

اباجی مجھے دیکھ کر اتنے خوش ہوتے تھے کہ میں اس خوشی کو

صرف محسوس کر سکتا تھا، بیان نہیں۔ اماں پر وفہ بھی ابھی نہیں

کہ میں تیرے لیے چاندی دہن لاؤں گی لیکن اباجی تک

انہیں اپنی وہ چاندی بھوکھن ٹی نہیں تھی۔ میرا تو شادی کا۔۔۔

فی الحال کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

آخر ایک دن میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے

امریکا کی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ وہاں میری تنخواہ اور

دیگر مراعات اتنی تھیں کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک

رہے تھے۔ کتنی کی طرف سے بنگا تھا، کارتنی اور طبی

سہولیات تھیں۔ جتنا میں یہاں رہ کر سال بھر میں کماتا،

وہاں صرف ایک مہینے میں کم لیتا۔ اب مسئلہ صرف اماں اور

اباجی کو رکھنا تھا۔

میں نے اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں اپنا

سب سامان سمیت کر لا ہور روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹا! تم کراچی گئے تو میں نے کوئی اعتراض

نہیں کیا۔ ہم سے دور ہو لیکن اپنے ملک میں تو ہو۔“ اباجی

نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد میں اباجی کے کمرے میں

بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ میں

امریکا جانا چاہتا ہوں۔

”نہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے پتر؟“ انہوں نے

کہا۔ ”کیا تم نے انجینئرنگ کی ڈگری اس لیے لی تھی کہ وہ

غیروں کے کام آئے؟“

میں اباجی کو کیسے سمجھاتا کہ میں شمرہ کی ضد پر زیادہ

سے زیادہ دولت کماتا چاہتا ہوں۔ اباجی کی بات درست

تھی۔ مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے مجھے میری

اوقات سے بڑھ کر دیا تھا۔

”اباجی!“ میں نے کہا۔ ”میں صرف دو سال وہاں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سائنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ نااہلہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیلوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

ہیروان ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمارچہ (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز پور 35895313 فکس: 35802554

جنوری 2015

سپنس ڈائجسٹ

287

286

جنوری 2015

سپنس ڈائجسٹ

286

”ارے نہیں، تو میرا بچپن کا یار ہے۔“
میں نے ابا سے کہا۔ ”ابا! آپ اب گھر چلے جائیں۔ میں اماں کے پاس رہوں گا۔“
”تو بہت لمبا سفر کر کے آیا ہے بیٹا۔“ ابا جی نے کہا۔
”گھر جا کر آرام کر۔“

میں نے ابا کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر میں ڈاکٹر سے ملا اور اس سے اماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اماں کو دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا لیکن انجائنا کا ایک ہوا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا اس لیے انہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑا۔ اب وہ خیریت سے ہیں اور آج شام تک انہیں ڈسچارج بھی کر دیں گے۔

مجھے دیکھ کر تو اماں اتنی خوش ہوئیں کہ گویا دوبارہ جی اٹھیں۔ انہوں نے عادت کے مطابق میری پیشانی پر بوسہ دیا پھر پچھلی طرح مجھے دھیروں دعا میں دے ڈالیں۔

ڈاکٹروں نے شام تک انہیں ڈسچارج کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے گویا عید کا دن تھا۔ اماں کی طبیعت بھی حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی تھی۔ میں نے سب لوگوں کو اپنے لائے ہوئے تھے بابتے اور لمبی تان کر سواگیا۔

دوسرے دن اماں کی حالت مزید سنبھل گئی اور انہوں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے پرانے بنائے جارہی تھیں، میں نے اور رینو نے ان کی خوشامد کر کے انہیں روکا۔

مجھے اچانک ان محضوں کا خیال آیا جو میں شمر، جہانگیر اور دانیال کے لیے لایا تھا۔ میں اسی دن اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میں نے اماں کو اسپتال سے گھر لاتے وقت جہلم کے ایک ریٹن اسے کار والے سے ایک مبینے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لے لی تھی۔

شمر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہانگیر بھی اس وقت گھر میں موجود تھا لیکن صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ اسے ایک ضروری مینٹنگ میں جانا تھا اس لیے معذرت کر کے چلا گیا۔ میں نے شمر کو اپنے لائے ہوئے تحفے دیے تو اس نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی صدر بھائی؟“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود ہے بلکہ اس سے کہیں قیمتی چیزیں ہیں لیکن گفت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔“ پھر میں نے دانیال کو چاکلیٹ کا بکس اور بہت سارے کھلونے دیے، کچھ نئے گیمز کی سی ڈیز میں۔ وہ انہیں لے کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت پیارا بچہ

تھا۔ اس میں شمر اور جہانگیر دونوں کی شاپت تھی اور وہ دونوں ہی خوب صورت تھے۔

اچانک ڈرائنگ روم میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ تین، ساڑھے تین سال کی ایک بچی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اچانک ریشا یاد آگئی۔ وہی تاک نقشہ، وہی بال، وہی آنکھیں۔

میں نے شمر سے پوچھا۔ ”شمر..... یہ یہ.....؟“
”یہ ریشا ہے۔“ شمر نے مجھے حیران کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے دیکھ کر مجھے ریشا یاد آگئی تھی۔ یہ شمر کی چھوٹی بیٹی تھی۔

”اوہو، مجھے اس کے بارے میں تو معلوم ہی نہ تھا۔“
میں نے کہا۔ ”سوری گویا! میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہ لاسکا لیکن میں تمہیں یہیں سے بہت اچھے اچھے کھلونے لا دوں گا۔“

”انکل! آپ بھی کھلونوں سے کھیلے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”ہیہ انکل! اتنے بڑے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بڑے کیا کھلونوں سے کھیلے ہیں؟“
”ممما! انکل کو کچھ چائے وغیرہ تو پلا میں۔“ دانیال نے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

”ابا! بیٹا میں نے ریشہ سے کچھ لایا ہے۔ وہ چائے لاری ہوئی۔ پھر وہ مجھ سے ہوئی۔ ایک بات یہاں صدر بھائی۔ آج کل ہر آدمی پیسے کے پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے؟“
”اس لیے کہ پیسہ ساری اس دور کی سب سے بڑی قوت ہے۔“ میں نے کہا۔

”گویا آپ بھی لوگوں کے اس قبیل میں شامل ہو گئے ہیں جن کے لیے پیسہ رشتوں ناتوں سے زیادہ اہم ہے؟“
”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف اتنا کمانے گیا تھا کہ جس سے زندگی میں آسانی پیدا ہو سکے۔ مجھے پیسے کی ضرورت تھی، ہوس نہیں۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ اسی پیسے کی ہوس نے تو مجھے کئی سال تک پاکستان نہیں آنے دیا۔

”تم سناؤ شمر، کیسی زندگی گزر رہی ہے؟“
”کیسی گزر سکتی ہے؟“ شمر نے اٹھا مجھ سے سوال کر دیا۔ ”جہانگیر نے مجھے دنیا کا ہر عیش، ہر آرام مہیا کیا ہے پھر ان کا سب سے بڑا احسان تو میرے لیے دو نئے کھلونے ہیں۔“

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ شمر کے چہرے پر مجھ کی افسردگی تھی۔ شاید وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں تھی یا شاید کوئی اور بات ہو۔

اماں کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ میں انہیں اور رینو کو لے کر لاہور چلا آیا تاکہ میرے ساتھ ساتھ اماں اور رینو کی ملاقات بھی ان سے ہو جائے۔ خالہ جان اور خالو مشتاق دونوں جیل کے مقابلے میں خاصے بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے لیکن اب بھی وہ بزنس میں مصروف تھے۔ ہم لوگ کچھ دن وہیں ٹھہرے، میں نے اماں، خالہ اور رینو کو خوب سیر کروائی۔ ابا جی وہیں جہلم میں تھے۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ چار دن بعد جب ہم واپس گاؤں پہنچے تو اماں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دن پہلے بہت بیمار تھیں۔ میں کچھ دن گاؤں میں رہا پھر میرا رخ ایک دن لا شعوری طور پر شمر کے محل کی طرف ہو گیا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا پھر ایک کمرے سے دانیال بھاگتا ہوا آیا اور میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ ”انکل! آپ تو اس دن کے بعد آئے ہی نہیں۔“

”بیٹا وقت ہی نہیں ملا۔“
”بہی بات پایا کہتے ہیں تو ماما کی اور ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔“ دانیال نے کہا۔
”تمہارے ماما اور پاپا کہاں ہیں؟“
”ہمارا ماما اپنے دوست کی شادی میں کراچی گئے ہیں۔“

”اور تم کونوں کو کیا سمجھو گے؟“
”میں تو نہیں سمجھتا۔“ میں نے کہا۔
جانے کب وہاں آگئی تھی۔ ”آیا اماں ہیں، ریشہ ہے، مگل چاچا اور خان بابا ہیں۔“
”یار! ہم ڈرامہ بازی می کی لائبریری دیکھ لیں؟“
میں نے کہا۔
”دیکھ لیں انکل۔“ اس نے کہا۔

میں اسڈی روم کی طرف بڑھا تو اس نے کہا۔ ”ماما کی لائبریری تو ادھر ہے۔“ اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔
”چلو، پھر ادھر بھی چلتے ہیں۔“ وہ مجھے چھوٹے سے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس میں ایک طرف آرام دہ کاؤچ بڑا تھا۔ ایک صوفی سیٹ بھی تھا اور ایک راکنگ چیر بھی۔ کرسی کے سامنے کونے میں ایک رائٹنگ ٹیبل تھی اور اس کے اوپر دیوار میں کچھ رنگے تھے۔ اس میں میر تقی میر سے لے کر فیض، فراق، نادر کاظمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے دیوان اور کلیات موجود تھے۔

دانیال نے کہا۔ ”انکل! اوپر والی کینٹ میں میری بال پڑی ہے۔ تمنا نے مجھ سے چھین کر وہاں ڈال دی تھی۔ پلیز مجھے وہ بال اتار دیں۔“

”لیکن ایک شرط پر، تم لوگ ماما کو نہیں بتاؤ گے کہ وہ بال میں نے اتار کر دی ہے۔“
”نہیں کہوں گا، پراس۔“ اس نے کہا۔
میں رائٹنگ ٹیبل پر احتیاط سے چڑھا اور جھٹ سے لگے ہوئے اس دیوار گیر کینٹ تک پہنچ گیا۔ اس میں میکینک دروازے لگے تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کر کھولا تو حیران رہ گیا۔

اس میں شمر کی بہت سی ڈائریاں پڑی تھیں۔ مجھے وہ ڈیا بھی نظر آیا جو میں نے میٹرک پاس ہونے پر شمر کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک گیند بھی پڑی تھی۔ میں نے گیند اتار کر دانیال کو دی اور اس سے کہا۔ ”جاؤ بیٹا کھیلو لیکن لان میں ہی کھیلنا۔ کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ تمہاری ماما بھی ڈانٹیں گی۔“ وہ اپنی گیند لے کر خوش خوشی باہر چلا گیا۔

میں نے بے اختیار وہ ڈائریاں اور گھڑی کا ڈبا نکال لیا۔ وہ بہت سی ڈائریاں تھیں۔ میں نے نو سال پہلے کی ڈائری نکالی اور اس کے بعد دو تین ڈائریاں نکالنے کے بعد موجودہ سال کی ایک ڈائری بھی نکال لی۔

کسی کی ڈائری پڑھنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ حرکت کر رہا تھا۔ میں دونوں کے ہاتھوں پر زور دے کر دانیال کی بات میں جھٹکا۔ پہلے میں نے گھڑی کا وہ ڈبا کھولا۔ اس میں وہ گھڑی اسی حالت میں رکھی تھی لیکن اس میں سے وہ شعر غائب تھا جو میں نے شمر کو لکھ کر دیا تھا۔

پھر میں نے نو سال پرانی ڈائری کھولی تو اس میں سے وہی پرچہ نکل کر باہر گر پڑا جس پر میں نے شعر لکھا تھا۔ مت کہل ہمیں جانو، پھر تا ہے فلک برسوں۔ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!

اسی کے نیچے اس نے لکھا تھا۔ ”میں نے تمہیں پہل کب جانا تھا صفر میں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہاری پوجا کرتی تھی۔“

میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکنے لگا پھر میں نے ڈائری کھولی، صفحات پلٹتے ہوئے میں نے ان پر سرسری نظر ڈالی۔ روزمرہ کی باتیں تھیں۔

ایک صفحے پر لکھا تھا۔ ”جہانگیر کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ صفر کو اڑا ہوا دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن پاپا کو بیٹی سے زیادہ پیسا عزیز تھا۔“
میرے ہاتھ پیر بے قابو ہو رہے تھے۔ سر میں

دھماکے سے ہونے لگے۔ شرہ، وہ مفردوسی شرہ مجھے اتنا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال کی ڈائری میں پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا۔
 ”آج جہانگیر کی شرافت کا پل مکمل کیا۔ وہ پیسا کمانے کا تو
 جوتی ہے، عورتوں کا بھی دیوانہ ہے۔ راتوں کو وہ
 کاروباری میٹنگوں میں نہیں بلکہ اپنی بھوپاؤں سے ملنے جاتا
 تھا پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ دل چاہتا ہے کہ ابھی
 اور اسی وقت اسے چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن میرے بچوں نے
 میرے پیروں میں جیزیاں ڈال دی ہیں۔“

موجودہ سال کی ڈائری میں لکھا تھا۔ ”اب جہانگیر
 کے ساتھ زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اسے نہ
 جانے کہاں سے علم ہو گیا ہے کہ خالہ نسیم صفدر کا رشتہ لے کر
 آئی تھیں۔ میں اس سے لڑتی ہوں تو وہ مجھے صفدر کا طعن دیتا
 ہے۔ مہذب نقاب میں چھپا ہوا حیدر اسے تو اپنے بچوں
 کا بھی خیال نہیں ہے۔ کاش..... کاش میں اس وقت خود میں
 اتنی جرأت پیدا کر سکتی جب صفدر کا رشتہ میرے لیے آیا
 تھا..... یا پتا مجھے بے شرم اور بے حیائی کو کہتے لیکن اب.....
 اب تو جہانگیر مجھے شراب پینے پر بھی مجبور کرتا ہے۔“

ایک اور صفحے پر لکھا تھا۔ ”آج جہانگیر نے مجھے اپنے
 ایک دوست کے ساتھ ڈانس نہ کرنے پر پھر بھی محفل میں
 دھکے مار دیے۔ پھر گھر آ کر اس نے ڈیڑھ گھنٹہ کی بڑی
 میرے حلق میں انڈیل دی۔ درندہ کہیں کا۔ میں اب اس
 کے ساتھ ایک لمبی بھی نہیں رہوں گی۔“

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔ میرا سر
 بری طرح چکر رہا تھا۔ میں نے سب ڈائریاں میٹیں۔
 گھڑی کا ڈبا اور تمام ڈائریاں اسی طرح اوپر چڑھ کر کینٹ
 میں رہیں۔ میرا وہ صدمہ صاف کیا جہاں میرے چڑھنے
 سے جوتوں کے نشانات بن گئے تھے اور پوچھل قدموں سے
 باہر آ گیا۔

اسی وقت مجھے دانیال نظر آیا۔ وہ مجھ سے بولا۔
 ”اکل آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”بیچہ! میں گھر جا رہی ہوں۔ آپ ذرا مجھے ایک گلاس
 پانی پلا دیں۔“

اس نے مستعدی سے کہا۔ ”ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر
 وہ اندر بھاگ گیا۔

میں نے وہ گیند اٹھائی اور اپنے کونٹ کی جیب میں
 ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شرہ کی نظر اس گیند پر پڑے
 اور وہ مجھ جائے کس کے کینٹ کو کسی نے ہاتھ لگایا ہے۔

دانیال پانی لے کر آیا تو میں نے پانی پیا اور اس سے
 بولا۔ ”دانیال پتا اب میں اس وقت آؤں گا جب تمہاری
 ماما اور پاپا آجائیں گے۔“

یہ کہہ کر میں پوچھل قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور
 گاڑی میں بیٹھ گیا پھر نہ جانے کس طرح میں گاڑی ڈرائیج
 کر کے گاؤں پہنچا۔ گھر پہنچ کر پہلے میرا پورا وجود بری طرح
 جھلنے لگا تھا۔ مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔

اماں ساری رات میرے سر ہانے بیٹھی رہیں اور
 ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔ صبح تک میری طبیعت
 کچھ سنبھل گئی۔ اس دن ہم سب لوگ شام کی چائے پی
 بہت تھکے کہ چائے خالہ زینت گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے
 چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا ہوا بچی؟“ اماں نے پوچھا کر پوچھا۔

”نسیم! جہانگیر نے شرہ کو طلاق دے دی اور بچے
 بھی اس کے حوالے کر دیے۔“

میں کہنے میں رہ گیا۔ امی اور دینو بھی یہ خبر سن کر بری
 طرح رونے لگیں۔

”نسیم! اب میری شرہ کا کیا ہوگا؟ کیا تم.....“

اماں نے میری طرف دیکھا۔ پھر ان کے چہرے پر
 ناگواری کی چٹتیں نمودار ہوئیں۔ میں کچھ کہا کہ اماں جواب
 نہ دیتی تھیں۔ وہی دن میں نے جلدی سے کہا۔ ”خالہ امی
 اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں.....“

خالہ نسیم نے روتے ہوئے مجھے گتے لگایا اور
 بولیں۔ ”بیٹا! تو نے ثابت کر دیا کہ انسان دولت سے بڑا یا
 چھوٹا نہیں ہوتا۔“

”اب بس گریں باجی!“ اماں نے کہا۔ ”اس موقع
 پر اپنے ہی تو کام آتے ہیں۔“

پھر شرہ سے میری شادی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی
 مجھے دو پیارے پیارے بچے بھی ملے ہیں۔ میرے آنگن
 میں ہر طرف بہاریں رقص کرتی ہیں لیکن یہ بچہ تھوڑا اب بھی
 میری جان نہیں چھوڑتا کہ اس میں بے چاری رمشا کا کیا
 قصور تھا؟ وہ کس کس کی پاداش میں ماری گئی؟ میری جلد باز
 اور کلنڈری طبیعت نے مجھ سے سوچنے بجھنے کی سکت تک
 چھین لی تھی..... کاش میں اچھی صحبت اختیار کرتا تو میرے
 دوست بھی مجھے کوئی ٹیک مشورہ دیتے۔ یا مجھے ایسا کوئی
 گھناؤنا قدم اٹھانے سے روک دیتے۔ میری غلط صحبت
 ہی رمشا کی قاتل بن گئی۔